وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ط وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ (القرآن)

حیات عبدالباریؒ

یعنی

اسلام کے عظیم فلسفی، معلم، مصنف مربی اور داعی
حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی سبق آموز سوانح حیات
اوران کی دعوتی، تعلیمی، علمی، وتصنیفی خدمات کا تعارف وجائزہ

سید محمود حسن حسنی ندوی

LIT

مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء لکھنؤ

سواغ
Accession No. 47390
Class No. 107/063
Book No.
C/122.022/454 (2)
C
454
122

برائے دارالمصنفین
اعظم گڑھ
از طرف احمد ابادی

47390
Acc no
107/063
Class no
Book No. 122 022 1454 (2)

﴿وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾

(القرآن)

حیات عبدالباریؒ

یعنی

اسلام کے عظیم فلسفی، معلم، مصنف، مربی اور داعی

حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی سبق آموز سوانح حیات

اوران کی دعوتی، تعلیمی، علمی و تصنیفی خدمات کا تعارف وجائزہ

سید محمود حسن حسنی ندوی

ناشر

مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء لکھنؤ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	حیات عبدالباریؒ
مصنف	سید محمود حسن حسنی ندوی
صفحات	۳۸۴
سنہ اشاعت	۱۴۳۰ھ مطابق ۲۰۰۹ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	150/- روپے
ناشر	مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فرمانِ الٰہی

﴿شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهٗ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ
وَالْمَلَآئِكَةُ وَأُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ط
لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾

(سورۂ آل عمران/۱۸)

(گواہی دی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی
کہ بجز اُس ذات کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں،
اور فرشتوں نے بھی اور اہل علم نے بھی،
اور معبود بھی وہ اس شان سے ہے کہ اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والا ہے،
اس کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں،
زبردست ہے، حکمت والا ہے)

ترجمہ: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ
مرشد
حکیمِ اسلام مولانا عبدالباری ندوی نور اللہ مرقدہٗ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حدیثِ نبوی ﷺ

عن ابن مسعودٍ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال:

"لا حَسَدَ إلّا فِی اثْنَتَیْن:

رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالاً فَسَلَّطَهُ عَلٰی هَلَكَتِهٖ فِی الْحَقِّ،

وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ حِكْمَةً فَهُوَ يَقْضِیْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا."

(متفق علیہ)

(حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"رشک دو شخصوں کے درمیان ہوتا ہے:

ایک وہ آدمی جسے اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہو،

تو وہ اسے راہِ حق میں (کھلے اور چھپے طریقہ سے) خرچ کرتا ہو،

اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے حکمت و دانائی سے نوازا ہو

تو وہ اس کے ذریعہ لوگوں کے مسائل و مشکلات حل کرتا ہو

اور اس کی تعلیم دیتا ہو")

فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	انتساب	۱۳
۲	مقدمہ ——— حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہم	۱۴
۳	تقریظ ——— مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہم	۲۱
۴	شکر واعتراف	۳۲
۵	**باب اول: علمی، دینی وخاندانی پس منظر**	۳۵
۶	علمائے فرنگی محل	۳۷
۷	حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی	۳۸
۸	علامہ عبدالحی فرنگی محلی	۴۱
۹	سلسلۂ علم اللّٰہی کی برکات اور نگرام کے علماء ومشائخ کا فیضان	۴۵
۱۰	حضرت سید شاہ محمد عدل عرف شاہ لعل رائے بریلوی	۴۶
۱۱	حضرت قاضی عبدالکریم جوراسی	۵۴
۱۲	قاضی عبدالکریم نگرامی	۵۶
۱۳	مولانا عبدالعلی نگرامی	۵۷
۱۴	حضرت مولانا محمد ادریس نگرامی	۵۹
۱۵	دارالعلوم ندوۃ العلماء	۶۲
۱۶	استاذ الاساتذہ علامہ شبلی نعمانیؒ	۶۳
۱۷	والدین ماجدین	۶۸

۱۸	باب دوم: حالاتِ زندگی	۷۳
۱۹	ولادت اور نشو ونما	۷۳
۲۰	حضرت مولانا محمد ادریس نگرامی کی خدمت میں	۷۴
۲۱	دار العلوم ندوۃ العلماء میں	۷۵
۲۲	فلسفہ جدید اور انگریزی میں مہارت کا شوق	۷۶
۲۳	استاذ الاساتذہ علامہ شبلی نعمانی کی وفات	۸۰
۲۴	دکن کالج پونا میں	۸۱
۲۵	پروفیسر سر عبد القادر اور پرنسپل بین کا اعتماد	۸۲
۲۶	کچھ آزمائشیں اور گجرات کالج احمد آباد تبادلہ	۸۳
۲۷	گجرات کالج احمد آباد کا قیام اور ''مذہب وعقلیات'' کتاب کی تصنیف	۸۶
۲۸	جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں	۸۹
۲۹	ایک عارف کی خدمت میں	۹۲
۳۰	مولانا سید مناظر احسن گیلانی سے یگانگت	۹۳
۳۱	بیعت سلوک اور سفر حج (۱۹۲۸ء)	۹۴
۳۲	حضرت مولانا محمد الیاس علیہ الرحمہ کے ساتھ چند لمحات	۹۸
۳۳	مولانا محمد یوسف کاندھلوی کے ساتھ رائے بریلی کا ایک تبلیغی سفر	۹۹
۳۴	''سیرت سید احمد شہیدؒ'' کا مطالعہ اور ایک تأثر	۱۰۲
۳۵	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی لکھنؤ تشریف آوری	۱۰۳
۳۶	مستقر اور مقام	۱۰۵
۳۷	آزادیٔ وطن، پاکستان کا سفر اور ہندوستان میں قیام کو ترجیح	۱۱۰
۳۸	تحریک ندوۃ العلماء سے وابستگی	۱۱۱

۳۹	**باب سوم: حج وزیارت**	۱۱۴
۴۰	سفر کی تیاری	۱۱۴
۴۱	والدہ ماجدہ کی بزرگانہ شان	۱۱۴
۴۲	والد ماجد کا ایمانی جذب وشوق اور عشق ووارفتگی	۱۱۶
۴۳	دیگر رفقائے سفر	۱۱۷
۴۴	مولانا شاہ سید لطف اللہؒ	۱۱۸
۴۵	دربار نبوتؐ کی حاضری	۱۱۹
۴۶	حال اور کیفیت	۱۲۰
۴۷	دیار محبوبؐ میں	۱۲۲
۴۸	رؤیائے صادقہ	۱۲۲
۴۹	دربار نبوتؐ سے اللہ کے دربار کی طرف	۱۲۵
۵۰	ایک نظر دیار محبوبؐ کی طرف اور بھی	۱۲۷
۵۱	طیبہ کی آخری بات	۱۲۷
۵۲	لبیک اللّٰھم لبیک	۱۲۹
۵۳	مکہ کی قیام گاہ سے خانۂ خدا کی طرف	۱۳۰
۵۴	مسجد حرام وکعبہ مقصود	۱۳۲
۵۵	پہلا طواف	۱۳۲
۵۶	سعی	۱۳۴
۵۷	سعی کے بعد	۱۳۵
۵۸	احرام حج	۱۳۶
۵۹	منیٰ کی طرف	۱۳۶

۶۰	منیٰ میں	۱۳۷
۶۱	عرفات کا دن	۱۳۸
۶۲	حج پورا ہوا	۱۳۹
۶۳	مزدلفہ	۱۴۰
۶۴	واپسی	۱۴۲
۶۵	**باب چہارم: سلوک ومعرفت**	**۱۴۳**
۶۶	حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی خدمت میں	۱۴۵
۶۷	ایک حیدرآبادی عارف کی خدمت میں	۱۵۶
۶۸	حضرت تھانوی کی خدمت میں بار بار حاضری اور اجازت وخلافت	۱۵۸
۶۹	سلوک کی کہانی خود مولانا عبدالباری ندوی کی زبانی	۱۶۲
۷۰	حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب سے اصلاحی ربط وتعلق	۱۷۳
۷۱	چار ہفتہ ایک کہف میں	۱۷۶
۷۲	حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی سے استفادہ ومراسلت	۱۹۳
۷۳	مکتوب (۱)	۱۹۸
۷۴	مکتوب (۲)	۲۰۰
۷۵	مسترشدین ومحبین	۲۰۲
۷۶	**باب پنجم: علالت ووفات**	**۲۰۵**
۷۷	صحت میں اضمحلال	۲۰۵
۷۸	مرض الموت	۲۰۶
۷۹	وصیت	۲۰۷

۸۰	حادثۂ وفات	۲۰۸
۸۱	حلیہ	۲۱۰
۸۲	معمولات	۲۱۰
۸۳	اخلاف وپسماندگان	۲۱۱
۸۴	اہلیہ محترمہ	۲۱۲
۸۵	اولاد	۲۱۴
۸۶	داماد	۲۱۷
۸۷	مولانا عبدالباری ندوی کی وفات سے ایک عہد کا خاتمہ	۲۲۰
۸۸	**باب ششم: قرآن فہمی**	**۲۳۶**
۸۹	قرآن مجید سے شغف	۲۳۶
۹۰	قرآنی خدمات	۲۴۱
۹۱	۱- نظام صلاح واصلاح	۲۴۳
۹۲	۲- کلامیات قرآن	۲۴۴
۹۳	درس قرآن کا انداز	۲۴۵
۹۴	**باب ہفتم: حکمت وفلسفہ**	**۲۵۰**
۹۵	نسلِ نو پر احسانِ عظیم	۲۵۲
۹۶	عظیم فلسفی	۲۵۵
۹۷	آفتاب آمد دلیل آفتاب	۲۶۰
۹۸	تراجم قرآن اوران کا امتیاز	۲۶۱
۹۹	فلسفیانہ محاکمات	۲۶۲

۱۰۰	صوفیانہ پہلو	۲۶۴
۱۰۱	ربوبیت کا فیضان	۲۶۷
۱۰۲	معاشیات	۲۶۸
۱۰۳	تعلیم وتبلیغ	۲۶۹
۱۰۴	**باب ہشتم: اوصاف وخصوصیات**	**۲۷۱**
۱۰۵	تواضع وللّٰہیت	۲۷۱
۱۰۶	ادبی ذوق	۲۷۴
۱۰۷	انداز تربیت	۲۷۶
۱۰۸	اخلاقی جرأت وصاف گوئی	۲۸۲
۱۰۹	حمیت وحمایت دینی	۲۸۶
۱۱۰	دینی ودنیوی جامعیت	۲۸۷
۱۱۱	**باب نہم: علمی خدمات، اہم کتابیں جائزہ وتعارف**	**۲۹۲**
۱۱۲	۱-تفسیر قرآن مجید	۲۹۲
۱۱۳	۲-مبادئ علوم انسانی	۲۹۳
۱۱۴	۳-برکلے کی سوانح اور اس کا فلسفہ	۲۹۴
۱۱۵	۴-معجزات وعقلیات	۲۹۵
۱۱۶	۵-معجزات انبیاء اور عقلیات جدیدہ	۲۹۶
۱۱۷	۶-حدیقۂ نفسیات	۲۹۸
۱۱۸	۷-مذہب وسائنس	۳۰۱
۱۱۹	۸-کلامیات سائنس	۳۰۴

107/1063
Z/122 on 14'54

۱۲۰	۹-اسباقِ زندگی	۳۰۴
۱۲۱	۱۰-تجدید دین کامل	۳۰۵
۱۲۲	۱۱-تجدید تصوف وسلوک	۳۰۸
۱۲۳	۱۲-تجدید تعلیم وتبلیغ	۳۱۲
۱۲۴	۱۳-تجدید معاشیات	۳۱۳
۱۲۵	۱۴-قرآن کا دوآیاتی نظام صلاح واصلاح	۳۱۴
۱۲۶	۱۵-تجدید کلامیات	۳۱۵
۱۲۷	تجدید کلامیات سے متعلق ایک گرانقدر رائے	۳۱۷
۱۲۸	تجدیدی تصانیف کا اسلوب	۳۱۷
۱۲۹	سلسلۂ تجدید کی کتابوں کا امتیاز	۳۱۸
۱۳۰	ایک تبصرہ	۳۱۹
۱۳۱	**باب دہم: چند مایہ ناز مگر بے تکلف رفقاء واحباب**	۳۲۴
۱۳۲	۱-علامہ سید سلیمان ندوی	۳۲۴
۱۳۳	۲-مولانا سید مناظر احسن گیلانی	۳۲۹
۱۳۴	۳-مولانا عبدالماجد دریابادی	۳۳۳
۱۳۵	۴-مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی	۳۳۹
۱۳۶	**باب یازدہم: چند نامور مستفیدین**	۳۴۴
۱۳۷	۱-مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	۳۴۴
۱۳۸	۲-ڈاکٹر رضی الدین	۳۴۹
۱۳۹	۳-ڈاکٹر حمید اللہ (پیرس)	۳۵۳
۱۴۰	۴-ڈاکٹر میر ولی الدین حیدرآبادی	۳۵۵

MAARIFUL MUSANNIFEEN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH U.P.

۱۴۱	**باب دوازدہم: افکار ونظریات اور رجحانات**	۳۵۸
۱۴۲	ملت ہوسٹل یا اسلامی اقامت خانے وقت کی اہم ضرورت	۳۵۸
۱۴۳	مولانا دریابادی کا تأثر وتائید	۳۶۱
۱۴۴	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی پرزور دعوت	۳۶۱
۱۴۵	ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ	۳۶۴
۱۴۶	پاکستانی مسلمان	۳۶۷
۱۴۷	دینی دعوتی اور سیاسی جماعتوں پر تبصرہ	۳۶۸
۱۴۸	جمعیۃ العلماء	۳۶۹
۱۴۹	جماعت اسلامی	۳۷۰
۱۵۰	تبلیغی جماعت	۳۷۳
۱۵۱	تحریک دعوۃ الحق	۳۷۴
۱۵۲	عصری تقاضوں کی طرف توجہ کی ضرورت	۳۷۷
۱۵۳	نظام دعوت وتبلیغ کی تدوین کی ضرورت	۳۷۸
۱۵۴	نامۂ وصیت	۳۸۲

انتساب

اس ذات گرامی کی طرف جنہوں نے اس نسل کی تربیت کی
جس کی سرپرستی میں اس عاجز کو پروان چڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی
اس مربی جلیل کی جانب
جو صاحب سوانح کے نہ صرف ہمساز و ہمراہ تھے
بلکہ ذاتی مشیر، معالج اور محب و محبوب تھے
اس ہستی کے نام
جس نے عصر حاضر کے چیلنج کے مقابلہ کے لیے افراد تیار کئے
اور عالم اسلام کے مسائل سے کبھی چشم پوشی نہیں کی
یعنی
اپنے والدین کے نانا
مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ
برادر اکبر حضرت مربی مخدوم و معظم
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمہ

محمود حسن حسنی ندوی

مقدمہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہم
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین خاتم النبیین سیدنا محمد، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین وعلی من تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم إلی یوم الدین، أما بعد:

برصغیر میں صدیوں مسلمانوں کی حکومت رہنے کے بعد جب زوال ہوا اور باہری طاقت نے ان کے اقتدار کو ختم کر کے جابرانہ قبضہ کر کے مسلمانوں کے دین سے جڑے ہوئے طبقہ اور علماء دین کو ظلم وتشدد کا شکار بنایا اور تعلیم میں بھی ملحدانہ ذہن بنانے کا نظام قائم کیا تو علماء دین نے دین کے بقاء کے لئے علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے ضروری تدابیر کے طور پر خالص دینی مدرسے قائم کئے، یہ مدرسے تعداد اور ضرورت کے لحاظ سے بہت کم تھے، لیکن ان کے ذریعہ دینی علوم باقی رکھے جاسکے، اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کو دین پر قائم رکھنے میں بڑی مدد ملی، ان کے ذریعہ علوم اسلامیہ کے قدیم سرمایہ کی حفاظت اور ان علوم دینیہ کی نشر واشاعت کی خدمت ایسے سخت ماحول میں کی جارہی تھی جس میں استعماری طاقت اپنے کارگر اور طاقتور ذرائع سے اسلامی علم وفکر کو مٹادینے کی وسیع پیمانہ پر کوشش کررہی تھی۔ اسی کے ساتھ مغربی تعلیم اور ملحدانہ فکر کو استعماری سرپرستی کے ذریعہ اس طرح پھیلایا جارہا تھا کہ لوگ اپنی دنیاوی ضرورتوں

کے تقاضے کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ اسکی طرف مائل ہوتے جارہے تھے، اور یہ خطرہ ہو گیا تھا کہ دین و دنیا کی ایسی جدائی نہ ہو جائے کہ دنیاوی تقاضوں کے تحت ملحدانہ علم رائج اور غالب ہو جائے، اور دین کا نام لینے والے اور اس کے تحفظ کی کوشش کرنے والے کم سے کم تعداد میں ہونے کی وجہ سے زندگی کے میدان سے باہر کر دئے جائیں، جس طرح مغربی ملکوں میں عیسائی مذہب کے ساتھ کیا گیا، لیکن ہمارے دینی مدارس نے برطانوی استعمار کی ان کوششوں کو پوری طرح کامیاب نہیں ہونے دیا، لیکن ان کی کوشش صرف دینی تعلیم تک محدود رہی کیونکہ ان کے وسائل اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتے تھے، دین و دنیا دونوں علوم کو جمع کرنے میں اسلامی نقطۂ نظر کو عمل میں نہ لانے سے علماء دین کا میدان عمل صرف دین کے پہلو تک محدود تھا، اور دنیاوی پہلوؤں میں ان سے رہنمائی نہیں مل رہی تھی، جن پر دین بیزار لوگوں کا غلبہ تھا، اس سے جو نقصان تھا، اس کا خطرہ محسوس کر کے علماء دین کے ایک طبقہ نے یہ ضروری سمجھا کہ زندگی کے دیگر امور سے تعلق رکھنے والی ضروری معلومات جو معاشرتی و تمدنی پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں، ان سے بھی امت کی جدید نسل کے علماء کرام کو واقف کرایا جائے تا کہ وہ دنیا پر اثر ڈال سکیں، اور ان کی نظروں میں وہ ان پڑھ ظاہر نہ ہوں، وقت کے دانشور علماء دین نے اس نقطۂ نظر کے مطابق کوشش شروع کی، جس کی تائید سب علماء نے کی، اس نے نئی تعلیمی تحریک چلی جو ندوۃ العلماء کے نام سے موسوم ہوئی، اور الحمدللہ اس کی کوششوں سے تعلیم کا جامع اسلامی تصور سامنے آیا۔

اس کے لئے ندوۃ العلماء نے ''دار العلوم'' کے نام سے درسگاہ قائم کی، ندوۃ العلماء کی اس درسگاہ سے جو پہلی نسل سامنے آئی، اس کے حضرات دینی علوم میں گہری واقفیت رکھنے کے ساتھ زندگی کی صحیح ضرورتوں میں کام دینے والا علم اور مؤثر زبان، دونوں لائنوں کا علم و فضل رکھنے والے ہوئے۔ ایک طرف ان میں دینی علوم کی

پختگی تھی، دوسری طرف جدید علوم کے حامل اور علوم دینیہ سے ناواقف افراد سے بات کرنے اور متاثر کرنے کی صلاحیت بھی تھی، ان میں خاص طور پر لائق ذکر لوگوں میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی اور دیگر کئی حضرات کا کام بہت سے اہل علم کو متاثر کرنے والا، اور اسلامی فکر اور احکام کی بہتر سے بہتر اسلوب میں ترجمانی کرنے والا ثابت ہوا۔

یہ دونوں حضرات اپنے علمی کمالات کے مشہور مقام پر پہونچنے کے بعد اپنی ذاتی زندگی کے دینی پہلو کو مزید تقویت پہونچانے کے لئے اپنے وقت کے مشہور عالم و مربی بلکہ دینی زندگی کی عملی خصوصیات وصفات کی تجدید کرنے والی شخصیت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے وابستہ بھی ہوئے، ان سے فیض اٹھانے کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کے طبقہ کی ذہنی اصلاح و درستگی کا کام بھی جاری رکھا، مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے اس خیال کی تردید کی کہ دین اور سائنس الگ الگ ہیں، انہوں نے سائنس کا دین سے اور دین کا سائنس سے تعلق ثابت کیا، وہ قدیم فلسفہ سے تو اپنی دینی تعلیم کے دوران اچھی واقفیت حاصل کر چکے تھے جو قدیم یونانی فلسفہ سے خصوصی تعلق رکھتا تھا، اس کے ساتھ انہوں نے جدید فلسفہ سے ایسی واقفیت پیدا کی کہ اس کے غلط افکار کی علمی سطح پر بہت خوبی کے ساتھ تردید کی۔

یونانی فلسفہ ایسی عقلیت پر مبنی تھا جو اسلام کے عقائدی و مذہبی فکر سے متصادم تھا، لیکن عربوں نے اسلام کے آنے کے بعد علم کی طرف جو توجہ کی اس میں ان کے سامنے یونانی فلسفہ میں جو عقلی موشگافیاں ہو چکی تھیں، ان سے واقفیت حاصل کرنے کے دوران ان سے متاثر ہوئے، اور اپنی اختیار کردہ علمی کوششوں میں ان سے مدد لی، اور اس طرح اس فلسفہ کے رجحانات عربوں کے علوم میں داخل ہوئے، اور پھر ان کے

اثر سے قرآن وحدیث کے عطا کردہ فکر سے اختلاف کی صورت پیدا ہوئی جس کا امام غزالی اور دوسرے ائمہ فکر اسلامی نے مقابلہ کیا اور ان کا ابطال کیا۔

عصر جدید میں جب کہ مسلمانوں نے علمی میدانوں میں خصوصی اور مزید کوششوں میں پہلو تہی کی، اور یورپ نے اپنے قدیم سرمایۂ علمی کو جو ان کو عربوں کے توسط ہی سے ملا از سر نو اپنی علمی کوششوں کا موضوع بنایا، اور زندگی کے سربستہ حقائق کو کھولنے کی کوشش کی، اور ان میں نئے انکشافات کئے اور اپنے علوم و انکشافات کو مذہب سے متصادم تصور کیا اور مذہب کو زندگی کے حقائق سے علیٰحدہ کر دیا تو ان درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے سے مسلمانوں کے ذہن میں بھی سائنس اور مذہب کے درمیان علیٰحدگی اور مغربی فلسفہ کے اثر سے اسلامی فلسفہ کی بے بضاعتی کا احساس پیدا ہوا، اور اس کے نتیجہ میں مذہبی حقائق کے معاملہ میں بے یقینی پیدا ہوئی، اور اس بات نے مسلمانوں کے ذہنوں میں بھی ملحدانہ رجحانات نے جگہ بنائی، یہ بہت خطرہ کی بات اور اسلام کے علمی امتیازات کے لئے ایک سخت چیلنج تھا۔

مولانا عبدالباری صاحب جو کہ علوم دینیہ کا صرف علم ہی نہیں حاصل کر چکے تھے، بلکہ انہوں نے ان میں تحقیق وتجدید کی صلاحیت بھی پیدا کر لی تھی، مغربی فلسفہ اور سائنس کا مہارت کے ساتھ مطالعہ کیا اور بہت کامیاب انداز میں اسلامی نظریہ کی برتری ثابت کی، اور مذہب سے سائنس کے ٹکراؤ کے تصور کا ابطال کیا، جس کو دیکھ کر ممتاز اہل علم بھی متاثر ہوئے اور اسلام کے عطا کردہ حقائق کی صحت و برتری کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے۔ مولانا عبدالباری صاحب نے اس سلسلہ میں کئی کتابیں تصنیف کیں جنہوں نے موجودہ عہد کے پس منظر میں بھی بلند مقام حاصل کیا، اس سلسلہ میں ''مذہب وسائنس'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

پھر مولانا عبدالباری صاحب نے باوصف اپنے جدید علمی امتیاز کے تربیت

باطنی کی خاطر مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے استرشاد کا تعلق قائم کیا تو استرشاد کے حصول کے ساتھ ان کے باطنی علوم کو اپنے محققانہ اور عصر حاضر کے اسلوب میں پیش کرنے کا سلسلہ بھی قائم کیا اور کئی ایسی کتابیں تصنیف کیں جن میں تصوف وتربیت باطن کے اسرار کی تشریح وتوضیح اس انداز سے کی کہ تصوف کے سلسلہ میں اہل حق کے ذہنوں میں جو بعض اشکالات پیدا ہورہے تھے مولانا کی تشریحات وتوضیحات سے دور ہوئے۔ اور علم ومعرفت کے دینی پہلو میں بھی مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے ایک مجددانہ تحقیق کا کام انجام دیا۔

مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے علمی تحقیق وتصنیف کی خصوصیت علامہ شبلی نعمانی سے تلمذ حاصل کرکے حاصل کی تھی، جس کے وہ معترف تھے، اپنی اس علمی تحقیق وتصنیف کی خصوصیت کو انہوں نے فلسفہ وسائنس کو اسلامی نظریات پر منطبق کرکے اپنے امتیازی کام کو آگے بڑھاتے ہوئے علم باطن کے اسرار کے لئے بھی استعمال کیا اور یہاں بھی اپنا امتیاز ثابت کیا۔

اس طرح انہوں نے عظیم مفکرین ومحققین کے درمیان اپنا مقام بنایا، اور یہ سب انہوں نے علوم جدیدہ کے اپنے شخصی مطالعہ سے کیا، ورنہ ان کی تعلیم دینی مدرسہ میں ہوئی تھی، عصر جدید کی درسگاہوں میں وہ طالب علم کی حیثیت سے نہیں، معلم کی حیثیت سے گئے، اور وہاں اس میدان میں بھی اپنے تفوق کا ثبوت دیا۔

وہ کئی عصری کالجوں میں پروفیسر رہے، پھر حیدرآباد کی یونیورسٹی میں اپنے اسی علمی مقام کی بناء پر پروفیسر مقرر ہوئے، نظام حیدرآباد کے سامنے ان کا یہ تعارف کرایا گیا کہ ''**ان کے ہاتھ پر فلسفہ اسلام لایا ہے۔**'' انہوں نے اپنی اس جامع علمی خصوصیت کے باوجود مولانا اشرف علی تھانویؒ سے فیض باطنی حاصل کرنا جاری رکھا بلکہ اس کو اپنی زندگی میں سمودیا۔ ان کی ایک یہ بھی خصوصیت رہی کہ حضرت

تھانویؒ کے افکار وارشادات اور سلوک ومعرفت کو وقت کے نئے اسلوب وزبان میں پیش کرنے کا کارنامہ انجام دیا، اس طرح جدید ذہن کے لئے ان کو سہل الفہم بنادیا، اوراس طریقہ سے بہت مفید اور اہم کام انجام دیا۔

ان کی خود ذاتی زندگی حضرت تھانویؒ کے پرتو سے ایسی متاثر ہوئی کہ ان سے ملنے والے ان کیفیات وحالات سے صرف واقف ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنی زندگیوں میں ان کو داخل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مولانا عبد الباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں ایک تڑپ تھی کہ کس طرح لوگ اپنی سیرت وکردار کو دینی روح سے آراستہ کریں، جو بھی ان سے ملتا وہ اچھے انداز میں اس کی تلقین کرتے، ان کی یہ بات اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ ان کے ملنے والوں کے سامنے پوری طرح نمایاں ہوجاتی تھی۔

بہرحال مولانا عبد الباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں لائنوں میں خصوصی علمی کام انجام دیا، وہ ایک طرف تصنیف وتالیف کے ذریعہ سے حضرت تھانویؒ کے رشد وہدایت کی باتوں کو وقت کے جدید اسلوب نگارش میں پیش کرتے رہے اور دوسری طرف اپنے ملنے والوں اور تعلق رکھنے والوں کو دین کے صراط مستقیم کو اختیار کرنے کی تاکید کرتے رہے۔ اس طریقہ سے انہوں نے غیر معمولی کام انجام دیا، اور وہ خود اپنی ذاتی زندگی میں بھی بڑی احتیاط اور صلاح وتقوی کے حامل رہے، اور اصلاح وارشاد کے کام کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا، اوراس طرح ان کی زندگی بڑی قابل استفادہ گزری، ایسا آدمی جو فائدہ پہونچانے والے حالات رکھتا ہے اپنی جسمانی موت سے ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اس کے ملفوظات وارشادات قائم رہتے ہیں، اوراس سے آنے والی نسلیں فائدہ اٹھاتی ہیں جن کو اس شخصیت سے براہ راست استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

حضرت مولانا عبد الباری رحمۃ اللہ علیہ کی علمی کاوشوں اور دین کی صحیح اور

مؤثر تشریح پر مشتمل ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ضرورت اس بات کی محسوس کی گئی کہ خود ان کی زندگی کے حالات اور سوانح کو بھی پیش کیا جائے تاکہ لوگوں کو ان کے جذبۂ دینی اور عملی کاوشوں سے واقفیت ہو اور استفادہ کرنے کا موقع ملے، اس سلسلہ میں خوشی کی بات ہے کہ عزیزی سید محمود حسن ندوی سلمہ نے ان کی زندگی کے حالات کو جمع کیا ہے، اور بہت احتیاط و تحقیق سے اکٹھا کیا ہے، اس سلسلہ میں ان کے صاحبزادگان سے زبانی معلومات بھی حاصل کیں، یہ الحمد للہ اب مستقل کتاب کی شکل میں آنے جا رہا ہے۔ عزیزی محمود حسنی نے اپنے بڑوں کے مشورے سے یہ موضوع اختیار کیا تھا اور خاص طور سے حضرت مولانا عبدالباری صاحب کے صاحبزادگان کی دیرینہ خواہش کو پورا کیا، جو صرف انکے صاحبزادگان کے لئے ہی خوشی کی بات نہیں بلکہ دیگر تمام لوگوں کی خوشی اور فائدہ کی بات ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور برکت دے۔

۱۷/۱۰/۱۴۲۹ھ
۱۸/۱۰/۲۰۰۸ء

محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

تقریظ

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہم
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین محمد، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین وبعد!

قدیم زمانہ سے یہ خیال چلا آرہا ہے کہ عقلیت اور مذہب میں جوڑ نہیں ہے، فلسفہ اور منطق سے اشتغال رکھنے سے عقیدہ متأثر ہوتا ہے، اسی لئے یونانی فلسفہ کا مطالعہ یا مباحث، مسیحیت کے اختیار کرنے کے بعد یورپ میں ممنوع قرار دیدئے گئے تھے اور ان سے دلچسپی رکھنا مذہبی پیشواؤں کی نگاہ میں ناقابل معافی جرم قرار دیا گیا تھا، فلسفہ کے غلبہ کے زمانہ میں ان علوم کی کتابیں مقفل کمروں میں محفوظ کردی گئیں تھیں اور علمی اور عقلی بحث کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

عباسی عہد میں یونانی علوم سے مسلمانوں نے دلچسپی لی اور ان میں کمال پیدا کیا، مسلمان فلاسفہ اور حکماء نے ان علوم میں صرف رسوخ ہی پیدا نہیں کیا، بلکہ ان پر ناقدانہ نظر ڈالی اور تنقیح اور تصحیح سے کام لیا، یعقوب کندی کو فیلسوف العرب اور ابن رشد کو ارسطو ثانی کہا گیا، اس میں شک نہیں کہ فلسفیانہ موشگافیوں سے بعض کے ذہن متأثر ہوئے اور وہ شک وشبہ میں مبتلاء ہوئے تو صحیح العقیدہ علماء نے اس کے مقابلہ کے لئے علمی وسائل اختیار کئے، مسلم حکمرانوں نے ان پر پابندی نہیں لگائی، بلکہ عقلی اور علمی طریقہ سے ایسے لوگوں کو مطمئن کرنے کے وسائل اختیار کئے، امام غزالیؒ اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" میں لکھتے ہیں:

''فلسفہ کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے پہلے میں نے اس کا تحقیقی مطالعہ ضروری سمجھا، اگر چہ مجھے تصنیف وتدریس کے مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی تھی، میرے حلقۂ درس میں بغداد میں تین تین سو طالب علم ہوتے تھے، پھر بھی میں نے اس کے لئے وقت نکالا اور دوسال کے اندر اندر میں نے ان کے تمام علوم کا مطالعہ کرڈالا، پھر تقریباً ایک سال تک ان پر غور وفکر کرتا رہا، میں نے دیکھا کہ ان کے علوم چھ قسم کے ہیں، ریاضیات، منطقیات، طبیعیات، سیاسیات، اخلاقیات اور الہیات، ابتدائی پانچ علوم کا مذہب سے نفیاً اور اثباتاً کچھ تعلق نہیں، اور نہ مذہب کے اثبات کے لئے ان کے انکار کی ضرورت ہے، طبیعیات میں ان کے بعض نظریات کا کہیں کہیں مذہب سے تصادم ہوتا ہے، مگر وہ چند چیزیں ہیں، اس سلسلہ میں اصولاً یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ طبیعت اللہ تعالی کے اختیار میں ہے، وہ خود مختار نہیں، البتہ جو لوگ ان علوم ومضامین میں فلاسفہ کی ذہانت اور باریک بینی دیکھتے ہیں، وہ عمومی طور پر ان سے مرعوب ہوجاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تمام علوم میں ان کا یہی حال ہوگا، حالانکہ یہ ضروری نہیں، کہ جو شخص ایک فن میں ماہر ہو وہ ہر فن میں ماہر ہو، پھر جب ان کی بے دینی اور ان کے انکار کو دیکھتے ہیں تو محض تقلیداً وہ بھی دین کا انکار واستخفاف کرنے لگتے ہیں، دوسری طرف اسلام کے بعض نادان دوست فلاسفہ کے ہر نظریہ اور ہر دعوی کی تردید اپنا فرض اور اسلام کی خدمت سمجھتے ہیں، حتی کہ طبیعیات کے

سلسلہ میں ان کی تحقیقات کا انکار کرنے لگتے ہیں، اس کا ایک مضر اثر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان علمی نظریات و تحقیقات کی صداقت کے قائل ہیں، اور ان کے نزدیک وہ چیزیں پائے ثبوت کو پہونچ چکی ہیں، ان کا اعتقاد خود اسلام کے بارے میں متزلزل ہو جاتا ہے، اور بجائے فلسفہ کے انکار کرنے کے وہ اسلام سے بدگمان ہو جاتے ہیں، لے دیکر جو فن مذہب سے متصادم ہوتا ہے وہ الٰہیات ہے، اسی میں انہوں نے زیادہ تر ٹھوکریں کھائیں ہیں درحقیقت انہوں نے منطق میں جو شرطیں رکھی تھیں ان کو وہ الٰہیات میں نباہ نہیں سکے، اسی لئے اس میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔"

بارہویں صدی عیسوی کے بعد یورپ نے علم کا سفر دوبارہ شروع کیا، تو انہی حکماء اور فلاسفہ کے علوم سے استفادہ کیا، اور پھر ان میں اضافہ کر کے ان پر سبقت حاصل کی، کلیسا اور علم کے درمیان جو کشمکش ہزار سال تک رہی، اس کی وجہ سے علم سے اشتغال رکھنے والے مذہب اور اہل مذہب کے مخالف ہو گئے، ان میں سے بعض نے خدا کے وجود سے انکار کر دیا، اسی طرح کلیسا والوں نے اہل علم کے خلاف معاندانہ موقف اختیار کیا، اور پھر اس ٹکراؤ کو جو خاص حالات اور ماحول کا نتیجہ تھا، حقیقت سمجھ لیا گیا۔

مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ (جنہوں نے فلسفۂ قدیم اور فلسفۂ جدید دونوں کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم و تربیت بھی خالص دینی ماحول میں حاصل کی اور دین کے اولین مصادر پر ان کی گہری نظر تھی) اس ٹکراؤ کو مفروضہ قرار دیتے ہیں اور یہی ان کی علمی شخصیت کا امتیاز ہے، وہ دونوں کے علوم کے جامع تھے، جس طرح قرون اولی میں مسلمان حکماء و فلاسفہ جن میں امام غزالی، فخر الدین رازی اور علامہ ابن رشد

کومثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے دینی موضوعات پر بھی ایسی کتابیں تصنیف کیں جو تربیت نفس سے تعلق رکھتی ہیں، فلسفہ اور فلاسفہ کے مطالعہ کے ساتھ ان کا تربیتی تعلق ان کے عصر کے اہم مشائخ اور اساتذہ سے تھا، جن میں علامہ سید سلیمان ندوی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی تھے، بعض اہل علم نے ان کو اس عصر کا امام غزالی قرار دیا ہے جنہوں نے "مقاصد الفلاسفہ" کتاب تصنیف کی اور دوسری "احیاء علوم الدین" جیسی ایمان کو تازہ کرنے والی کتاب لکھی، مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے بارے میں مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب نے کہا کہ "ان کے ہاتھوں پر فلسفہ نے اسلام قبول کیا"۔ مگر امام غزالی نے ہی "مقاصد الفلاسفہ" لکھنے کے بعد جب اس کے ردّ میں "تھافت الفلاسفہ" لکھی اور اس میں فلسفہ کے خطرات سے متنبہ کیا تو ان کے اس موقف پر علامہ ابن رشد نے جو خود علوم دینیہ اور علوم عقلیہ کے جامع تھے اپنی کتاب "تھافت التھافت" میں اس ٹکراؤ سے انکار کیا اور لکھا کہ دونوں کا میدان الگ ہے، اس لئے ٹکراؤ کا کوئی سوال نہیں، وہ کہتے ہیں کہ "مذہب کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے اور فلسفہ کا طبیعیات سے۔"

مولانا عبدالباری صاحب ندوی اپنی معرکہ آراء کتاب "مذہب وعقلیات" میں اس ٹکراؤ کو ردّ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مذہب سے مراد فوق الفطرۃ (سپر نیچرل) ہستی یا چیز کا اعتقاد ہے، جو سارے مذاہب میں پایا جاتا ہے، عقلیات سے مراد سائنس وفلسفہ ہے، وہ لکھتے ہیں:

> "ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ساتھ یورپ کی سائنٹفک ایجادات بھی آئیں ہیں، جن میں سے ہر ایک ریل تار، الیکٹرسٹی، وغیرہ اچھے اچھوں کی عقل کو حیران بنا دینے کے لئے کافی تھی،

اس سے بھی بڑھکر یہ کہ سائنس نے زمین کو تول کر وزن معلوم کرلیا، روشنی کی شرح رفتار بتادی، مریخ، دریا، پہاڑ، اور آبادی کا سراغ لگایا، اب اسکول اور کالجوں میں ہمارے فرزندان تعلیم جدید نے کہیں یہ سن پایا کہ سائنس نے ''خدا کو سرحد باہر کردیا'' تو بیچارے سمجھے کہ جو چیز ایسے حیرت انگیز اور سمجھ میں نہ آنے والے معجزے دکھا سکتی ہے، جب اسی نے خدا اور مذہب کو باطل ٹھہرادیا تو پھر اب کیا رہا، اس مرعوبیت کا آج تک یہ عالم ہے کہ نفس یورپ یا سائنس کا نام لے لینا کسی بات کو منوانے کے لئے سب سے مؤثر استدلال ثابت ہوتا ہے۔''

آگے لکھتے ہیں:

''غرض برادران اسکول وکالج کو سنجیدگی کے ساتھ ''مذہب وعقلیات'' کے مطالعہ اور ان کے باہمی تعلق پر کبھی غور وفکر کی فرصت تو میسر نہ ہوئی اور نہ یہ سوچا کہ دونوں ایک میدان میں اتر بھی سکتے ہیں یا نہیں، لیکن عقل وسائنس کی فتح کے نقارچی بن گئے، اگرچہ مصر اور ہندوستان میں یہ وبا زیادہ تر اسی طرح پھیلی تاہم اس کے ذمہ دار ہمارے نئے تعلیم یافتہ احباب کی تنہا مرعوبیت و نادانی نہیں ہے اور اسباب بھی ہیں جنہوں نے اس خیال کو عالم گیر بنادیا۔

۱- اولاً تو بعض ذمہ دار اور سائنس کے اکابر رجال مثلاً ''لاپلاس''، ''ٹنڈل ہکسلے'' وغیرہ کی زبان وقلم سے ایسے الفاظ نکلے کہ عوام کا تو کیا ذکر خواص تک اس کے دھوکے اور غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے

کہ مذہب وسائنس کی دشمنی کا خیال کوئی بازاری گپ نہیں ہے،
لاپلاس نے جب اپنی کتاب ''Mecanique Cdeiste'' نپولین کو پیش کی تو اس نے کہا: لوگ کہتے ہیں کہ تم نے یہ کتاب نظام عالم پر لکھی ہے، اور پھر بھی اس کے خالق کا نام نہیں لیا، اس پر لاپلاس نے خشونت کے ساتھ جواب دیا کہ جناب والا مجھ کو اس قسم کے کسی فرض کی ضرورت نہ تھی۔(۱)

ہکسلے نے یہ کہدیا کہ مادہ اور قوانین مادہ نے عقیدۂ خلق (جینس) اور روح کے وجود کو باطل کردیا، اس طرح کی باتوں نے سائنس کی حقیقت سے ناواقفوں کے دل میں اور بھی مذہب کی نسبت وسوسے پیدا کردئے اور ان کی مرعوبیت کو گویا ایک سند ہاتھ آ گئی۔

۲- لیکن حقیقت میں غلط فہمی کا سب سے بڑا منشاء اہل سائنس اور علماء مذہب کی عداوت کا مغالطہ ہے، جس کا بہت کچھ ذمہ دار یورپ کا محکمۂ احتساب سائنس (انکویزیشن) ہے، جس کی قربان گاہ پر قرون وسطی میں پاپاؤں کے ہاتھ بیسیوں محققین سائنس انکشافات علمی کے گناہ میں نذر چڑھ گئے، پادری سمجھتے تھے کہ زمین کا گول کہنا بھی مذہب کی تردید ہے، کوپرنیکس نے حرکت ارض و مرکزیت شمس کے اثبات یعنی نظام فیساغورس کی تائید میں کتاب لکھی تو اس کا پڑھنا کفر قرار پایا، گلیلو نے دوربین کی ایجاد سے کوپرنیکس کی تائید کی تو اس کو قید کی سزا ملی اور قید ہی میں مرگیا،

---

(۱) فطرت ولاادریت از وارڈ صفحہ اول جلد ۴ (بحوالہ مذہب وعقلیات)

برونو اس جرم میں جلا دیا گیا کہ ''تعدد عوالم'' کا قائل تھا۔
غرض اس محکمہ نے سیکڑوں آدمیوں کو مذہب کے نام سے ستایا اور برباد کیا، اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ لوگ علم و مذہب کو حریف سمجھنے لگے، اس مغالطہ نے اتنا تسلط حاصل کیا کہ ڈریپر نے ایک کتاب ہی (معرکۂ مذہب و سائنس) کے نام سے لکھ ڈالی، حالانکہ اس کا ماحصل تمام تر وہی اہل سائنس اور علماء مذہب کا معرکہ ہے۔
۳- تیسرا بڑا سبب خود مذہب کے نادان دوست ہمارے متکلمین ہیں، انہوں نے اس پر نہ تو غور کیا کہ مذہب و عقلیات میں اصولاً کوئی تصادم ہے یا نہیں، اور ان دونوں کی تطبیق و مصالحت کی الجھن میں پڑ گئے، یا پھر حکمت و فلسفہ کی زبان سے جو بات بھی نکلی اس کی تردید اپنا فرض منصبی قرار دے لیا۔
مسلمانوں میں جس شے نے عقل و مذہب کی باہمی منافرت کے خیال کو سب سے زیادہ پھیلایا اور راسخ کیا، وہ یہی علم کلام کی زیاں کار ایجاد ہے، جس نے ایک طرف مذہب کو شدید صدمہ پہونچایا اور دوسری طرف ذہنی قوتوں کو باد پیمائی اور سطح آب پر نقش آرائیوں میں رائیگاں گیا۔
غرض علم و مذہب کے باہمی عناد و تصادم کا افسانہ جس قدر دراز اور عالم گیر ہے اس سے بدرجہا زیادہ بے بنیاد و غلط ہے، اس صحبت میں اسی نکتہ کو آپ حضرات کے سامنے واضح کرنا مقصود ہے، نہ کہ دونوں میں تطبیق، جیسا کہ بعض احباب کو مقرر کی مولویت سے بدگمانی ہوئی ہے اور جیسا کہ بالعموم عقل و مذہب

کے یکجائی استعمال سے لوگ سمجھ بیٹھتے ہیں، خصوصاً جب کسی مذہبی آدمی کی زبان پر یہ الفاظ آجائیں، آج صبح ہی ایک تعلیم یافتہ دوست فرمانے لگے کہ ''مذہب تو دیوالیہ ہو چکا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اس کی حمایت کیونکر کرتے ہو۔''

مذہب وسائنس کی بے تعلقی کو پوری طرح سمجھنے کے لئے پہلے اس کے باہمی فرق اور بعد حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشیں کر لینا چاہئے، ریل کی دو گاڑیاں ٹکرا سکتی ہیں اور ٹکراتی ہیں، لیکن ریل گاڑی اور جہاز میں تصادم ناممکن ہے، اس لئے کہ ریل سمندر میں چل ہی نہیں سکتی ہے اور نہ جہاز خشکی پر، بعینہٖ یہی حال سائنس اور مذہب کا ہے، سائنس کا مذہب کی حد میں داخل ہونا اس سے زیادہ محال ہے، جتنا ریل کا پانی یا جہاز کا خشکی پر چلنا ہے، مذہب جہاں سے شروع ہوتا ہے سائنس کی رسائی وہاں ختم ہو جاتی ہے، سائنس کا جو منتہائے پرواز ہے مذہب کا وہ نقطۂ آغاز ہے، سائنس کی بحث وتحقیق کا تعلق تمامتر فطرت (نیچر) کے واقعات اور تجربات سے ہے، مذہب کی بناء یکسر فوق الفطرت اور تجربہ اور مشاہدہ کی دسترس سے ماوارء چیزوں پر ہے، مثلاً خدا، روح، حشر ونشر وغیرہ۔''(۱)

مولانا عبد الباری ندوی نے مذہب وعقلیات میں دونوں کے درمیان اس مفروضہ تضاد کو علمی اور عقلی دلائل سے رد کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ دونوں کا دائرہ الگ ہے، اور ٹکراؤ اسی طرح ناممکن ہے جس طرح ٹرین اور ہوائی جہاز کا ٹکراؤ۔

---

(۱) مذہب وعقلیات، از: مولانا عبد الباری ندویؒ، ص: ۱۳-۱۵

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مذہب وعقلیات'' کو اپنی محسن کتابوں میں شمار کیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

''مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب ''مذہب وعقلیات'' پر نظر پڑی، جس کو ذوق وذہن نے پورے طور پر اپنا لیا، اس رسالہ سے عقل ونقل کے حدود اور تجربہ وعلم انسانی کی نارسی وناپائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا، جو مطالعہ میں بہت کم آیا، اس کے بعد قدیم وجدید فلسفہ اور اس کی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا پڑھا، مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا، بلکہ جس قدر پڑھا" إنْ هُم إلا يخرصون" اور "كذّبوا بما لم يحيطوا بعلمه ولما يأتهم تأويله" کی تفسیر وتوضیح ہی ہوتی رہی۔''(۱)

مولانا عبدالباری صاحب کی دوسری مشہور تصنیف ''مذہب وسائنس'' ہے، اس کے بارے میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اس آخری دور میں ان کے قلم سے ایک اور مفید تصنیف ''مذہب وسائنس'' نکلی جو ہماری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے شائع کی، اس پر مشہور فاضل ریاضیات ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی کا فاضلانہ مقدمہ ہے، جس میں انہوں نے اس کتاب کو سراہا ہے، اس کتاب میں ان کا قدیم شبلوی اسلوب پھر جاگ اٹھا ہے اور ان کے اشہب قلم کو اپنی بھولی ہوئی راہیں یاد آگئیں

---

(۱) پرانے چراغ: ۲/۱۱۸

ہیں، یہ کتاب ان کے عالم ہوش اور صلاحیت فکر وتحریر کی آخری یادگار ہے''۔(۱)

فلسفہ اور سائنس سے متعلق کتابوں کے ساتھ ان کی ایمانیات اور یقینیات سے متعلق کتابیں مثلاً تجدید دین کامل، تجدید تصوف، تجدید تعلیم وتبلیغ، تجدید معاشیات، معجزات انبیاء اور عقلیات جدیدہ، تجدید دین کامل، قرآن کا دوآیاتی نظام صلاح واصلاح وغیرہ ہیں۔

مولانا عبدالباری ندوی عقلیات اور ایمانیات کے علوم کے جامع تھے، علماء دین میں اس عصر میں ان کی نظیر نہیں ملتی، افسوس ہے کہ ان کی ساری تصنیفات اردو میں ہیں، صرف ''مذہب وعقلیات'' اور ''تجدید تصوف'' کا عربی میں ترجمہ ہوا۔

مذہب وعقلیات کے عربی ترجمہ کو پڑھ کر ایک عرب عالم نے جو ایک عرب یونیورسٹی میں شعبۂ عقیدہ کے سربراہ تھے، اس کی افادیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا کہ ''یہ کتاب تو عقیدہ کے نصاب میں داخل ہونے کے لائق ہے۔'' ایک مصری فلسفہ کے عالم جو الحاد کے قریب تھے اس کتاب کے مطالعہ سے دین کے بارے میں ان کے ذہن میں جو شکوک وشبہات تھے ان سے تائب ہوئے اور نادم ہوئے۔

اردو زبان میں ہونے کی وجہ سے عالم عربی مولانا عبدالباری صاحب ندوی سے واقف نہیں ہوسکا، ورنہ وہ عالم اسلام کے مفکروں میں شمار ہوتے۔

مولانا عبدالباری صاحب کی حیات وخدمات پر اب تک کوئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی تھی، برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے نواسہ عزیزی محمود حسن حسنی ندوی نے جو سوانح نگاری کا بڑا اچھا ذوق اور سلیقہ رکھتے ہیں، اس اہم خدمت کو انجام دیا، ان کو سوانح نگاری کا ذوق اپنے نانا مرحوم سے وراثت میں ملا ہے،

---

(۱) پرانے چراغ: ۲/۱۲۶-۱۲۷

مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی، حیات خلیل، تذکرہ مولوی محمد ہارون، تذکرہ محمد الحسنیؒ اور امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید کی مختصر سیرت لکھی، ان کو تاریخ سے بڑی مناسبت تھی، اپنے خاندانی بزرگوں کے حالات پر ''خانوادۂ علم اللّٰہی'' اور تحریک سید احمد شہیدؒ پر ''صادقین صادق پور'' تصنیف کی، ان کے نواسہ عزیزی محمود حسن حسنی ندوی نے اس سے پہلے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا ابرار الحق حقی صاحب کی سوانح تحریر کی جو بہت مقبول ہوئی، مولانا عبد الباری صاحب کے فرزندوں - خاص طور پر محبّ محترم الحاج فضل الباری صاحب اور محبّ گرامی الحاج احمد الباری صاحب کہ ان دونوں نے مولانا عبد الباری ندویؒ کی کتابوں کی اشاعت کا دوبارہ نظم کیا - کے اصرار پر انہوں نے مولانا عبد الباری صاحب ندوی کی سوانح بڑی محنت، دلچسپی اور تحقیق کے ساتھ تحریر کی جس میں ان کے ساتھ ان کے اساتذہ ومشائخ اور معاصرین علماء کا بھی تذکرہ آگیا ہے اور ان کی تصنیفات کا تعارف بھی، عزیزی محمود حسن سلمہ کو خال مخدوم ومعظم مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کی بھی علمی ودینی سرپرستی حاصل ہوئی، اور ان کے بعض کاموں میں معاونت کا شرف بھی ان کو ملا، اللہ تعالیٰ اس کی برکات سے انھیں مالا مال فرمائے اور ان کی اس خدمت کو بھی قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔

امید ہے کہ یہ کتاب صرف اردو داں طبقہ ہی کیلئے مفید نہیں ہوگی، بلکہ ترجمہ ہونے کے بعد عرب اہل علم کے لئے بھی مفید ہوگی اور وہ مولانا عبد الباری ندوی کی علمی خدمات سے واقف ہونگے۔

۲۱ر ذوالحجہ ۱۴۲۹ھ
۲۰ر دسمبر ۲۰۰۸ء

محمد واضح رشید حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شکر واعتراف

سب سے پہلے شکر اور ہزار ہا ہزار بار شکر اللہ رب العالمین کا کہ اس نے ایک نیک کام کی توفیق بخشی، اور اپنے ایک نیک اور باتوفیق بندے کے حالات و خدمات سے واقف ہونے اور پھر دوسروں کو واقف کرانے کی سعادت عطا کی، اس طرح ''حیات عبدالباریؒ'' کے نام سے یہ حقیر خدمت تحفۂ ناظرین ہے۔

ثانیاً شکر وممنونیت اپنے ان مربیوں کے لیے جن کے احسانات بچپن کے مرحلہ سے لے کر آج کے تعلیم وتعلم کے مرحلہ تک کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، جن کے لیے ہمارے پاس صرف دعا وتشکر کے کلمات ہیں، حقیقی صلہ اللہ رب العالمین کے ہی پاس ہے۔

بڑی ناسپاسی ہوگی کہ اس موقع پر اپنے ان قدیم محسنوں اور عظیم مربیوں کو یاد نہ کیا جائے جن کی تحریک وایماء بلکہ ایک حد تک تقاضہ وفکرمندی کو ہی اس تصنیف کے ظہور میں آنے میں سب سے بڑا دخل رہا، مزید ان کی شفقت ومحبت یہ بھی ظاہر ہوئی کہ کتاب کے لیے اپنی تقریظات بھی عنایت فرمائیں، جو زینت کتاب ہیں، میری مراد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) اور حضرت مولانا سید محمد واضح رشید ندوی مدظلہ (معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ) ہیں جو نہ صرف راقم کے مربی ومعلم ہیں بلکہ خاندانی بزرگ وسرپرست بھی ہیں۔

خال مخدوم و معظم مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی مدظلہ کے احسانات اور الطاف وعنایات کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے، انھوں نے ازراہ شفقت پوری کتاب پر نظر ڈالی اور نہایت مفید مشوروں سے نوازا۔

مادر علمی دار العلوم ندوۃ العلماء کے احسانات تلے دبا ہی تھا، مزید اس کا یہ احسان ظاہر ہوا کہ اسی سے متعلق شعبۂ نشر واشاعت ''مجلس صحافت ونشریات'' نے اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری لے لی، کتاب بھی اسی کے قابل فخر سپوت سے متعلق ہے۔

والد ماجد جناب سید حسن حسنی اور دادا صاحب جناب سید محمد مسلم حسنی أطال اللہ بقاء هما و بارك فی حیاتهما کی شفقتوں اور دعاؤں کا رہین منت تو اس حقیر کا سراپا وجود ہے۔

حضرت مولانا عبد الباری ندویؒ کے فرزندان واخلاف میں محترمی جناب الحاج حافظ احمد الباری صاحب اور محترمی جناب الحاج فضل الباری صاحب کا بھی شکر ضروری ہے کہ ان کے پیہم اصرار اور دلی جذبہ وخواہش کو بھی اس میں بڑا دخل رہا، اور بار بار یہ حضرات اظہار ممنونیت فرماتے رہے، اور خاندانی وعائلی معلومات کی فراہمی میں بڑی مدد فرمائی، ان کی صحت وسلامتی اور عافیت وبرکت کے لیے اللہ سے دعا ہے۔

محترمی مولانا محمد غفران ندوی جو راسی دام ظلہ، برادر محترم مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی، مرزا امان بیگ صاحب لکھنوی اور برادرم مولوی محمد اسحٰق ندوی سیتاپوری کے تعاون کا بھی راقم شکر گذار ہے، مؤخر الذکر نے کتاب کو بڑے سلیقہ اور عمدگی سے کمپوز کیا، اور صحت کا بڑا خیال رکھا، جزاهم الله تعالیٰ خیراً و أحسن الجزاء.

جن کتابوں سے استفادہ کیا، جن مراجع سے رجوع کیا، ان کے حوالے ناظرین کے سامنے رہیں گے، مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ یہ کتاب ایک تحقیقی دستاویز ہے اور

اس سے اس عظیم المرتبت شخصیت کا حق ادا ہو ہی گیا، البتہ ناظرین اس کتاب کے ذریعہ بڑی حد تک دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی نہیں عالم اسلام کی اس قابل فخر اور نادرۂ روزگار ہستی سے واقفیت حاصل کرلیں گے، جس کو موضوع بنا کر کتاب تیار کی گئی، یعنی حضرت مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تمام تر تسامحات سے درگذر فرمائے، اور اس کتاب کے نفع کو غیر محدود فرمائے، درود وسلام ہو ہر بار اور ہر آن سرور کائنات سیدنا حضرت محمد رسول اللہ علیہ وسلم پر کہ جو کچھ ہے آپ ہی کے امتی ہونے کا فیض ہے۔

محمود حسن حسنی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی

پنجشنبہ
۱۰؍محرم الحرام ۱۴۳۰ھ
۸؍جنوری ۲۰۰۹ء

باب اول

علمی، دینی وخاندانی پس منظر

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی أشرف الأنبیاء والمرسلین و خاتم النبیین سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین وبعد!

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی کی وفات پر اپنے ایک مضمون (۱) میں اسلام کا معجزانہ وصف ظاہر کرتے ہوئے اس کی اس خوبی کو اجاگر کیا ہے کہ جس زمانہ اور جن حالات میں جیسی شخصیات اور مردان کار اسلام، مسلمانوں اور انسانیت کو درکار رہے ہیں، اسلام دنیا کو دیتا رہا ہے، اور اس نے اس معاملہ میں کبھی معذرت نہیں کی، مولانا رقمطراز ہیں:

> ''اسلام کا گہربار بادل ایک ہزار سال سے برابر ہندوستان کی اقلیم پر مصروف بارش ہے، کتنی بار بادل نیساں بن کر برسا اور اس عجائب زار ہند کا دامن لعل وگہر سے بھر گیا، لیکن ۱۸۵۷ء میں سارے ملک پر ایک خونی بادل نے تر واش کی، جس سے ہر جگہ تو خون برسا، لیکن کہیں کہیں خون کے قطروں کے بجائے سرخ یاقوت کے دانے برسے، جن میں سے ایک کو قدرت نے شبلی کے نام سے موسوم کیا۔
>
> ہندوستان کی سیر حاصل زمین نے علوم وفنون میں جو بالیدگی پیدا

---

(۱) مولانا کی وفات پر حضرت سید صاحب کا یہ مضمون لاہور کے کثیر الاشاعت اخبار ''زمیندار'' میں شائع ہوا تھا۔

کی، اس کی تفصیل کا موقع نہیں، تاہم مختلف دوروں میں کلام و اسرارِ شریعت میں بحرالعلوم اور شاہ ولی اللہ، ادب ومعانی میں قاضی عبدالمقتدر، ملک العلماء دولت آبادی اور ملامحمود جونپوری، فلسفہ ومنطق میں ملا نظام الدین اور ملامحب اللہ بہاری، ادب و شاعری میں مسعود، سعد، سلمان، خسرو اور فیضی، تاریخ وخبر میں ضیا برنی، ابوالفضل اور آزاد بلگرامی کو پیدا کیا، لیکن اس کے آغوش کا آخری فرزند (شبلی) وہ تھا جو ملامحمود بھی تھا اور فیضی بھی، محب اللہ بھی اور آزاد بھی، اور کم ازکم وہ یگانہ انفراداً ان میں سے شروع کے دوایک کو چھوڑ کر اکثر کے برابر اور مجموعاً ان میں سے اکثر سے بہتر تھا۔

اسلام نے اپنی تیرہ صدیوں میں ہر آن یہ ثبوت دیا ہے کہ اس کی کیاریاں ہر موسم میں نیا پھول کھلا سکتی ہیں، اور اس کے دنگل سے ہر میدان کے لیے نئے پہلوان پیدا ہو سکتے ہیں، عہد اول سے اس وقت تک ہر قرن کی تاریخ اس دعوے کی بہترین مثال ہے، اس نے عقل ونقل کی پہلی ٹکر کھائی تو ابن عطا اور علاف پیدا کیا، اور پھر ہر دور میں ابن فورک، غزالی، شیخ الاشراق، ابن حزم، ابن رشد، رازی، ابن تیمیہ، ابن قیم، قاضی عضد، احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ اور بحرالعلوم اپنی خاک سے پیدا کیے، ناممکن تھا کہ اس قرن جدید میں اس موسم کے مناسب حال کوئی تازہ برآور نہ ہوتا، اور اس میدان کے لائق، کوئی پہلوان دنگل میں نہ اترتا، انیسویں صدی کا مطلع خورشید اسلام کا مغرب ہو، فضل وکمال

کے کتنے آفتاب وماہتاب تھے، جو اس تاریکی میں نگاہوں سے
اوجھل ہو گئے، لیکن صدی کا نصف شب ۱۸۵۷ء تھا کہ مطلع سحر
سے چند نئے ستارے نمودار ہوئے۔" (۱)

اور بقول ان ہی بالغ نظر مضمون نگار کے "مولانا شبلی اس بزم میں سب سے پیچھے آئے، لیکن سب سے پیچھے نہیں بیٹھے" اور حق تو یہ ہے کہ اس حقیقت اور سچائی سے پہلو تہی نہ کی جائے کہ: "مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالباری ندوی اسی طلائی سلسلہ کی نمایاں کڑیاں ہیں۔"

حضرت مولانا عبدالباری ندوی کی تعلیم وتربیت اور شخصیت سازی میں جن شخصیتوں کا حصہ نظر آتا ہے وہ جامع کمالات ومجموعہ صفات شخصیتیں رہی ہیں، خود ان کے والد حکیم عبدالخالق صاحب بزرگ شخصیت تھے جو حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کے مرید وخلیفہ تھے، دوسری شخصیت مولانا ادریس نگرامی کی ہے، عارف کامل اور مرد باخدا وعالم ربانی تھے، ان کا آبائی روحانی سلسلہ علم اللّٰہی مجددی سلسلہ ہے، اور بحیثیت استاذ کامل علامہ شبلی نعمانیؒ کی شخصیت ان کی عظیم محسن شخصیت ہے۔

علمائے فرنگی محل

اس خاندان کو ملا نظام الدین سہالوی بانی درس نظامی سے جو شہرت ملی اس نے اس خاندان کی علمی حیثیت کو دوبالا کر دیا، اس خاندان میں مسلسل ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں جن کا علم وفضل میں ہم پلہ نظر نہیں آتا تھا، خصوصاً ملا بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی، اور آخر میں حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی اور علامہ عبدالحی فرنگی محلی کی شخصیت نے اس کی اہمیت وعظمت میں بہت زیادہ اضافہ کیا، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی شخصیت بھی فرنگی محل کی ناقابل فراموش ہستیوں میں ہے، جن سے مولانا محمد علی جوہر اور

---

(۱) یادرفتگاں از مولانا سید سلیمان ندوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ومجلس نشریات اسلام کراچی

مولانا شوکت علی کی وابستگی نے فرنگی محل کی خدمات کے دائرہ کو بڑی وسعت بخشی۔

حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی

ملک العلماء بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کے پوتے مولانا عبدالحکیم بھی مشہور وممتاز عالم تھے، بانیٔ درس نظامی حضرت ملا نظام الدین فرنگی محلی کی نسل میں تبحر علمی اور ارشاد وتربیت کو جمع کرنے کی روشن مثال ان ہی مولانا عبدالحکیم کے فرزند حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی استاذ مولانا عبدالحی حسنی (والد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) ومرشد حکیم عبدالخالق بارہ بنکوی (والد مولانا عبدالباری ندوی) تھے، لکھنؤ میں فرنگی محل میں پیدا ہوئے، اور اپنے والد مولانا عبدالحکیم فرنگی محلی سے تعلیم وتربیت حاصل کی، پھر درس وافادہ کے کام میں مصروف ہوگئے، پھر حج کی سعادت حاصل کی، اور علمائے حرمین میں خصوصیت سے شیخ احمد بن زین دحلان الشافعی المکی سے استفادہ کیا، اور حدیث کی اجازت حاصل کی، واپس آکر اپنے مکان پر عزلت نشین ہوگئے، مگر درس وتدریس اور ارشاد وتربیت کا سلسلہ جاری رکھا، جس میں طلب صادق ہوتی وہ حاضر ہوکر استفادہ کرتا اور فائز المرام ہوتا، مولانا عبدالحی حسنی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے ''ہدایہ''، ''سراجی''، ''شرح عقائد للدوانی'' اور ''نخبۃ الفکر'' پڑھی، اور حدیث مسلسل بالاولیہ سنی، اور سبھی مقروءات ومسموعات کی اجازت لی۔

مولانا محمد نعیم صاحب مجموعۂ کمالات وجامع صفات شخصیت تھے، ہدایا اور نذریں قبول کرنے میں محتاط تھے، اگر ان کو مال کے مشتبہ ہونے کا شائبہ ہوتا تو بھاری سے بھاری رقم بھی واپس کردیتے ''اس زمانہ کی پچیس ہزار کی ایک رقم جو آج کے لاکھوں روپئے کے مساوی ہوگی پیش کی گئی، مگر انھوں نے مال کے مشتبہ ہونے کی وجہ سے اسے قبول نہیں کیا، اور سب کا سب خیرات کرنے کی تلقین فرمائی۔''(۱)

---

(۱) نزھۃ الخواطر (مولانا عبدالحی حسنیؒ) دارعرفات، رائے بریلی

ورع وتقویٰ کے اس حیرت انگیز واقعہ کے بعد صبر وعزیمت اور تسلیم ورضا کا ایک واقعہ اس وقت سامنے آیا جب ان کے اکلوتے بیٹے مولانا محمد اکرم فرنگی محلی کا سانحۂ وفات پیش آیا تھا، مولانا عبدالحی حسنی ناظم ندوۃ العلماء جو اپنے استادزادہ کے حادثۂ وفات سے متأثر ہوکر تعزیت کرنے حضرۃ الاستاذ کی خدمت میں پہنچے، وہ حسب معمول بڑی طلاقت وبشاشت سے پیش آئے، اور یہ سبق آموز بات ارشاد فرمائی کہ جب بچوں کی ماں تنگیٔ گذران سے متأثر ہوکر کچھ کہنا چاہتیں تو میں ان کو یہ کہہ کر تسلی دیتا ''کہ مولوی محمد اکرم عنقریب کمانے کے لیے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ رزق کے دروازے کھول دے گا، یہاں غیراللہ پر اعتماد ہوا تو اللہ نے اپنے فضل و احسان سے اس کا بھی سدّ باب کردیا۔''

مولانا عبدالحی حسنی فرماتے ہیں کہ: ''میں نے اس کے بعد آپ کے چہرے کو دیکھا، اس کی سلوٹیں شکر وامتنان کے آثار سے منور تھیں۔''

کتب بینی اور مطالعہ کے اس قدر حریص تھے کہ اپنا ایک مکان بیچ کر اس قیمت سے حاشیۃ الطحاوی علی الدر المختار ساٹھ روپئے میں خرید لی، وہ کتابوں کے ہدایا بخوشی قبول فرمالیا کرتے تھے، وہ اپنی خصوصیات وامتیازات وکمالات علمیہ وروحانیہ میں اپنے اسلاف کی زندہ یادگار تھے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> ''حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی بانی درس نظامیہ حضرت مُلّا نظام الدین اور ان کے قابل فخر فرزند مولانا عبدالعلی بحرالعلوم کی شاخ کے گل سرسبد تھے اور دور آخر میں فرنگی محل کی علمی، تدریسی اور روحانی کمالات کی آخری یادگار، زہد وورع، توکل واستغناء میں ان کی نظر دور دور نہ تھی، اپنے والد بزرگوار مولانا عبدالحکیم

صاحب سے اول سے آخر تک تلمذ تھا، تمام علوم متداولہ میں پایہ بلند رکھتے تھے، اور ساری کتب درسیہ کو یکساں قوت اور مہارت کے ساتھ پڑھاتے تھے، اسی کے ساتھ حالات سے بڑے باخبر، طبقات علماء ومشائخ سے نہایت درجہ واقف، علمی مجلس میں بڑے سلیقہ مند، مناقب وکمالات کے لیے ایک دفتر درکار ہے، ضروری معلومات کے لیے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ہشتم، ۲۱ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۸ راگست ۱۹۰۰ء کو وفات پائی۔" (۱)

مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کا ندوۃ العلماء کے کام، مقصد اور مشن سے روز اول سے اتفاق رہا، اور جب ۱۳۱۲ھ میں لکھنؤ میں اس کا دوسرا اجلاس ہوا تو انھوں نے میزبانی کے فرائض بڑھ چڑھ کر انجام دیئے، وہ ندوۃ العلماء کے رکن اعزازی بھی تھے۔ (۲)

مولانا عبدالباری ندوی کے والد حکیم عبدالخالقؒ مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے مرید وخلیفہ تھے، اور انھوں نے اپنے ان ہی مرشد کے اشارے پر ان کا نام عبدالباری رکھا، مولانا عبدالباری ندوی لکھتے ہیں:

"جب ولادت کا وقت قریب ہوا تو اپنے فرنگی محلی شیخ ومرشد کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت! گھر میں ولادت ہونے والی ہے، شیخ نے فرمایا انشاء اللہ لڑکا ہوگا، والد نے نام کے لیے عرض کیا تو فرمایا کہ خالق باری پوری کر لینا، اس طرح اس عبدالخالق زادہ کا نام عبدالباری ہو کر خالق باری پوری ہوئی۔"

حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی سے اپنے والد صاحب کے تعلق کو مزید یوں ظاہر کرتے ہیں:

---

(۱) حیات عبدالحی ص/۷۵-۷۶

(۲) تاریخ ندوۃ العلماء، جلد اول ص/۲۸۱

''حضرت مولانا سید عبدالحی حسنی رائے بریلوی کے ساتھ والد مرحوم کا تعلق یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مولانا مرحوم حضرت مولانا فرنگی محلی کے شاگرد تھے، اور والد مرحوم اپنے مرشد کی خدمت میں حاضری دیتے رہتے، اور بارہا ہفتوں قیام رہتا۔''

وہ اس تعلق کو اور وضاحت سے اس طرح لکھتے ہیں:

''والد مرحوم تو مشاہیر شیوخ وقت میں حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے نہ صرف معمولی مرید تھے بلکہ اپنی کفش بردارانہ ادنیٰ سے ادنیٰ خدمات اور سلوک کے سلسلہ میں مجاہدات شاقہ کی بدولت بڑے چہیتے مرید تھے، مگر اخفاء واستتار طبیعت پر اس قدر غالب تھا کہ وفات کے بعد جب ان کے شیخ کے پوتے مولانا محمد اسلم صاحب گدیا میرے پاس تعزیت کے لیے تشریف لائے تو فرمایا کہ آج حکیم صاحب مرحوم کا ایک راز ظاہر کرتا ہوں، دادا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد جب میں نے ان کے مجازین کی فہرست دیکھی تو اس میں حکیم صاحب مرحوم کا نام بھی تھا۔''

علاّمہ عبدالحی فرنگی محلی

الامام اللکنوی کے نام سے دیار عرب میں شہرت رکھنے والے ہندی عالم اور برصغیر ہند میں علامہ عبدالحی فرنگی محلی کی حیثیت سے جاننے والے بے نظیر محقق، مصنف اور مفتی و معلم، لکھنؤ کے فرنگی محل کے عربی النسل انصاری مدنی خاندان کے چشم و چراغ اور وارث اور اسلامی روایات و اقدار کے امین و مبلغ اور تاریخ اسلام کی ان گنی چنی قابل فخر شخصیات میں سے ایک، جنھوں نے عمر کم پائی مگر کام کئی نسلوں کا کیا، اور وہ کام جو اکیڈمیاں لمبی مدت میں کرتی ہیں انھوں نے مختصر عہد میں کر ڈالا۔

۱۲۶۴ھ میں باندہ میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن کیا، اور پھر معقولات و منقولات کا علم اپنے والد مولانا عبدالحلیم لکھنوی سے حاصل کیا، مطالعہ میں انہماک بڑھتا گیا، اور تعلیم و تعلیم میں پوری یکسوئی پیدا کر لی، والد کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوا، اور وہ ان کا مطالعہ میں انہماک کا امتحان لینے میں ایک بار خود اس وقت ابتلاء میں پڑ گئے جب صاحبزادے نے دوران مطالعہ پانی طلب کیا اور آپ نے پانی کے بجائے مٹی کا تیل دے دیا، جسے وہ پی گئے، اور اپنی دھن میں لگے رہے، فوراً والد صاحب نے جو کہ طبیب بھی تھے اس کا تریاق دیا تا کہ اس کا نقصان نہ پہنچے اور ان کے مطالعہ کا شوق وانہماک دیکھ کر اللہ کے شکر گذار ہوئے۔ (۱)

مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے اللہ کے جو اپنے اوپر احسانات گنائے ہیں ان میں ایک بڑا احسان یہ بھی گنایا ہے کہ اس کی توفیق سے بارہ سال کی عمر سے ہی پڑھانا بھی شروع کر دیا تھا، ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جو پڑھتے جاتے تھے پڑھاتے بھی جاتے تھے، اور علم کی کسی ایک صنف اور فن پر قناعت کر کے نہیں بیٹھے، بہتر سے بہتر اور مفید سے مفید تر کی انہیں تلاش رہی، اور نہ ہی کسی طالب کو مایوس کیا اور نہ کسی کو اپنے در سے محروم کیا، اس کی وجہ سے انھیں بیک وقت علمی خدمت کے نوع بہ نوع کام انجام دینے پڑ جاتے تھے، تصنیف، تدریس، تبلیغ وتذکیر، افتاء اور ارشاد و تربیت کے سارے کام انجام دیتے، اور ذرا بھی تساہلی نہ برتتے۔

حج وزیارت سے دو بار مشرف ہوئے، ایک بار ۱۲۷۹ھ میں اپنے والد مولانا عبدالحلیم لکھنویؒ کے ساتھ، دوسری بار ان کی وفات کے بعد ۱۲۹۳ھ میں، اور وہاں علمائے حرمین سے استفادہ کیا، شیخ احمد بن زین دحلان شافعی، شیخ محمد بن حمید حنبلی سے مکہ مکرمہ میں اور شیخ محمد المغربی الشافعی اور شاہ عبدالغنی مجددی حنفی دہلوی سے مدینہ

---

(۱) اس واقعہ کو حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ نے اپنی کتاب ''آداب المتعلمین'' میں ذکر کیا ہے۔

منورہ میں کسب فیض کیا اور حدیث کی اجازت لی، پھر بقیہ زندگی انھوں نے لکھنؤ میں رہ کر علمی و دینی مشاغل میں گذار دی۔

صرف ۳۹ رسال عمر پائی اور لکھنؤ میں ہی ۲۸ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ کو انتقال فرمایا اور باغ مولوی انوار میں تدفین عمل میں آئی، جہاں آپ کے خاندانی علماء و مشائخ اور اسلاف کی بڑی تعداد مدفون ہے، مولانا عبدالحی حسنی اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں:

"کنتُ حاضراً فی ذلك المشهد، و كان ذلك اليوم من أنحس الأيام، اجتمع الناس فی المدفن من كل طائفة وفرقة أكثر من أن يحصر وقد صلوا عليه ثلاث مرات."(۱)

مولانا عبدالحی فرنگی محلی کو اپنے معاصر علماء میں عظمت و فوقیت حاصل تھی، علامہ نواب سید صدیق حسن خاں قنوجی (م ۱۳۰۷ھ) کو ان سے گرچہ بعض مسائل میں شدید اختلاف ہوا، اور علمی بحثیں چھڑیں، لیکن مولانا عبدالحی کی وفات سے انھیں اس قدر صدمہ پہنچا کہ اس رات انھوں نے کھانا نہیں کھایا، اور غائبانہ نماز جنازہ پڑھی، مولانا سید عبدالحی حسنی (م ۱۳۴۱ھ) نے صحیح لکھا ہے کہ نواب صاحب کا ان سے یہ تعلق علوم و مسائل میں ان کی غیر معمولی واقفیت کی وجہ سے تھا۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے شاگردوں کی تعداد خاصی ہے، ان کے علمی دسترخوان کا حال یہ تھا کہ جس کو ایک بار بھی وہاں شرکت کی سعادت مل گئی اسے استناد و اعتماد حاصل ہو گیا، مولانا ادریس نگرامی (م ۱۳۳۰ھ) مولانا شیر علی حیدرآبادی (م ۱۳۵۴ھ) مولانا حفیظ اللہ بندوی اعظمی (م ۱۳۶۲ھ) نے ان سے خصوصیت سے استفادہ کیا اور باقاعدہ تلمذ حاصل کیا، اور اعتبار پایا، یہ تینوں وہ حضرات ہیں جن سے مولانا عبدالباری ندوی نے تلمذ حاصل کیا، اور علوم و فنون میں مہارت پیدا کی، مولانا

---

(۱) نزہۃ الخواطر جلد ہشتم

عبدالحی حسنی نے مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے باضابطہ تلمذ حاصل نہیں کیا البتہ ان کی مجالس میں کئی بار حاضری دی اور استفادہ کیا اور ان کے جنازہ میں بھی شریک ہوئے، مولانا عبدالباری ندوی کی ان سے بھی راہ ورسم رہی۔

اسی طرح مولانا عبدالباری ندوی کے چچا حکیم امجد علی مرحوم حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے دیگر اہم شاگردوں میں مولانا سید محمد امین نصیرآبادی، مولانا سید ظہورالاسلام فتحپوری، مولانا حمیدالدین فراہی، شاہ عین القضاۃ نقشبندی لکھنوی، مولانا ظہیر احسن شوق نیموی کے نام بھی خصوصیت کے حامل ہیں۔(۱)

مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے اپنے پیچھے کتابوں کا ایک خزانہ چھوڑا، بیسویں صدی کے جلیل القدر محدث اور عظیم محقق شامی عالم علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے خصوصیت سے آپ کی ہی تصنیفات (مخطوطات ومطبوعات) کو اپنا موضوع بنایا اور نئی تحقیق سے بڑے اہتمام سے شائع کرانے کا نظم کیا، ان کی ایک اہم کتاب "ظَفَرُ الأمانی بشرح المختصر المنسوب إلی المحدث الجرجانی" کی تحقیق واشاعت میں انھوں نے دس سال کا عرصہ لگایا، اور غیر معمولی اہتمام وتحقیق سے منظرعام پر لائے، دوسرے بڑے عالم ومحدث مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی اعظمی نے بھی اس کی تحقیق واشاعت کی اور "مؤطا الامام محمد" پر ان کی گرانقدر شرح "التعلیق المُمَجَّد" کو بھی اپنی تحقیق کے ساتھ منظرعام پر لائے، اس طرح مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی علمی شخصیت عالم عرب میں بھی متعارف ومقبول ہے اور عجم میں بھی، اور وہ علوم اسلامیہ میں امام کی حیثیت سے معروف ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے صحیح کہا ہے کہ:

---

(۱) تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو: "الامام عبدالحی الملکنوی علامة الهند وإمام المحدثین والفقهاء" از ڈاکٹر ولی الدین ندوی اعظمی۔

''فخر المتأخرین ابوالحسنات مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۰۴ھ) کا تبحر علمی نادرۂ روزگار جامعیت اور وسعت نظر مشہور و مسلّم ہے۔''(۱)

سلسلۂ عَلَمُ اللّٰہی کی برکات اور نگرام کے علماء و مشائخ کا فیضان

نگرام کی علمی و روحانی حیثیت اور دینی مرکز کا تعارف کراتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:

''نگرام'' اودھ کا ایک نامی گرامی مردم خیز قصبہ ہے، جو ہندوؤں کے عہد میں بھی ایک بڑا علمی مرکز رہا ہے، اور مسلمانوں کے عہد میں بھی اس کی خاک سے بڑی جلیل القدر ہستیاں اٹھی ہیں، شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے محبوب مرید بلکہ خلیفہ اور جانشین حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی اسی قصبہ اور اسی نواح کے ایک خاندان سادات کے چشم و چراغ تھے۔

تیرہویں صدی ہجری کے آخر میں اس قصبہ میں اللہ نے رشد و ہدایت اور اصلاح عقائد کا چراغ روشن کیا، یوں تو اودھ میں بڑے بڑے روحانی و علمی مرکز تھے اور ان سے ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کو فیض باطنی اور علم ظاہری کی دولت حاصل ہوئی لیکن اصلاح عقائد و اصلاح رسوم اور توحید و اتباع سنت کی دعوت کے اس جوار میں دو خاندان علم بردار تھے، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان جس کا مرکز ضلع رائے بریلی تھا،

---

(۱) تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم صفحہ ۲۵۱

دوسرا یہ خاندان جس کا مرکز ضلع لکھنؤ کا یہ قصبہ نگرام تھا۔" (۱)

سیرت سید احمد شہید جلد اول میں تیرہویں صدی ہجری کے دینی وروحانی مراکز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت سید محمد عدل عرف شاہ لعل صاحب رائے بریلوی کے خلیفہ قاضی عبدالکریم جوراسی اور ان کے خلیفہ قاضی عبدالکریم نگرامی (م ۱۲۴۹ھ) اودھ میں نسبت مجددیہ کے حامل اور مرکز ہدایت وارشاد تھے۔" (۲)

حضرت سید شاہ محمد عدل عرف شاہ لعل رائے بریلویؒ

حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلویؒ (۱۰۳۳ھ-۱۰۹۶ھ) اپنے عہد کے بڑے عالی مرتبت اور عالی حوصلہ متبع السنت بزرگ گذرے ہیں، وہ حضرت مجدد الف ثانی امام احمد بن عبدالاحد سرہندیؒ (۹۷۱ھ-۱۰۳۴ھ) کے خلیفۂ اعظم و صاحب سلسلۂ احسنیہ آدمیہ حضرت سید آدم بنوریؒ (م ۱۰۵۳ھ، مدینہ منورہ) کے کبار خلفاء میں سے ایک ہیں، بدعت سے نفرت، سنت کی اتباع اور عقیدہ کی سختی میں اپنی مثال آپ ہوئے (۳) ان کے خلفاء اور اولاد واحفاد میں بھی یہ خصوصیت منتقل ہوئی، ان کے چھوٹے صاحبزادے حضرت سید محمد جی (۴) حضرت شاہ صاحب کے چہیتے

(۱) پرانے چراغ حصہ دوم ص/ ۲۴۷-۲۴۸

(۲) سیرت سید احمد شہید جلد اول ص/ ۱۹

(۳) تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو: "تذکرۂ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ" مؤلفہ مولانا سید محمد الحسنی اور "سیرت سید احمد شہیدؒ" از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، و "سید احمد شہیدؒ" از مولانا غلام رسول مہرؒ، و "خانوادۂ علم اللہی" از مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ۔

(۴) حضرت سید محمد جی (۱۰۷۰ھ-۱۱۵۶ھ) حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ کے سب سے چھوٹے اور بڑے ہی چہیتے صاحبزادہ تھے، علم وطریقت دونوں ہی حضرت شاہ صاحب سے حاصل کیا، اور ان کے جلیل القدر خلیفہ ہوئے، حضرت شاہ صاحب نے انھیں اپنے بعض اہم تبرکات جو حضرت سید آدم بنوریؒ اور (بقیہ بر صفحہ دیگر)

خلیفہ اور اپنے والد کے مثل تھے، ان کے جانشین حضرت سید محمد عدل ہوئے، مولانا سید محمد الحسنیؒ لکھتے ہیں:

''حضرت سید شاہ علم اللہؒ کے پوتوں میں سب سے ممتاز اور روشن نام سید محمد عدلؒ کا ہے، جو سید محمد جی کے فرزند اصغر، سید محمد حکم (۱) کے برادرِ خورد اور شہ لعل صاحب کے نام سے مشہور ہیں، اور اپنے عہد کے نامور مشائخ میں ان کا شمار ہے، اودھ کے اطراف میں متعدد سلسلے اور علمی و دینی حلقے ایسے ہیں جن کا ان سے بیعت وارادت یا اجازت وخلافت کا تعلق ہے، ہندوستان کے مشہور مرکزِ علم اور حلقۂ درس فرنگی محل کے بعض نامور علماء بھی جوان کے معاصر تھے ایک عرصہ ان کی خدمت میں رہ کر ان کے فیضِ صحبت وتربیت سے فیضیاب اور خلافت سے شرف یاب ہوئے، اسی طرح کاکوری کا مشہور سلسلہ نقشبندیہ اور بعض اکابر سلسلہ قلندریہ

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ان کے پاس تھے عنایت فرمائے، تکیہ سے کچھ فاصلہ پر شہر رائے بریلی میں ایک مسجد اور خانقاہ و مدرسہ کی تعمیر کی، یہ دائرہ والی مسجد کہلائی، کعبہ شریف کے نقشہ کے مطابق یہ رائے بریلی میں دوسری مسجد ہے، پہلی مسجد اس نقشہ کے مطابق حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ نے تکیہ میں بنائی تھی۔

خانوادۂ علم اللہی کے مصنف مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ لکھتے ہیں: ''حضرت مولانا سید محمد جی اور ان کے بعد حضرت شاہ لعل صاحب کی وجہ سے اودھ میں جا بجا ارشاد وسلوک کی مسندیں آراستہ ہوئیں۔''

مولانا عبدالحی حسنیؒ نے ان کی نسبت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''نسبت صحیحہ، قوت تاثیر اور توجہ ڈالنے میں وہ اللہ تعالیٰ کی کھلی ہوئی نشانی اور نعمت تھے۔''

ان کی ایک تصنیف بھی ہے، جس کا نام ''شرح کلمات نقشبندیہ'' ہے۔

(۱) حضرت سید محمد حکم (م ۱۱۵۰ھ) حضرت سید محمد عدل کے برادر اکبر اور استاد ومربی ہیں، اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد جی حضرت شاہ علم اللہ کی زندگی میں ہی وفات پا گئے تھے، بلند پایہ مصنف بھی تھے، عربی وفارسی میں الگ الگ تفسیر لکھی، لغت میں ''تلخیص الصراح''، لکھی، نحو میں ''لآلی النحو'' حضرت سید محمد عدل کے لیے لکھی تھی، جن مشائخ سے استفادہ کیا ان میں والد ماجد کے علاوہ شیخ عبدالاحد بن شیخ محمد سعید سرہندی بھی ہیں۔

کی نسبت روحانی بھی ان ہی سے ہے۔

راقم سطور کے جد امجد مولانا حکیم سید عبد الحیؒ نے اپنے استاد حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے وہ الفاظ اپنے قلم سے سیرتِ علمیہ کے حاشیہ پر لکھے ہیں جو وہ شاہ لعل صاحب کے متعلق فرماتے تھے۔ اس شہادت کی اہمیت کا اندازہ اسی کو ہوسکتا ہے جو مولانا محمد نعیم فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے اعتبار علمی و مرتبۂ روحانی سے واقف ہو، وہ لکھتے ہیں:

''استادی مولانا محمد نعیم فرنگی محلی می فرمودند کہ ایں چنیں صاحب ورع و عزیمت و تشرع و تورع و فضل و کمالات و استقامت و کرامات دران جزء زمان بجز حضرت ایشان کسے برنخاستہ ہمچو مہر درخشاں برتافت و عالمے را فیضیاب فرمود۔''

(میرے استاد مولانا محمد نعیم فرنگی فرمایا کرتے تھے کہ ان جیسا صاحب ورع و عزیمت و تشرع و تورع صاحب فضل و کمال و کرامت و استقامت اس عہد میں اور کوئی پیدا نہ ہوا، مہرِ درخشاں کی طرح روشن ہوئے اور ایک عالم کو فیضیاب فرمایا)

بچپن سے جوانی تک اپنے والد سید محمد جی کی تربیت و صحبت میں رہے اور بہت تھوڑی مدت میں سلوک کے سارے منازل طے کر کے اپنے والد کے ترجمان و شارح اور حقیقی جانشین بنے، اور اولیاء متقدمین کا نام روشن کیا، اوائلِ عمر میں اپنے بڑے بھائی سید محمد حکم سے علومِ ظاہری کی تعلیم حاصل کی، استاد کی شفقت اور بھائی کی محبت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ سید محمد حکم نے خاص ان

کے لئے نحو کی ایک کتاب تصنیف فرمائی۔

درسیات وعلوم سے فراغت کے بعد نسبت ومعرفت اور یقین و احسان کی دولت حاصل کرنے کی فکر دامن گیر ہوئی اور اپنے والد کی رہنمائی وتربیت میں سخت سے سخت مجاہدات سے گزر کر اس ''آبِ حیات'' تک پہنچے جو ہفت خواں سر کرنے اور نذرِ جاں پیش کرنے کے بعد بھی ملے تو منعم حقیقی کا احسان وانعام اور فضلِ محض ہے:

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی
منت شناس ازوکہ بخدمت بداشتت

غریبوں، بیماروں اور کمزوروں کی خدمت اس طرح لگ کر کی کہ ''ابوالمساکین'' لقب پڑ گیا، مولانا سید نعمان (جو ان کے خلیفہ بھی ہیں) ان کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''مجاہدانہ زندگی، ریاضت ونفس کشی اور زہد وفیاضی کا یہ عالم تھا کہ اگر بھنا ہوا سالن سامنے آتا تو اس میں پانی ڈال کر زیادہ کر دیتے، کھانا ربع معدہ سے زیادہ نہ کھاتے اور کبھی کبھی اس میں بھی ناغہ کر دیتے، اور باقی کھانا فقراء ومساکین کو عنایت فرما دیتے، جاڑوں میں اکثر ایسا کرتے کہ اپنے اوڑھنے، بچھانے کا سامان (مثلاً رضائی، لحاف وغیرہ) خانقاہ میں آنے والے مہمانوں کو دے آتے، اور صبح اندھیرے منھ اذان سے پہلے جا کر سب کو بیدار کرتے اور سب سامان لپیٹ اور باندھ کر خاموشی سے اپنے حجرہ میں لے آتے، تاکہ کسی کو پتہ نہ چل سکے، آخر میں روئی کا

سامان یہ سوچ کر چھوڑ دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو استعمال نہ فرمایا تھا، عشقِ نبوی اور غایتِ اتباعِ سنت میں چار پائی کا استعمال بھی ترک کر دیا تھا اور زمین پر چٹائی یا پیال بچھا کر آرام فرماتے تھے۔(۱)

ذوقِ عبادت اور خشیت کا وہ حال تھا جس کو سن کر صحابۂ کرام کی ایک جھلک نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، مولانا سید نعمان مؤلف ''اعلام الہدیٰ'' شہادت دیتے ہیں کہ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ عشاء کو نماز میں کھڑے ہوئے اور کوئی خاص حالت و کیفیت ایسی طاری ہوئی کہ رات بھر اسی ہیئت پر کھڑے ہو کر سحر کر دی، یہ لکھنے کے بعد مولانا سید نعمان کہتے ہیں کہ ان کی زندگی وہ تھی جو اس شعر میں بیان کی گئی ہے:

عاشقی را سہ نشان است اے پسر
رنگ زرد و آہ سرد و چشمِ تر

ان کے چہرہ بشرہ سے یہ تینوں کیفیتیں صاف نمایاں تھیں، اور بخدا اس میں ذرا مبالغہ نہیں ہے۔(۲)

اودھ کے علاقوں نیز بہرائچ، مانکپور، الہ آباد اور نواحِ دہلی کے سفر اکثر کرتے اور وہاں کے علماء و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے، اولیاء اللہ کے مزارات و مقابر میں بھی تشریف لے جاتے، لیکن اپنے جانے کی کسی کو اطلاع نہ کرتے تھے، اس کی علامت صرف یہ ہوتی تھی کہ جب جماعت میں

---

(۱) اعلام الہدیٰ (۲) ایضاً

حاضر نہ ہوتے تو لوگ کہتے کہ ''از ما بگریخت'' (ہم سے بھاگ گئے) اسی طرح برہان پور اور بھوپال کا سفر کیا، اور جب وہاں لوگوں کی کسی طرح آمد کی اطلاع ہوگئی اور ہجوم ہوا تو وہ جگہ بھی اسی طرح چھوڑ دی۔

ان حضرات کے اس اخفاءِ حال اور کم آمیزی کا ذکر کرتے ہوئے تذکرہ وسوانح کی مشہور ومقبول کتاب بحرِ زخار کے مصنف (جو شاہ لعل صاحب کے معاصر اور عبد اللہ خاں مرید شاہ لعل صاحب ومصنف ریاض الاولیاء کے دوست بھی ہیں) بحرِ زخار میں لکھتے ہیں:

''مخفی نہ رہے کہ یہ حضرات کرامات وخوارق کے اظہار میں بہت متأمل اور مستور الاحوال تھے، ان کے خاندان میں ملفوظات و مجالس کا رواج نہیں، کہتے ہیں کہ یہ باتیں ان بزرگوں اور درویشوں کو سزاوار ہیں جنھوں نے واقعی دنیا چھوڑ دی ہے، دیانت سے دور ہے کہ ہم اپنے کو بزرگ سمجھ کر ملفوظ سازی کریں۔''

آگے لکھتے ہیں:

''ان کے حالات میں مولوی عبد الکریم (۱) سے دریافت کر کے لکھتا ہوں، لیکن ان سب کو جن کا ان اوراق میں تذکرہ ہے محض شریعت کی شمع اور آسمان حقیقت کا آفتاب سمجھنا چاہئے۔'' (۲)

حضرت شاہ لعل کے استغنا و بے نیازی، دنیا اور دولتِ دنیا کی بے وقعتی، اتباعِ سنت وعزیمت، قبولیت وتاثیر وقوت تسخیر

---

(۱) شیخ عبد الکریم جو راسی خلیفہ حضرت شاہ لعل، ان کا ذکر آگے آئیگا۔

(۲) بحر زخار (منتخب) ص: ۸، مرتب کردہ: ڈاکٹر حکیم مولانا سید عبد العلی حسنیؒ (متوفی: ۱۳۸۱ھ)

کا اندازہ ذیل کے اس عجیب واقعہ سے ہوسکتا ہے جو مولانا محمد ادریس نگرامی مؤلف "الأصول الثابته للفروع النابته" نے تفصیل سے درج کیا ہے، اور ان ہی کے الفاظ میں نقل کیا جارہا ہے:

"میں نے اپنے والد ماجد صاحب (مولانا شاہ محمد عبد العلی نگرامی (۱) سے سنا کہ جب شجاع الدولہ رائے بریلی آیا تو اس کو کمالِ شوق آپ کی قدم بوسی کا ہوا، لوگوں نے عرض کیا کہ حضور کے بروت (مونچھیں) بڑی ہیں، اور حضرت شاہ لعلؒ کے حضور میں جو جاتا ہے اور خلافِ صورتِ پیغمبر ہوتا ہے اس کو ایسا اپنی زورِ ولایت سے سمجھاتے ہیں کہ وہ خود بخود اپنی صورت موافق شریعت کے کرلیتا ہے، چنانچہ شجاع الدولہ یہ سنتے ہی ساکت ہوگیا، دو جوان افغان جو بڑے زور آور اور دلاور تھے کہہ پڑے کہ کیا مجال ہے اس فقیر کی جو ہمارے بروت (مونچھیں) کاٹ لے۔ یہ کہہ کر دونوں آپ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ بعد تھوڑی دیر کے آپ نے اس نرمی سے ان دونوں کو فہمائش کی کہ وہ دونوں از خود رفتہ ہوگئے، اور عرض کیا کہ جو حضرت فرماتے ہیں بسر وچشم منظور ہے، اسی وقت آپ نے اپنے دستِ مبارک سے دونوں جوانوں کی مونچھیں کاٹ ڈالیں، اور موافقِ شریعت کردیں، وہ دونوں رخصت ہوکر شجاع الدولہ کے پاس گئے تو

(۱) مولانا شاہ عبد العلی نگرامی قاضی عبد الکریم جوراسی کے خلیفہ تھے، لیکن حضرت گلزار شاہ سے تکمیل سلوک کی اس کے علاوہ ان کو حضرت شاہ پناہ عطا صاحب سلونی سے بھی اجازت وخلافت ہے، اتباعِ شریعت اور اجتناب عن البدعت میں بہت ممتاز تھے۔

شجاع الدولہ ان کی شریعت کے مطابق صورت دیکھ کر پوچھنے لگا کہ یہ کیا معاملہ ہوا، تم دونوں تو بڑے غرور سے گئے تھے، تب انھوں نے کہا کہ اے سلطان! جس وقت حضرت شاہ لعل صاحب نے نصیحت کرنا شروع کی یہ معلوم ہوتا تھا کہ دو شیر اپنے پنجے پھیلائے ہوئے کھڑے ہیں، اگر ذرا سا بھی ہم خلافِ حکم کرتے ہیں تو فوراً جان سے مار ڈالیں گے۔ یہ سن کر شجاع الدولہ نے خوف کھایا اور ملازمت (خدمت میں حاضری) سے محروم رہا۔'' (۱)

شاہ لعل صاحب اتباعِ سنت میں اپنے آباء واجداد کے نقشِ قدم پر تھے اور یہی ان کا سب سے بڑا وصف تھا، اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والوں اور ان سے استفادہ باطنی کرنے والوں کو قدرتی طور پر سب سے پہلا پیغام یہی ملتا تھا کہ:

بمصطفی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

اور

محمد عربی کا بروئے ہر دوسرا است
کسے کہ خاک درش نیست خاک برسرِ اوست'' (۲)

فرنگی محل کے ایک ممتاز عالم مولانا ازہار الحق بھی جو مولانا انوار الحقؒ کے حقیقی بھائی، مولانا بحر العلوم کے داماد اور مولانا محمد مبین کے چچا تھے، حضرت سید شاہ لعل صاحب سے بیعت وخلافت کا تعلق رکھتے تھے۔

---

(۱) الاصول الثابتہ ص/۱۴

(۲) تذکرہ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ مصنفہ مولانا سید محمد الحسنی مرحوم ص/۱۵۲-۱۵۶

مولانا بحر العلوم بھی ''بوہار''(۱) جاتے ہوئے ایک مرتبہ حضرت سید شاہ لعل صاحب کی خانقاہ سے گزرے تھے اور مولانا ازہار الحق کو اپنے ساتھ بوہار لے گئے تھے۔

مولانا ازہار الحق مدتوں سید شاہ لعل صاحب کی صحبت و تربیت میں رہے اور مراتب عالیہ تک پہنچے، حضرت سید شاہ لعل صاحب کے خلفاء و مجازین میں قاضی عبد الکریم جوراسی کو خصوصیت حاصل ہے، وہ اپنے مرشد و مربی کے زاویہ کے قریب ہی آکر آباد ہو گئے تھے، اور ان کی قبر بھی ان کی بستی تکیہ شاہ علم اللہ کے قریب ہی اسی ساحل دریائے سنی کے قریب راج گھاٹ پل کے پاس ہے۔

حضرت سید شاہ لعل صاحب کے خلفاء و مجازین میں مولانا ازہار الحق فرنگی محلی، مولانا محمد کاظم قلندرؒ کاکوروی، مولانا ذوالفقار علی دیوی تلمیذِ حضرت بحر العلوم و مولانا عبد الکریم جوراسی مرشد قاضی مولانا عبد الکریم نگرامی، مولانا محمد یحیی جائسی اور ''اعلام الہدی'' کے مصنف مولانا سید محمد نعمان (عم بزرگوار امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ) اور عبد اللہ خاں مصنف ''ریاض الاولیاء'' قابلِ ذکر ہیں۔

۸۵/سال کی عمر میں ۱۱/رمضان المبارک ۱۱۹۲ھ کو وفات پا کر حیاتِ جاوید حاصل کی اور روضۂ سید شاہ علم اللہؒ میں اپنے عالی مرتبت دادا حضرت سید شاہ علم اللہ اور دادی مرحومہ کے قریب مدفون ہوئے۔(۲)

حضرت قاضی عبد الکریم جوراسیؒ

حضرت قاضی سید عبد الکریم جوراسی (۳) جو خود بڑے کامل اور فردِ زمانہ تھے

---

(۱) یہ مقام بردوان (مغربی بنگال) کے قریب ہے، اب بھی نیشنل لائبریری کلکتہ میں بوہار سیکشن معروف ہے۔

(۲) اسی لائن میں جس میں حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ اور حضرت شاہ لعلؒ مدفون ہیں، دروازے سے داخل ہوتے ہی پہلی جگہ خالی تھی جو اب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کی آرام گاہ ہے۔

(۳) جوراس نگرام کے قریب ایک موضع ہے۔

سید شاہ لعل صاحب کا شہرہ و آوازہ سن کر ان کے یہاں حاضر ہوئے اور امتحاناً اپنے گھر والوں، اہلیہ وغیرہ کو ان کے گھر بھیج دیا اور خود دیکھنے کے لئے کہ خلافِ سنت و شریعت تو کوئی عمل سرزد نہیں ہوتا باہر رہے اور دونوں ایک طویل عرصہ تک اس کا جائزہ لینے کے بعد آخر میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کے ظاہر و باطن اور خلوت و جلوت میں کوئی فرق نہیں۔

مصنف ''تذکرہ شاہ علم اللہ حسنیؒ'' نے صحیح لکھا ہے کہ ''حقیقت یہ ہے کہ اس بات کا کہنا جتنا آسان ہے اس پر عمل کرنا اتنا ہی دشوار ہے، بڑے سے بڑے انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں کہ اس کو عزیمت کا دامن چھوڑ کر رخصت کا دامن پکڑنا پڑتا ہے، اس کے علاوہ یہ بھی ضروری نہیں کہ ''جو کچھ بیرون در ہو، وہی اندرونِ خانہ'' بھی نظر آئے۔'' مصنف ''تذکرہ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ'' مولانا سید محمد الحسنیؒ اس واقعہ کو ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ ''سید شاہ لعل صاحب کی زندگی میں (یہ) سب سے اہم بات ہے جس نے راقم سطور کے دل میں ان کی عظمت کا نقش قائم کر دیا۔'' (۱)

مولانا محمد ادریس نگرامیؒ نے الاصول الثابتہ میں سید شاہ عبد الکریم کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ واقعہ بھی لکھا ہے جو ان ہی کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

> ''آپ (یعنی شاہ عبد الکریم) کو اس قدر تورع تھا کہ آپ مدت تک کسی کے مرید نہیں ہوئے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ مرید ایسے شخص کا ہونا چاہئے جو اندر باہر اور ظاہر و باطن میں پابند شریعت ہو، جب آوازۂ ولایت حضرت شاہ لعل صاحب کا آپ نے سنا تو واسطے تحقیق حال مع اپنی زوجہ کے عازم رائے بریلی ہوئے اور ایک سال تک اندر آپ کی زوجہ اور باہر آپ جویاں اس امر کے رہے کہ کسی طرح سے کوئی امر اندر یا باہر خلافِ

---

(۱) تذکرہ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ ص/۱۵۹

شریعت تو نہیں ہوتا، جب آپ نے ایک سال قیام فرما کر اپنے مقصدِ قلبی کو پورا پایا تب آپ نے خواستگاریٔ بیعت کی، چنانچہ حضرت شاہ لعل صاحب بہت خوش ہوئے اور بیعت کر کے خلافت سے مشرف فرمایا۔"

قاضی عبدالکریم نگرامی

قاضی عبدالکریم نگرامی خلیفہ حضرت قاضی عبدالکریم جوراسی خلیفہ حضرت شاہ سید محمد عدل بن سید محمد بن حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی کے بارے میں مصنف نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

"شیخ عالم، فقیہ، قاضی عبدالکریم بن محمد مقیم بن امین الدین نگرامی ثم رائے بریلوی شیخ حمید بن عبدالبدیع بن قطب الدین قلندر عمری (فاروقی) جونپوری کی نسل سے ہیں، لکھنؤ کے قصبہ نگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے، رسائل مختصرہ کا علم اپنے ماموں مولانا محمد نذیر سے حاصل کیا، فقہ واصول فقہ حافظ معین الدین صالحی امیٹھوی سے پڑھا، منطق وفلسفہ اور بعض دوسری کتابیں مولانا عبدالقدوس لکھنوی اور مولانا عبدالواجد خیرآبادی سے اور علم طب حکیم ببر علی خاں موہانی سے پڑھا، پھر قاضی عبدالکریم جوراسی کی صحبت اختیار کی، اور انھیں سے سلوک طے کیا، اور ہمارے شہر رائے بریلی میں اقامت پذیر ہوگئے، فقہ وسلوک میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، زاہد، عفیف، متوکل بڑے ہی عبادت گذار تھے، کئی کتابیں بھی تصنیف فرمائیں، ۲۱ر رجب ۱۲۴۹ھ کو رائے بریلی میں انتقال فرمایا، اور اسی شہر میں مدفون ہوئے۔(۱)

قاضی عبدالکریم نگرامی رائے بریلوی کے خلفاء میں مولانا شاہ گل محمد رائے بریلوی وشاہ گلزار علی کشنوی اور مولانا عبدالعلی نگرامی کے نام سرفہرست ہیں، مصنف

(۱) نزہۃ الخواطر جلد ۷ ص/۳۳۱

''مہر جہاں تاب'' کے حوالہ سے صاحب ''نزہۃ الخواطر'' لکھتے ہیں کہ مولانا شاہ گل محمد نے رائے بریلی آکر قاضی عبدالکریم نگرامی سے استفادہ کیا، اوران کے خلیفہ ہوئے، اوران کے بعدان کی جگہ مسند نشیں بھی ہوئے۔(۱)

مولانا عبدالعلی نگرامی نے بقیہ سلوک شاہ گلزار علی کشنوی سے طے کیا، اور مراتب عالیہ پر فائز ہوئے۔

مولانا عبدالعلی نگرامیؒ

''شیخ عالم صالح عبدالعلی بن پیر علی بن غلام امام الہندی النگرامی یکے از فقہائے حنفیہ ۱۲۳۸ھ کو پیدا ہوئے، اپنے ماموں مولانا علیم اللہ وسید انور علی مرادآبادی و شیخ اوحدالدین بلگرامی اور شیخ عبدالحکیم بن عبدالرب لکھنوی اور دوسرے علماء سے علم حاصل کیا، طریقت میں قاضی عبدالکریم نگرامی سے وابستہ ہوئے، اوران سے کسب فیض کیا، پھران کے خلیفہ شاہ گلزار علی کشنوی کی صحبت اختیار کی، مولانا عبدالعلی نگرامی کو شاہ پناہ عطا سلونی (تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ) اور حضرت خواجہ احمد نصیرآبادیؒ (۲)

---

(۱) نزہۃ الخواطر جلد/۷ ص/۴۳۸

(۲) مولانا عبدالعلی نگرامی (والد واستاذ ومرشد مولانا محمد ادریس نگرامی استاذ ومربی مولانا عبدالباری ندوی) کو اس طرح حضرت خواجہ احمد نصیرآبادیؒ کے توسط سے امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ وطریقہ میں بھی اجازت وفیض حاصل تھا، جو سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے خلیفہ تھے، اور سلوک وطریقت وکار اصلاح ودعوت میں مجددانہ شان رکھتے تھے، اور لاکھوں لاکھ لوگوں کو ان کے ہاتھ پر توبہ کی توفیق ملی تھی، اور عرفان نفس ومعرفت الٰہی کی چاشنی ملی تھی، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ہندوستان کی عظیم دینی ومصلح وداعی شخصیت کے طور پر امام ربانی مجدد الف ثانی امام احمد سرہندیؒ (م ۱۰۳۴ھ) کے بعد دوسری شخصیت کی حیثیت سے تعارف کراتے ہوئے اپنی کتاب ''ہندوستانی مسلمان'' میں لکھا ہے:

''دوسری شخصیت حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ہے جنھوں نے دین خالص، جہاد فی سبیل اللہ، خلافت راشدہ کے نقشہ پر حکومت شرعیہ کی تشکیل اور دین حق کی سربلندی کے لیے جانی ومالی قربانیاں دینے کی ترغیب لوگوں کو دی، آپ کی مخلصانہ کوششوں کی بدولت عام مسلمانوں میں ایمان ویقین اور (بقیہ برصفحہ دیگر)

(خلیفہ حضرت سید محمد نصیر آبادیؒ خلیفہ امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ) سے بھی اجازت حاصل ہوئی۔

وہ ذی ورع وتقویٰ، صاحب صلاح وعفت وتوکل تھے، بڑی تعداد میں خلق خدا کو ان سے نفع پہنچا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ اپنے بندوں کو ہدایت نصیب فرمائی، ان کی مشہور کتابوں میں "تفسیر آیات الأحکام" (ایک جلد میں)، "تحقیق الأمور فی حدوث الفاتحة والنذور"، "تحقیق المولد والقیام" (عربی میں)، "الیواقیت اللطیفه فی تائید مذهب أبی حنیفة"، "التحریر فی حرمة المزامیر" اور بعض دوسرے رسائل ہیں۔"(۱)

۲۸ رشوال ۱۲۹۶ھ کو بروز بدھ انتقال فرمایا، اور ان کے صاحبزادے وخلیفہ مولانا محمد ادریس نگرامی جانشین ہوئے، مولانا عمیر الصدیق دریابادی ان کے علمی و دینی مقام سے متعلق رقمطراز ہیں:

> "مولانا حافظ عبدالعلی نگرامی ایک نامور عالم تھے، مشہور نقشبندی بزرگ قاضی عبدالکریم نگرامی سے بیعت اور صاحب اجازت تھے، یہ قاضی عبدالکریم اپنے ہم نام قاضی عبدالکریم جوراسی کے خلیفہ تھے، جو حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلوی کے صاحبزادہ

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) خدا پرستی کی لہر دوڑ گئی، یا یوں کہئے کہ قرون اولیٰ کا ایک جھونکا تھا جو اس عہد میں چلا اور اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے تن مردہ میں یقین وایمان کی روح پھونک دی، آپ کی جماعت اور آپ کے متبعین کی دینی پختگی، پابندیٔ شریعت اور شوق جہاد کی مثال نہیں ملتی۔" (تفصیل کے ملاحظہ ہو: "سیرت سید احمد شہیدؒ" (اول، دوم) از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، و "سید احمد شہید" از غلام رسول مہرؒ)

اور ان کے ہاتھ پر بیعت وتوبہ کرنے والوں کی کیفیت وکمیت کا حال بیان کرتے ہوئے صرف قیام کلکتہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ "کلکتہ میں دو مہینہ قیام رہا، روزانہ ایک ہزار آدمی کے قریب بیعت سے مشرف ہوتے، روز بروز ہجوم بڑھتا جاتا تھا۔" ("ہندوستانی مسلمان" ص/۷۲)

(۱) نزہۃ الخواطر جلد/۷ ص/۳۰۹-۳۱۰ مطبوعہ دار عرفات رائے بریلی

سید محمد کے مرید اور سید محمد عدل کے تربیت یافتہ تھے، اس کے علاوہ مولانا عبدالعلی کو حضرت سید احمد شہید کے بھانجہ خواجہ احمد نصیرآبادی سے بھی اجازت حاصل تھی، ان بزرگوں کے اثر نے ان کے اندر توحید کا جوش اور سنت کا غیر معمولی ولولہ پیدا کر دیا تھا، وہ گاؤں گاؤں پھر کر دین حق کی منادی کرتے تھے، اس زمانہ میں شرک و بدعات اور غیر شرعی رسوم کا جال ہر جگہ پھیلا ہوا تھا، مولانا عبدالعلی کے پر تاثیر مواعظ اور دلنشین انداز بیان سے بکثرت لوگ تائب ہوئے، اور شیخ سدو کے بکروں اور ہٹیلے کے مرغوں کو چھوڑ کر اور میلوں ٹھیلوں سے منہ موڑ کر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری میں لگ گئے۔" (۱)

حضرت مولانا محمد ادریس نگرامیؒ

مولانا ادریس نگرامی مولانا عبدالعلی نگرامی کے بیٹے اور حضرت مولانا محمد اویس نگرامی (شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء) کے دادا تھے، مولانا عبدالباری ندوی نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں، اس وقت لکھنؤ اور اس کے اطراف میں حضرت مولانا محمد ادریس نگرامی کا آفتاب رشد و ہدایت نصف النہار پر تھا، وہ ایک عالم جلیل، مصنف و محقق ہونے کے ساتھ بلند پایہ شیخ طریقت و عارف کامل تھے، ان کے والد مولانا عبدالعلی نگرامی بھی مشہور علماء و مشائخ میں تھے، سلسلہ نقشبندیہ کے عظیم المرتبت شیخ حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلویؒ (۱۰۹۶ھ) جد امجد امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ کا یہ سلسلہ ہے جس کے وہ شیخ تھے، ان کا نقش نقش اول تھا جو مولانا

---

(۱) "تعمیر حیات" (۱۰ ستمبر ۱۹۷۶ء)

عبدالباری پر پڑا، ان کا اعتراف ہے کہ:

"اس تباہ کار پر تو ان کی بزرگانہ نظر ایسی کیمیا اثر ثابت ہوئی کہ نہ صرف نماز باجماعت کا انھیں کی مسجد سے پابند ہوگیا، پڑھنے کا شوق بھی اتنا ہوگیا کہ ندوہ کے زمانہ تعلیم کی جتنی خامیاں تھیں سب اللہ نے دور فرمادیں۔" (۱)

مصنف نزہۃ الخواطر جو کہ ان کے معاصر اور بعض حیثیتوں سے رفیق بھی ہیں لکھتے ہیں:

"الشیخ العالم الصالح إدریس بن عبد العلی الحنفی النگرامی أحد الفقهاء المتورعین ولد بنگرام یوم الإثنین رابع عشر من شوال سنة خمس و سبعین و مائتین بعد الألف، وقرأ العلم علی والده وتفقه علیه ثم دخل لکهنؤ، وقرأ "مسلم الثبوت فی أصول الفقه" علی مولانا عبد الحی بن عبد الحلیم اللکهنوی وأسند الحدیث عن الشیخ عبد الحق بن محمد میر الدهلوی (۲)، والشیخ عبد الرحمن بن محمد البانی بتی وشیخنا الإمام

---

(۱) مولانا عبدالباری ندوی کو عبادت کا ذوق اور تعلیم وتعلم کا شوق مولانا ادریس نگرامی کی صحبت بابرکت سے حاصل ہوا، اور وہیں سے ان کو وہ جذبہ وولولہ ملا جس کو پھر بعد میں ندوہ کے قیام اور علامہ شبلی کی سرپرستی نے ترقی دی، جس کے وہ تاحیات معترف رہے۔

(۲) مولانا عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی مراد ہیں جو ندوۃ العلماء کے ابتدائی مرحلہ میں اس کے بڑے سرگرم رکن اور رہنماؤں میں تھے، اور جب اس کے دارالعلوم کے قیام کی بات سامنے آئی تو وہ دہلی میں اس کے قیام کے لیے کوشاں ہوئے، مگر یہ سعادت لکھنؤ کے نصیب میں تھی، ذلك فضل الله یؤتیه من یشاء.

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اول از مولانا اسحاق جلیس ندوی)

فضل الرحمن بن أهل الله البكرى المرادآبادى(١)، وأخذ الطريقة عن أبيه وعن الشيخ فضل الرحمن المذكور وعن خالى المرحوم عبد السلام بن أبى القاسم الحسينى الواسطى(٢)، وعن غيره من المشائخ وتولى الشياخة بعد أبيه.

وكان صالحا متورعا متين الديانة، حسن الأخلاق، لطيف المعاشرة مع اشتغال بخاصة النفس، وتفويض للأمور وعفاف، وعزة نفس، يدرّس ويذكّر.(٣)

---

(١) بقول مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی: حضرت شاہ محمد آفاق کے خلیفۂ ارشد، اویس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ (۱۲۰۸ھ-۱۳۱۳ھ) تھے، جن کے جذبہ قوی، نفس گرم، زہد وتجرید، اتباع شریعت، علم سنت و حدیث اور عشق الٰہی وحب نبویؐ نے نصف صدی کے زائد تک ہندوستان (بالخصوص شمالی ہند) کی فضا کو گرم اور منور رکھا، اور خود ان ہی کے الفاظ میں عشق کی دکان کی گرم بازاری رہی، ندوۃ العلماء کے اکثر بانی وناظم حضرت مولانا کے مرید ومسترشد تھے، مثلاً مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی وناظم اول ندوۃ العلماء، مولانا مسیح الزماں خاں شاہجہاں پوریؒ (ناظم ندوۃ العلماء) مولانا سید ظہور الاسلام فتحپوریؒ، مولانا سید تجمل حسین بہاریؒ، مولانا حکیم سید عبدالحیؒ (ناظم ندوۃ العلماء) نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، صفی الدولہ نواب سید علی حسن خاں (ناظم ندوۃ العلماء) مولانا کے سلسلہ کی اشاعت اول الذکر مولانا محمد علی مونگیری سے بڑے وسیع پیمانہ پر ہوئی۔ (تاریخ دعوت وعزیمت جلد چہارم، ص/۳۸۰)

(٢) حضرت مولانا شاہ عبدالسلام حسینی ہنسوی (۱۲۳۴ھ-۱۲۹۹ھ) سادات حسینی کی اس شاخ کے چشم وچراغ ہیں جو واسط (عراق) سے ہوکر ہندوستان پہنچی، اپنے وقت کے مشہور علماء ومشائخ سے استفادہ کیا، ان کے والد حضرت شاہ سید ابوالقاسم الواسطی ہنسوی حضرت شاہ غلام علی دہلوی کے خلیفہ تھے، اور چچا مولانا سید سراج الدین ہنسوی حضرت سید احمد شہیدؒ کے مرید ومجاز اور آپ کے مربی ومعلم تھے، مولانا شاہ عبدالسلام ہنسوی حضرت شاہ غلام علی دہلوی کے جلیل القدر صاحبزادہ وخلیفہ وجانشین شاہ احمد سعید مجددی کے خلیفہ اور ان کے خلفاء میں بھی اونچا مقام رکھتے تھے، ان کے خلفاء وخواص مستفیدین میں مولانا ادریس نگرامی، مولانا عبدالحی حسنی ناظم ندوۃ العلماء کے علاوہ ایک اہم نام مولانا ناظر علی کاکوروی کا بھی ہے جن کے صاحبزادہ مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی بڑے دینی مصلح وداعی ہوئے اور امام اہل سنت کے لقب سے مشہور ہوئے۔

(٣) نزهة الخواطر جلد ہشتم

مولانا ادریس نگرامی کثیر التصانیف عالم تھے، مولانا عبدالحی حسنی نے ان کی چودہ اہم کتابوں کے نام گنائے ہیں، ۱۰ر رمضان ۱۳۳۰ھ کو نگرام میں انتقال کیا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء

''دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد قدیم وجدید کے امتزاج اور اعتدال وتوسط کے اصول پر رکھی گئی، ذمہ داران ندوۃ العلماء کا خیال تھا کہ دین ایک ایسی ابدی اور محکم چیز ہے جس میں کسی تغیر وتبدل کا امکان نہیں، لیکن علم ایک تغیر پذیر شے ہے جس میں ضرورت اور وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے تبدیلی اور حذف واضافہ ہوسکتا ہے، دارالعلوم کا مقصد اصلی اہل سنت کے مختلف فرقوں کے درمیان (جو عقائد وارکان دین میں متفق ہیں) اتحاد ویکجہتی پیدا کرنا تھا، شروع ہی سے ندوۃ العلماء نے علوم اسلامیہ اور نصاب درس کو تغیر پذیر اور حسب ضرورت ترمیم وتنسیخ کے لائق سمجھا۔

دارالعلوم نے خاص طور سے قرآن مجید کی طرف ایک ابدی پیغام حیات کی حیثیت سے توجہ کی، اور تدریجی طریقے سے اور زیادہ مدت تعلیم میں اس کو شامل نصاب کیا، عربی زبان وادب کی تعلیم کی طرف بھی ایک زندہ اور جدید زبان کی حیثیت سے توجہ منعطف کی، کیونکہ عربی زبان ہی قرآن وسنت کے فہم کی کلید اور اس کے رازہائے سربستہ کی امین ہے، دارالعلوم نے کبھی عربی زبان کو قدیم اور مردہ زبان (جس کے بولنے اور لکھنے والے اس دنیا میں ناپید ہوں) نہیں سمجھا، جبکہ ہندوستان نے اس زبان کے ساتھ یہی سلوک کر رکھا تھا، نصاب درس میں ندوہ نے ان قدیم علوم کو جو زیادہ مفید نہیں تھے حذف کردیا یا ان کی مقدار بہت ہی کم کردی، اور ان کی جگہ ایسے جدید علوم داخل درس کئے جن کی موجود دور کے عالم دین کو جو ملت اسلامیہ کی خدمت کرنا چاہتا ہو، شدید ضرورت پیش آتی ہے، دارالعلوم نے شروع ہی سے اس بات کی پوری کوشش

کی کہ اسلام کے ایسے داعی وشارح تیار کئے جائیں جو دین حنیف کو جدید دنیا کے سامنے مؤثر انداز اور جدید اسلوب میں پیش کرسکیں، ندوہ کو بحمد اللہ اپنے مقاصد میں قابل قدر کامیابی حاصل ہوئی، اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ علماء تیار ہوئے جو جدید دنیائے اسلام کے لیے قابل تقلید ہیں، ان فضلاء نے اسلامی ادب، علم کلام، تاریخ اور سیرت نبویؐ کے موضوع پر نہایت قیمتی علمی سرمایہ فراہم کردیا۔

ان فضلاء میں خاص طور پر مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالباری ندوی قابل ذکر ہیں(۱)، اول الذکر علامہ شبلی نعمانی کے قائم کئے ہوئے علمی ادارہ ''دارالمصنفین''، اعظم گڑھ کے سربراہ رہے، اوران کی سربراہی میں ندوی فضلاء نے اس ادارہ میں تاریخ، ادب اور فکر اسلامی کے موضوعات پر قیمتی اسلامی لٹریچر پیش کیا، پھر ریاست بھوپال میں، پھر پاکستان میں اسلامی امور میں اہم ذمہ داریاں سنبھالیں، ثانی الذکر فلسفۂ جدید کے بڑے استاذ اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں صدر شعبہ رہے، اوراپنی بحث وتحقیق کے ذریعہ اہم فکری لٹریچر پیش کیا۔

ندوۃ العلماء کے فارغین میں ان کے علاوہ متعدد اہم بڑے اہل قلم اور مفکرین اور تعلیمی واجتماعی میدانوں میں کام کرنے والے پیدا ہوئے۔''(۲)

استاذ الاساتذہ علامہ شبلی نعمانیؒ

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے، علم وفضل میں بڑی شہرت پائی، دین وملت کی فکرمندی ودردمندی نے ان سے ایسے پرجوش و پرسوز مضامین لکھوائے اور نظمیں کہلوائیں جس نے ملت کے افراد کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا،

---

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اولین فضلاء میں ہیں، اور سرفہرست فضلاء میں مولانا عبدالباری ندوی ان کی فراغت کے چند سال بعد ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔ (م)

(۲) ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ (مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی) ص/۱۳۸-۱۴۰

دشمنان اسلام کی قلمی ریشہ دوانیوں کا طاقتور اسلوب میں اور دلائل وشواہد کے ساتھ اس طرح جواب دیا کہ دنیائے علم حیران رہ گئی، ''کتب خانہ اسکندریہ'' جب انھوں نے لکھی تو دنیائے علم پر یہ ظاہر ہوا کہ یورپ کے اسلام اور مسلمانوں کے تئیں جھوٹے الزامات اور غلط پروپیگنڈہ سے تاریخ کو مسخ کیا گیا ہے، انھوں نے اسلامی تاریخ کی تدوین کا بڑے اچھوتے انداز میں پروگرام بنایا اور پھر اس کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا، مگر وہ ''الفاروق'' اور ''المامون'' ہی لکھ سکے اور ''الولید'' کا ارادہ کئے ہوئے تھے اسی اثناء میں ان پر سیرت نگاری کا ایسا جذبہ طاری ہوا کہ سبھی کام پس پشت پڑ گئے، بلکہ ان کے جانشینوں کی طرف محول ہو گئے، جسے بعد میں پوری منصوبہ بندی سے عمل میں لایا جاتا رہا، اس طرح ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا، اور یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ آخری کام جسے وہ انجام دے رہے تھے وہ ''سیرت النبیؐ'' کی تصنیف کا معرکۂ آراء کام تھا، جس سے سیرت اور سیرت کے کاموں پر اٹھنے والے شبہات کا ایک ایک کر کے ازالہ کیا گیا، مگر اس کی تکمیل ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندویؒ کے حصہ میں تھی، سات جلدوں میں یہ بابرکت وعظیم کام منظر عام پر آیا، اور ہر طرح سے علامہ شبلیؒ پر خود ان کی اپنی یہ بات صادق آئی کہ ؎

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبر خاتمؐ
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

مردم سازی، اسلام اور مسلمانوں کو درپیش خطرات کے سمجھنے، مسلمانوں کے قومی امراض کو جاننے کی اعلیٰ صلاحیت انھیں عطا ہوئی تھی، ان کی توجہ تربیت اور تعلیم سے ایسے باکمال افراد دین وملت کی علمی خدمت اور فکری رہنمائی کے لیے تیار ہوئے

جن میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو ناقابل فراموش ہیں، ان کو صرف اپنے ملک میں بسنے والے مسلمانوں کا درد نہیں تھا، مسلمان خواہ کسی ملک میں بستا ہو، وہ اس کے درد میں شریک تھے، اس کے جو مسائل جہاں ہوں اس کو انھوں نے اپنا مسئلہ سمجھا، اسی لیے وہ دوسری زبانوں خصوصاً انگریزی میں مہارت پیدا کرنے کا حوصلہ پیدا کرتے، اور اس تعلق سے وہ اپنے شاگردوں کو گرانقدر تعاون بھی دیتے، مولانا عبدالباری ندویؒ کی تعلیم وتربیت میں انھوں نے جس طرح حصہ لیا اور ان کی جیسی فکر رکھی یہ ان ہی کا حصہ تھا، جس کے مولانا عبدالباری ندوی ہمیشہ مرہون منت رہے، اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے الفاظ میں:

> ''سبکدوشی وخانہ نشینی کے آخری ایام میں مولانا شبلیؒ کی یاد بھی ان کو بہت آنے لگی تھی، ان کے احسانات، ان کی تعلیم وتربیت کے گہرے اثرات کا وہ اپنی تحریر وتقریر میں بار بار تذکرہ فرماتے تھے، اور موجودہ دارالعلوم کو وہ بانیٔ ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری کے بجائے مولانا شبلیؒ کا ساختہ پرداختہ سمجھتے تھے۔''(۱)

مولانا عبدالباری ندوی علیہ الرحمہ علامہ شبلی نعمانی کے نئی نسل پر احسانات کو ندوہ کے تناظر میں پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''علامہ شبلی کا اثر عام طور پر ندوہ کے طلبہ پر یہ پڑا کہ ان میں نہ صرف درسی کتابوں کے پڑھنے کا شوق ہوگیا بلکہ غیر درسی کتابوں کے پڑھنے کا بھی عام شوق پیدا ہوگیا، ساتھ ہی ساتھ مضمون نگاری وغیرہ کا بھی، کتب خانہ جس میں پہلے شاذ ونادر ہی دو ایک طالب علم نظر آتے تھے، اب قریب قریب بھرا رہتا، نیز مولانا کے

---

(۱) پرانے چراغ ۲/۱۲۸۔

اثر سے تاریخ وادب کے مطالعہ تحریر وتقریر کا شوق وذوق عام ہوگیا تھا، اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ یاد آیا، اعظم گڑھ کے ایک طالب علم عبدالعزیز نام کے تھے، ماشاء اللہ اب بھی موجود ہیں، اور اپنے گھر پر کاشتکاری کا کام کرتے ہیں، انھوں نے نخاس سے ایک پرانی کرسی میز خریدی اور اس پر علامہ شبلیؒ کی نقالی میں بیٹھ کر مضمون نگاری کیا کرتے، مگر جب مولانا کو اپنا کوئی مضمون دکھاتے تو مولانا فرماتے کہ تم اس کی کوشش نہ کرو، مضمون نگاری نہ فرض ہے نہ ضروری، نہ تم کو اس سے مناسبت ہے، آخر کار وہ مایوس ہوکر بیٹھ ہی گئے، اور اب جا کر اندازہ ہوتا ہے کہ جس اعظم گڑھ کے مولانا عبدالسلام نے اپنی یادگار میں درجنوں کتابیں چھوڑیں، اسی اعظم گڑھ کے میاں عبدالعزیز ایک مضمون بھی شاید زندگی بھر نہ لکھ سکے، اصل میں مولانا شبلیؒ میں جوہر شناسی کا ملکہ بہت غیر معمولی تھا، ان کے دارالعلوم میں قدم رکھتے ہی حضرت سید صاحبؒ کا تو ذکر ہی کیا مولوی عبدالسلام، مولوی ضیاء الحسن وغیرہ کئی طالب علم دیکھتے دیکھتے اچھے خاصے مضمون نگار ہوگئے، جن میں سے بعض کے مضمون ''الندوہ'' میں شائع بھی ہوتے اور قدر کی نگاہ سے پڑھے جاتے۔

حضرت علامہؒ کی مجلس عام کا وقت عصر اور مغرب کے وقت رہتا، جس میں اس وقت کے بی.اے. کے فلسفہ کے طالب علم اور آج کے مولانا عبدالماجد نیز ان کے بڑے بھائی ڈپٹی عبدالمجید مرحوم وغیرہ دوسرے لوگ بھی آبیٹھتے، ندوہ کے طلبہ کے ساتھ حضرت

ممدوح کا معاملہ بالکل اولاد کا سا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اولاد سے بھی بڑھ کر، ایک لطیفہ یاد آ گیا، غالباً مجلس میں کسی نے یہ خبر سنائی کہ میاں حامد (مولاناؒ کے اکلوتے صاحبزادہ) نے فٹ بال میں کوئی کپ یا انعام حاصل کیا ہے، مولانا نے برجستہ فرمایا کہ یہ تو شبلی کے لڑکے کی نہیں کسی نٹ کے لڑکے کی تعریف ہوئی، اس سے اندازہ لگایئے کہ مولانا اپنی اولاد کس کو سمجھتے تھے، اور اس کے حق میں دامے درمے سخنے کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے، اس کی سب سے بڑی شہادت خود راقم ہذا کی آپ بیتی ہے۔" (۱)

مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے نام علامہ شبلی کے جو مکتوبات ہیں ان سے بھی اس گہرے تعلق کا پتہ چلتا ہے جو ان دونوں استاد و شاگرد کے درمیاں رہا تھا، جس سے ایک جانب سے محبت و عقیدت اور دوسری جانب سے شفقت و اعتماد کا پتہ چلتا ہے، ۱۰/جون ۱۹۱۳ء کے ایک مکتوب میں وہ لکھتے ہیں:

"بھائی میں تو اب چراغ سحر ہو رہا ہوں، تم لوگ اب اپنی ذمہ داری کو محسوس کرو، میں اپنے عیوب کو سب سے بہتر جانتا ہوں، "المرء أعرف بنفسه" لیکن علمی صحیح مذاق کا پھیلانا اپنا کام سمجھتا رہا....." (۲)

مکتوب ۱۶/اکتوبر ۱۹۱۴ء میں لکھتے ہیں:

"میں واقعات حال سے اس قدر افسردہ ہو گیا ہوں کہ اب کسی بات سے طبیعت شگفتہ نہیں ہوتی۔"

---

(۱) ماخوذ از: سرگذشت، از: مولانا عبدالباری ندوی (مشمولہ کتاب "مذہب و سائنس" ص/۱۳-۱۴)

(۲) ملاحظہ ہو: مکاتیب شبلی، مرتبہ علامہ سید سلیمان ندوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

والدین ماجدین

والد ماجد حکیم عبدالخالق بارہ بنکوی صاحب دل بزرگ تھے، اور والدہ صاحبہ صدیقہ بی (صدیقۃ النساء نام تھا، صدیقہ کہی جاتی تھیں) بڑی نیک سیرت اور اعلیٰ صفات کی حامل خاتون تھیں، ایک ہی خاندان کے دونوں افراد تھے، اور خاندان تھا مدینہ منورہ کا انصاری خاندان، حافظ احمد الباری صاحب کہتے ہیں کہ ''ان کا خاندانی سلسلہ اور لکھنؤ کے فرنگی محل کے انصاری النسب علماء کا خاندانی سلسلہ اوپر جا کر مل جاتا ہے۔'' اور یہ سلسلہ اس مبارک قبیلہ تک پہنچتا ہے کہ جس کے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا: ''الأنصار شعار والناس دثار، الخ'' مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے مجمع کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ ''ان کا مختصر تعارف تو یہ ہے کہ وہ ''گدیہ'' ضلع بارہ بنکی کے ایک انصاری اور بہت شریف خاندان کے فرد تھے۔''(۱)

مشہور مصنف وانشاء پرداز اور معلم مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی رقمطراز ہیں:

> ''مولانا نے ایک کھاتے پیتے گھرانہ میں آنکھیں کھولیں، آپ کا خاندان دنیاوی ثروت و وجاہت کے ساتھ دولت دین سے بہرہ مند تھا، یعنی خوش حال بھی تھا، اور خوش مآل بھی، سن ولادت ۱۳۰۷ھ ہے، والد ماجد حضرت حکیم عبدالخالق علیہ الرحمہ اپنے زمانہ کے ایک شیخ کامل حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی نبیرہ حضرت ملا نظام الدین سہالوی بانی درس نظامی کے دست گرفتہ، مرید با اختصاص اور خلیفہ مجاز تھے، والدہ ماجدہ ایک خداترس اور خدارسیدہ بی بی تھیں، جن کے مزاج وافتاد میں دین راسخ تھا۔''

(۱) مولانا کا یہ خطاب شامل کتاب ہے۔

مولانا عبدالباری ندوی اپنی سرگذشت حیات میں لکھتے ہیں:

''میرا خاندان یا گھر گھرانہ دنیا کے جاہ ومال سے کہنا چاہئے کہ بالکل فارغ البال تھا، البتہ جن والدین کے گھر میں میں پیدا ہوا وہ بحمداللہ خصوصاً زمانہ کو دیکھتے ہوئے دین کی دولت سے مالا مال تھے، والد مرحوم تو مشاہیر شیوخ وقت میں حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کے نہ صرف معمولی مرید تھے بلکہ کفش بردارانہ ادنی سے ادنی خدمات اور سلوک کے سلسلہ میں مجاہدات شاقہ کی بدولت بڑے چہیتے مرید تھے، مگر اخفاء واستتار طبیعت پر اس قدر غالب تھا کہ وفات کے بعد جب ان کے شیخ کے پوتے مولانا محمد اسلم صاحب ''گدیا'' (بارہ بنکی) میرے پاس تعزیت کے لیے تشریف لائے تو فرمایا کہ آج حکیم صاحب مرحوم کا ایک راز ظاہر کرتا ہوں، دادا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد جب میں نے ان کے مجازین کی فہرست دیکھی تو اس میں حکیم صاحب مرحوم کا نام بھی تھا، تب میں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت آپ تو اپنے شیخ کے مجاز بھی ہیں، خود میں نے مجازین کی فہرست میں آپ کا نام پڑھا، میرے شانہ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ بس ایک درخواست ہے کہ اب کسی اور پر اس کو ظاہر نہ فرمائیں، ان کی زندگی بھر میں نے ان کے اس حکم کا پورا خیال رکھا لیکن اب ان کی وفات کے بعد آج آپ سے ظاہر کر دینے ہی کا جی چاہا، خود میرا ذہن بھی کبھی اس طرف نہ گیا، نہ ان کے کسی مرید وغیرہ کا علم ہوا، بس زیادہ سے زیادہ ایک صاحب سے یہ معلوم ہوا کہ ان کو

کچھ ذکر وغیرہ کی تعلیم فرمادی تھی، اب والدہ مرحومہ کے دینی احساسات کا ایک ہی واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے، میں پونہ کے دوران ملازمت میں سالانہ بڑی تعطیل میں گھر اس حال میں آیا تھا کہ نماز صرف فرض پڑھتا تھا، سنتیں بالکل متروک تھیں، اب بالکل یاد نہیں کہ شامت کا باعث کیا تھا، تاہم غالباً ہفتہ دو ہفتہ کے بعد ہی سنتیں بھی پڑھنے لگا، تب والدہ ایک دن روتی ہوئی تشریف لائیں اور فرمایا کہ یہ تم کو کیا ہوگیا تھا کہ تم نماز بھی پوری نہیں پڑھتے تھے، میں رو رو کر دن رات کی نماز میں دعا کرتی رہی، اور اب الحمدللہ یہ دیکھ کر تم پوری نماز پڑھنے لگے ہو جان میں جان آئی، دین کی حد تک روز اول ہی سے ان کی برکات کی ابتداء بقول الہ آباد کے عارف اکبر کے کہ ع

''دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا''

یہ نظر کہنا چاہئے کہ والدین کی بدولت دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی نصیب ہونا شروع ہوگئی، جب ولادت کا وقت قریب ہوا تو اپنے فرنگی محلی شیخ ومرشد کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت! گھر میں ولادت ہونے والی ہے، شیخ نے فرمایا انشاء اللہ لڑکا ہوگا، والد نے نام کے لیے عرض کیا تو فرمایا کہ خالق باری پوری کرلینا، اس طرح اس عبدالخالق زادہ کا نام عبدالباری ہوکر خالق باری پوری ہوئی، جب بسم اللہ کا وقت آیا تو والدہ مرحومہ جو خود بھی حضرت ممدوح ہی کی مریدہ تھیں مجھے لے کر خدمت میں حاضر ہوئیں، ساتھ کچھ مٹھائی بھی تھی، جو مرشد کے سامنے رکھ دی

اور مرشد نے مجھ کو اپنی گود میں لے بٹھا کر مٹھائی کی ایک ڈلی اپنے منہ میں ڈالی اور وہی آدھی کاٹ کر میرے منہ میں ڈال دی، پھر ستر کھ میں ایک بزرگ ابن بزرگ کے مکتب ہی میں بٹھایا، جو خود والد کے استاد بھی رہے تھے، اور سیرۃً وصورۃً ہر طرح ماشاء اللہ بزرگ ہی تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ والد مرحوم کو ہمیشہ مکتب کے زمانہ ہی سے اس کا اہتمام رہا کہ استاد صرف کتابی ہی نہ ہو بلکہ مرد صالح بھی ہو۔" (۱)

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ مولانا عبدالباری ندوی کے نشو ونما میں ان کے والد کے بنیادی کردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"مولانا (عبدالباری ندوی) کو دنیاوی نعمت و دین کی دولت وراثت میں ملی تھی، اور وہبی واکتسابی راستہ سے بھی عنایت ہوئی تھی، دیناوی دولت تو معلوم نہیں کب تک رہی اور کب کم ہوئی، ظاہر ہے تقسیم وراثت اور خاتمہ زمینداری کے بعد وہ بات نہیں رہی ہوگی جو ان کے بچپن یا عہد شباب میں تھی مگر اللہ نے اس کا نعم البدل ان کو بھرپور عطا فرمایا اور وہ زندگی بھر خوش حال اور معاشی لحاظ سے مطمئن ومسرور رہے، دینی احساسات کا جو تخم ان کے والدین نے ان کے دل ودماغ میں ڈالا تھا، وہ بہت بارآور ہوا، بڑھا، پھیلا اور ایک سایہ دار شجر پرثمر بن کر دنیا کے سامنے آیا۔" (۲)

گھریلو پس منظر اور والدین کے دینی مزاج ومذاق پر ان اقتباسات سے بخوبی روشنی پڑ جاتی ہے جو پیش کئے گئے، والدین کے خالص دینی مزاج ومذاق کو سمجھنے کے لیے

---

(۱) ماخوذ از: سرگذشت، از: مولانا عبدالباری ندوی (مشمولہ کتاب "مذہب وسائنس" ص/۹-۱۰)

(۲) نقوش سوانح حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ، (مشمولہ کتاب "تجدید دین کامل" از مولانا عبدالباری ندویؒ)

ایک واقعہ اور قابل ذکر ہے کہ جب مولانا عبدالباری ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں دینی تعلیم حاصل کر چکے اور والد ماجد کو لکھا کہ کچھ انگریزی پڑھنا چاہتا ہوں تو انھوں نے جواب دیا کہ میرے کرنے کا جو کام تھا وہ اللہ نے پورا کر دیا، اب اس کار خیر میں میں شریک نہیں ہو سکتا اور خرچ بند کر دیا۔

خالص دینی تعلیم دلانے کا یہ جذبہ انھیں فرنگی محل کے مشائخ سے ملا تھا جن کے دامن فیض سے وہ وابستہ تھے، بعد میں اسی فرنگی محل کے جلیل القدر عالم اور عظیم ملی قائد مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کی قیادت کی، اور جمعیۃ العلماء کی بنیاد ڈالی۔

مگر زمانہ کے تغیر پذیر حالات اور دشمنان اسلام کی اسلام کے خلاف علمی حملوں کہ جس کو سمجھنے کے لیے انگریزی کا پڑھنا ناگزیر تھا، والد صاحب نے انگریزی پڑھنے سے روکا نہیں مگر انھیں انفاق کے لیے یہ صحیح مصرف بھی نہیں لگا، چنانچہ مولانا شبلی نعمانی نے کہیں سے پاک آمدنی کے خرچ کا بندوبست کرایا، اور انھوں نے وہ لیاقت پیدا کر لی کہ اس کے ذریعہ دین اسلام کے لیے عظیم خدمات پیش کیں۔

حکیم عبدالخالق صاحب کو اصلاح باطن اور دینداری کے اچھے معیار پر قائم رہنے کی فکر مسلسل دامن گیر رہی اور وہ مشائخ وقت کی خدمت میں نیازمندانہ حاضری دیتے رہے جبکہ وہ اپنے شیخ اول کے مجاز وخلیفہ ہو چکے تھے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء) کے نام مولانا عبدالباری صاحب کے ایک مکتوب سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ان کے والد حکیم عبدالخالق صاحب نے حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کے وصال کے بعد حضرت حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے مکاتبت کے ذریعہ تعلق قائم کر لیا تھا جو آخر عمر تک جاری رہا، رحمهم الله تعالیٰ رحمة واسعة.

باب دوم

حالاتِ زندگی

ولادت اور نشو ونما

مولانا حکیم عبدالخالق کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، مولانا عبدالباری ندوی اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے، بھائیوں میں پہلے محمد شعیب تھے پھر مولانا سعدالدین ندوی ہوئے (۱)، ان کے علاوہ محمد طیب تھے، اور سب سے چھوٹے بھائی کا نام بھی محمد شعیب تھا۔

حضرت مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھنؤ سے متصل ضلع بارہ بنکی میں ۱۴ر ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۱ر اگست ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے، حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی (جو ان کے والد حکیم عبدالخالق صاحب کے شیخ ومرشد تھے) نے تحنیک کی سنت ادا فرمائی (۲)، مولانا عبدالباری کا بیان ہے:

---

(۱) مولانا سعدالدین ندوی حضرت مولانا عبدالباری ندوی سے چھوٹے اور ان کے بڑے چہیتے بھائی تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۱۹۱۱ء میں گیارہ سال کی عمر میں داخل ہوئے، اور ۱۹۲۰ء میں فراغت حاصل کی، اس کے بعد جامع ازہر مصر جاکر حصول علم میں مزید محنت وتحقیق سے کام لیا، وہاں سے واپس ہوئے تو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے وابستہ ہوگئے، اور اس کو ترقی دینے میں انتھک کوشش کی اور قربانیاں دیں، فاقہ تک کی نوبت آجاتی تھی، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (شیخ الجامعہ وصدر جمہوریہ ہند) کے دست راست تھے، بڑی صلاحیت اور اعلیٰ استعداد کے حامل تھے، اپنی والدہ سے انھیں اس قدر تعلق تھا کہ سفر حج میں کعبہ مشرفہ کا پردہ پکڑ کر دعا کی "بارالہا! میری والدہ کا سایہ ہمیشہ مجھ پر قائم رکھ۔" ان کی یہ دعا اللہ نے پوری کی اور وہ اپنی والدہ کی حیات میں ہی انتقال کر گئے، ان کے انتقال سے مولانا عبدالباری ندوی کو بڑا صدمہ پہنچا، حافظ احمد الباری صاحب کہتے ہیں کہ "والد صاحب کو کسی کے انتقال پر میں نے ایسا روتے نہیں دیکھا جیسا ان کے انتقال پر یا پھر مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (ناظم ندوۃ العلماء) کے انتقال پر دیکھا۔

(۲) تحنیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، حدیث سے ثابت ہے، یہ سنت کھجور سے ادا کی جاتی ہے، وہ میسر نہ ہو تو کوئی بھی میٹھی چیز سہی، کوئی بزرگ اللہ والا کرے تو بہت بہتر، ورنہ کوئی بھی اللہ کا نام لے کر اس سنت کی ادائیگی کردے، برکتیں حاصل ہوں گی انشاء اللہ۔

''مرشد نے مجھ کو اپنی گود میں بٹھا کر مٹھائی کی ایک ڈلی اپنے منہ میں ڈالی اور وہی آدھی کاٹ کر میرے منہ میں ڈال دی، پھر سترکھ میں ایک بزرگ ابن بزرگ کے مکتب میں ہی بٹھایا، جو خود والد کے استاد بھی رہے تھے، اور سیرۃ وصورۃ ہر طرح ماشاء اللہ بزرگ ہی تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ والد مرحوم کو ہمیشہ مکتب کے زمانہ ہی سے اس کا اہتمام رہا کہ استاد صرف کتابی ہی نہ ہو بلکہ مرد صالح بھی ہو۔''(۱)

مولانا ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ لکھتے ہیں:

''میٹھی ضلع لکھنؤ ان کا آبائی وطن تھا، کچھ اہل خاندان سترکھ میں بھی آباد ہو گئے تھے، ان کے والد کے بڑے بھائی حکیم امجد علی صاحب اس جوار کے مشہور طبیب تھے، ان کے اثر سے مولانا کے والد حکیم عبدالخالق صاحب گدیہ ضلع بارہ بنکی میں طبیب ریاست مقرر ہو گئے، وہیں ۱۸۸۹ء میں مولانا پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مولانا محمد ادریس نگرامیؒ سے حاصل کی، پھر ۱۹۰۲ء میں ندوہ میں داخل ہوئے، علامہ سید سلیمان ندویؒ اس سے ایک سال قبل ندوہ آ چکے تھے، جلد ہی دونوں کے درمیان دوستی ہو گئی، بساط شبلی کی حاشیہ نشینی نے اس دوستی میں اور پختگی پیدا کی، اور زندگی بھر مخلصانہ روابط قائم رہے۔''(۲)

حضرت مولانا محمد ادریس نگرامی کی خدمت میں

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم وتربیت کے لیے داخل کیے گئے مگر کچھ

---

(۱) ماخوذ از: سرگذشت، از: مولانا عبدالباری ندوی (مشمولہ کتاب ''مذہب وسائنس'' ص/۹-۱۰)

(۲) معارف لکھنؤ (مارچ ۱۹۷۶ء)

وقت گذرنے کے بعد لکھنؤ کے قصبہ نگرام منتقل کر دیئے گئے، جہاں مولانا محمد ادریس نگرامیؒ مسند درس وارشاد سنبھالے ہوئے تھے، یہاں مولانا کو جو علمی، دینی فائدہ ہوا اس کو خود مولانا کی زبانی سنئے:

"میں نگرام میں غالباً ایک سال سے بھی کم رہا، مگر بقول اکبر الہ آبادی:

ع دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

مجھ کو ان (مولانا محمد ادریس نگرامیؒ) کی خدمت میں حاضری سے نہ صرف دینی فائدہ ہوا بلکہ علمی استعداد بھی الحمدللہ اتنی درست ہوگئی کہ جب ندوہ سے گیا تھا تو دوسطر بھی صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتا تھا، جب دوبارہ مولانا شبلی کے زمانہ میں ندوہ میں داخل کرایا گیا تو میری استعداد اتنی بہتر ہو چکی تھی کہ جس درجہ کو میں ندوہ سے چھوڑ کر گیا تھا اس سے اوپر والے درجہ میں داخل کرنے پر مہتمم صاحب واساتذہ حضرات سب بخوشی آمادہ تھے۔" (۱)

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں

ندوۃ العلماء کا ایک تحریک کی شکل میں ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۳ء) کو آغاز ہوا، اور اس تحریک کے ناظم حضرت مولانا سید محمد علی کانپوری ثم مونگیری مقرر ہوئے، پھر اس کے پانچ سال بعد ۱۳۱۶ھ میں اس کے تعلیمی ادارہ دارالعلوم کا افتتاح ہوا، جس میں شیخ زمانہ حضرت مولانا عین القضاۃ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی شرکت فرمائی تھی، اور امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ بھی شریک تھے، اور وہ شروع کے ان چار مدرسین میں تھے جن سے دارالعلوم کا تدریسی عمل شروع ہوا، اس وقت حضرت مولانا عبدالباری کی عمر دس سال تھی، کچھ عرصہ بعد ان کا دارالعلوم میں داخلہ ہوا، دارالعلوم

---

(۱) بزم اشرف کے چراغ، از: پروفیسر احمد سعید، ص/۱۷۱ مطبوعہ مصباح اکیڈمی جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ لاہور۔

اس وقت شہر لکھنؤ کے قلب میں واقع خاتون منزل گولہ گنج میں تھا، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اوپری درجات میں تھے اور ان کی جماعت دارالعلوم کی جماعت اول تھی، مولانا عبدالباری ندوی کچھ درجات پیچھے تھے، استاذ الہند علامہ شبلی نعمانی کا غلغلہ تھا، وہ ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم تھے، اس طور پر دارالعلوم کے سرپرست وہی تھے، اور طلبہ کے اتالیق بھی، طلبہ ان کے ایسے گرویدہ تھے کہ ان کے اشارے ان کے لیے حکم کا درجہ رکھتے تھے، طلبہ میں لکھنے بولنے کا جوہر پیدا کرنا، ان کے ذہن کو آفاقی بنانا، ان کی دینی وعلمی خدمات کے دائرہ کو بین الاقوامی کرنا ان کی کوشش ہوتی تھی، علامہ شبلی کی طلبہ پر ایسی چھاپ تھی کہ ان کا مذاق ورجحان طلبہ کا مذاق ورجحان ہوتا، مولانا عبدالباری ندوی خود رقم طراز ہیں:

> ''اس دور میں مولانا شبلی کا مذاق طلبہ میں اس درجہ رچ بس گیا تھا کہ ہر طالب علم کچھ نہ کچھ تقریر وتحریر اور تصنیف وتالیف کی طرف مائل ہوگیا تھا، حد یہ ہے کہ ایک صاحب نخاس سے ایک پرانی میز اور کرسی خرید کر لائے اور علامہ شبلی کی طرح اس میز اور کرسی پر بیٹھ کر مضمون نگاری کی کچھ مشق شروع کردی۔'' (۱)

فلسفہ جدید اور انگریزی میں مہارت کا شوق

مولانا عبدالباری ندوی دارالعلوم میں عربی اور دینیات کی تکمیل کے بعد انگریزی کی تحصیل میں لگے جس کی ایک بڑی وجہ فلسفہ جدید میں مہارت پیدا کر کے اس کا رد کرنا بھی تھا، انہیں معقولات سے دلچسپی یوں بڑھی کہ حیدرآباد (دکن) سے علوم معقولات کے ماہر استاد مولانا شیر علی کو علامہ شبلی نعمانی نے ندوہ بلایا، اور انگریزی کے لیے قاضی تلمذ حسین کو رکھا، ان دونوں استادوں سے مولانا عبدالباری ندوی

(۱) بزم اشرف کے چراغ، بحوالہ سابق ص/۲۷۲۔

صاحب کا مضبوط ربط پیدا ہو گیا، اور پورے ذوق وشوق سے وہ ان سے ان علوم کو سیکھنے لگے، ان کے اس میں انہماک کو ان کے والد حکیم عبدالخالق صاحب نے ناپسند کیا اور ان کو بھیجی جانے والی رقم روک دی، جب یہ بات علامہ شبلی کے علم میں آئی تو انھوں نے پندرہ روپئے ماہوار کا وظیفہ ایک دوسری جانب جاری کرایا، مولانا عبدالباری ندوی مزید تعلیم حاصل کرنے پھر کشمیر بھی گئے، علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی یہ فکر ولگن بڑی پسند تھی، اور وہ اس سلسلہ میں ان کی ہر طرح سے ہمت افزائی کرتے اور تعاون فراہم کرتے، ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: ''خدا تمہارے عزم وارادہ میں استقلال و برکت دے۔''(۱)

اسی طرح ۴ رنومبر ۱۹۱۳ء کے ایک خط میں جو مولانا مسعود علی ندوی کے نام ہے مولانا عبدالباری ندوی کا بعض خدمات کے لیے خصوصیت سے نام لیا ہے اور جو خطوط مولانا عبدالباری کو لکھے ہیں ان سے جو تعلق خاطر ظاہر ہوتا ہے یہ ان کی لیاقت و استعداد کی ہی بنا پر ہے جو انھوں نے بہت کم مدت میں پیدا کر لی تھی، فلسفہ جدید اور انگریزی کی تعلیم کے سلسلہ میں ان کی تحریر کردہ روداد اس طرح ہے:

> ''میرا مذاق یا طبیعت کا رجحان منقولات سے زیادہ معقولات کی طرف تھا، ادھر علامہ شبلی اپنے زمانہ کے ایک جید عالم معقولات مولانا شیر علی صاحب کو حیدرآباد سے ندوہ لا چکے تھے اور نصاب میں کافی تبدیلیاں ہو چکی تھیں، مولانا شیر علی کی بدولت میرا یہ رجحان اور ذوق بہت بڑھ گیا، نیز علامہ کے زمانہ میں مصر کے عربی رسائل واخبارات بھی زیادہ آنے لگے تھے، ان میں ایک رسالہ ''المقتطف'' کے نام سے آتا تھا، جو کسی عیسائی کے زیر

---

(۱) مکاتیب شبلی ص/۱۵۶

ادارت نکلتا تھا، اور اس میں زیادہ تر جدید فلسفہ اور سائنس کے مضامین ہوتے، مجھ کو اس رسالہ سے بہت زیادہ دلچسپی تھی، بلکہ وہی میرے اس ارادہ کا باعث ہوگیا کہ خود انگریزی پڑھ کر جدید عقلیات سے واقفیت حاصل کرلوں، مگر والد صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی تو انھوں نے سرے ہی سے انگریزی تعلیم کے لیے خرچ دینے سے انکار کردیا، مگر علامہ نے ندوہ میں تو اولاً ایک طرف تین چار اساتذہ پر مشتمل انگریزی کا مستقل شعبہ کھول دیا تھا، جس کے ہیڈ ماسٹر اس زمانہ میں قاضی تلمذ حسین صاحب اور ماسٹر دین محمد صاحب کو ہدایت فرمادی کہ دونوں مجھ کو ایک ایک سبق انگریزی کا پڑھا دیا کریں، اسی دوران میں مولانا عبدالماجد دریابادی سے تعلقات کا آغاز ہوا، وہ اس زمانہ میں جدید فلسفہ کے طالب علم تھے، اور نفسیات کی ایک کتاب کا سبق میں ان سے پڑھا کرتا تھا، اب مجھے جدید فلسفہ سے اتنی مناسبت ہوگئی تھی کہ معمولی کتابوں کا لغت کی مدد سے خود مطالعہ کرلیتا تھا۔ والد صاحب کی طرف سے خرچ بند ہونے کی تلافی علامہ نے اس طرح فرمائی کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری آفتاب احمد صاحب کو ایک خط لکھ کر کانفرنس کی طرف سے پندرہ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کرادیا، لیکن میں چاہتا تھا کہ علی گڑھ میں فلسفہ کے لکچروں میں شریک ہوجاؤں اور کچھ استفادہ کروں لیکن اس زمانہ کے انگریز پرنسپل نے سکریٹری کالج نواب وقار الملک مرحوم کی سفارش کے باوجود اجازت دینی پسند نہ کی، تاہم پندرہ

روپیہ کے ماہوار وظیفہ نے مجھ کو اب مصارف کی طرف سے بالکل مطمئن کر دیا تھا، اس لیے پرائیویٹ امتحان دینے کا ارادہ کیا، جس کو اس زمانہ میں انٹرینس کہا جاتا تھا، اور جس کے بعد کالج میں داخلہ ملتا تھا، اسی زمانہ میں گدیا جہاں میرے والد صاحب کا مستقل قیام اور مطب تھا اس کے تعلقدار شیخ مقبول حسین قدوائی کشمیر کے وزیر مال ہو کر گئے، ان کو میں نے لکھا کہ:

''والد صاحب نہ تو میرے لیے انگریزی پڑھنا پسند فرماتے ہیں نہ ہی خرچ میں شرکت، لیکن خرچ کا انتظام تو علامہ شبلی کی شفقت سے پندرہ روپیہ ماہوار وظیفہ کی شکل میں ہو گیا ہے، آپ کشمیر میں ماشاء اللہ وزیر ہیں، یقیناً آپ کا مکان بہت وسیع ہوگا، بس اسی کے کسی گوشہ میں اگر مجھ کو قیام کی اجازت ہو جائے تو میں وہاں کی آب وہوا اور یکسوئی سے فائدہ اٹھا کر انگریزی کے انٹرینس کا امتحان پرائیویٹ طور پر دینا چاہتا ہوں تا کہ کالج کی تعلیم کا راستہ میرے لیے کھل جائے۔''

انھوں نے بڑی شفقت سے جواب میں لکھا کہ ''رہو گے میرے ساتھ اور کھاؤ گے اپنا، بے تکلف آجاؤ اور عزیزوں کی طرح رہو۔''

چونکہ مجھ کو ریاضی سے بالکل مناسبت نہ تھی، اس لیے امتحان میں تو شریک ہو گیا لیکن ریاضی میں فیل ہو گیا، پھر وطن واپس آ گیا، یہاں پرائیویٹ امتحان دینے کی صرف یہ صورت تھی کہ اسکول میں کم از کم ایک سال ملازمت کی ہو، حسن اتفاق سے اس زمانہ میں فیض آباد میں انسپکٹر آف اسکولز عبدالعزیز صاحب علامہ کے

علی گڑھ کے شاگردوں میں سے تھے، ان کو ممدوح نے ایک خط لکھ کر ملنے کی ہدایت فرمائی انھوں نے اپنے استاد کا خط پڑھتے ہی کچھ جواب دینے کے بجائے دفتر سے ایک خط سلطان پور ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو لکھ دیا کہ آپ کے یہاں مولوی کی جگہ خالی ہے اس پر حامل ہذا کا تقرر کیا جاتا ہے، وہاں امتحان کی تیاری میں مزید سہولت یہ ہوئی کہ وہاں ریاضی وغیرہ کے جو اساتذہ تھے ان سے برابر مدد ملتی رہی، اس وقت علامہ اپنے وطن اعظم گڑھ میں ایک تو ''سیرۃ النبی'' کی تصنیف میں مشغول تھے، دوسری طرف دارالمصنفین کی بنیاد رکھنے میں مصروف تھے،(۱) میں اسی دوران سلطان پور سے ایک مرتبہ حضرت استاذ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دو تین دن اپنا ہی مہمان رکھا، اور ذکر و فکر ہمہ وقت ''سیرۃ النبی'' کی تکمیل اور دارالمصنفین کی تاسیس کی تھی، وہاں سے سلطان پور واپسی پر ابھی میرا امتحان میں شریک ہونے کا وقت بھی نہ آیا تھا کہ حضرت علامہ کا آخری وقت آ گیا۔''(۲)

استاذ الاساتذہ علامہ شبلی نعمانی کی وفات

علامہ شبلی نعمانی کی وفات کا واقعہ کسی بڑے حادثہ سے کم نہیں تھا، یہ صاعقہ اثر خبر ان کے تلامذہ و متعلقین پر بجلی بن کر گری، ساتھ ہی ملت کے سبھی بہی خواہوں پر اس کا غیر معمولی اثر پڑا، اللہ تعالیٰ نے علامہ کو دین وملت کی خدمت اور علم و تحقیق کے

---

(۱) علامہ شبلی کے مکتوبات سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ان کی خواہش دارالمصنفین کی تاسیس کے لیے ندوہ کا ماحول اور لکھنؤ کی فضا تھی۔

(۲) بزم اشرف کے چراغ ص/۲۷۴

میدان کی جو غیر معمولی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں، وہ بہت کم لوگوں میں جمع ہو پائی ہیں، مولانا عبدالباری ندوی کے لیے یہ حادثہ وفات کسی بڑے خاندانی سانحہ سے کم نہ تھا، رحمه الله تعالیٰ رحمة واسعة.

دکن کالج پونا میں

علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی آخری تمنا اور آرزو سیرۃ النبی کی تصنیف کی تکمیل رہ گئی تھی، وہ اپنی صحت کے انحطاط اور معذوریوں کو دیکھ کر یہ محسوس کر رہے تھے کہ مصنف اپنی تصنیف کو پایہ تکمیل کو نہ پہنچا سکے گا، اس کی تکمیل کے لیے ان کی نظر اپنے دو عزیز ترین اور لائق وفائق شاگردوں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا حمید الدین فراہی پر گئی، اور گویا اس کے لیے وصیت بھی فرمادی، ان دنوں مولانا سید سلیمان ندوی دکن کالج پونا میں جو اس وقت ہندوستان کا نامور اور ممتاز تعلیمی ادارہ تھا علمی وادبی خدمات انجام دے رہے تھے، اور ایک اچھے مشاہرہ پر تھے، اور اپنے علم وفضل کی وجہ سے بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، وہ ''سیرۃ النبی'' کی تکمیل کے مبارک ترین کام میں شمولیت اور استاذ محسن کی خواہش کی تکمیل میں جاہ ومال کی عظیم قربانی دے کر دارالمصنفین اعظم گڑھ قلیل مشاہرہ پر آ گئے، مگر صدر شعبہ پروفیسر شیخ عبدالقادر کے سامنے مولانا عبدالباری ندوی کا نام پیش کر گئے جو بلا کسی تردد کے منظور ہو گیا، مولانا عبدالباری ندوی کے الفاظ ہیں:

> ''حضرت علامہ کے بعد جب سید صاحب کو تکمیل ''سیرت'' کے لیے اعظم گڑھ میں مستقلاً قیام پذیر ہونا پڑا تو دکن کالج میں انھوں نے اپنی جگہ کے لیے میرا نام پیش کیا اور صدر شعبہ پروفیسر شیخ عبدالقادر نے اپنی صدارت کا پورا زور ڈال کر فارسی کے کئی ایم. اے. لوگوں کی درخواستوں کے مقابلہ میں پرنسپل

ایف. ڈبلیو. بین سے جو موصوف پر بہت اعتماد کرتا تھا میرے ہی لیے منظوری حاصل کروالی، اور ضابطہ کی منظوری کی اطلاع بھی لکھنؤ میرے پاس آگئی، اور اس طرح انٹرینس کا امتحان دیئے بغیر دکن کالج جیسے بمبئی کے مشہور کالج میں شعبہ فارسی کا مدرگار لیکچرار بن گیا۔'' (۱)

پروفیسر سر عبدالقادر اور پرنسپل بین کا اعتماد

مولانا عبدالباری ندوی لکھنے پڑھنے کے کام میں یکسوئی کے تعلق سے ڈاکٹر سر عبدالقادر کی شفقتوں اور عنایات کے بڑے معترف نظر آتے ہیں، انھوں نے اپنے تئیں ان کے احسانات کو پوری فراخ دلی سے بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

'' لکھنے پڑھنے کا سب سے پہلا اور بڑا موقع مجھ کو وہیں ملا، اور اس میں سب سے زیادہ صدر شعبہ فارسی شیخ عبدالقادر اور پرنسپل ایف. ڈبلیو. بین کی خاص عنایات کو دخل رہا ہے، پروفیسر عبدالقادر کی شرافت اور عنایت کی انتہا یہ تھی کہ صدر شعبہ ہونے کے باوجود تعلیمی سال شروع ہونے پر وہ خود میرے گھر پر تشریف لاتے اور فرماتے میرے سپرد آپ کیا کام کرتے ہیں، اور ایف. ڈبلیو. بین پرنسپل کا بھی ایک واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مجھ کو بمبئی جانے کی ضرورت ہوئی تو اس کے دفتر گیا، اور کہا کہ مجھے دو دن کی اتفاقی رخصت چاہئے تو اس نے کہا ''میں کیا کروں'' اور پھر کرسی کی طرف اشارہ کیا بیٹھ جایئے، میں بیٹھ گیا تو کہا دیکھئے، میں اپنے رفقاء کے متعلق سب سے پہلے تو اس بات کا اطمینان

(۱) بزم اشرف کے چراغ ص/۱۷۴

کر لیتا ہوں کہ وہ اپنا کام اہلیت اور دیانت سے کر رہے ہیں، باقی دفتریت سے میں بہت گھبراتا ہوں، میں نے عرض کیا کہ پھر ضرورت ہو تو رخصت کے لیے کس کے پاس جایا کروں، کہا کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں، بس نوٹس بورڈ پر ایک نوٹس لگا دیا کیجئے کہ فلاں فلاں دن یا فلاں وقت میرا لکچر نہیں ہوگا کہ طالب علموں کو پریشانی نہ ہو۔'' (۱)

کچھ آزمائشیں اور گجرات کالج احمد آباد تبادلہ

دکن کالج پونا میں مولانا عبدالباری ندوی کو جو عزت، مقام، شہرت اور اعتماد ملا اس کی وجہ سے ان کے متعلق حاسدین کی سرگرمیاں بھی تیز ہوئیں، جس کے لیے نئے نئے حربے اختیار کئے جانے لگے، مولانا جس ہنرمندی اور لیاقت وصلاحیت سے اپنے فرائض تدریس میں قوت صرف کر رہے تھے اس کا اندازہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس اعتراف سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب ''پرانے چراغ'' حصہ دوم ص/ ۱۷۷ میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالباری ندوی اس حقیقت کا ایک زندہ ثبوت تھے کہ کامیابی اور ترقی کے لیے اصل شے ذاتی قابلیت، خداداد ذہانت اور اپنی محنت ہے، ان کے پاس ندوہ کے سوا کوئی سند نہ تھی، انگریزی بھی انھوں نے بطور خود اور بقدر ضرورت سیکھی تھی، لیکن اپنی ذہانت اور قابلیت کے زور پر دکن کالج پونا میں جو اس وقت نہ صرف جنوبی ہند میں بلکہ ہندوستان میں بڑا نام اور مقام رکھتا تھا، ان کا فارسی کے لکچرار کی حیثیت سے تقرر ہوا، اور انھوں نے

---

(۱) بزم اشرف کے چراغ ص/ ۱۷۴

بجائے فارسی یا اردو کے کلاس میں انگریزی میں لکچر دینا شروع کیا، وہ ''دیوان حافظ'' جیسی بلند اور پراز تلمیحات ورموز کتاب کو انگریزی میں حل کر کے طلبہ کے سامنے پیش کرتے، ان کا یہ تجربہ بی.اے. میں بھی کامیاب رہا، اور طلبہ ہر طرح سے مطمئن ہوئے، اور کالج کے ایک ذہین طالب علم نے ایک دن بڑے جوش واعتماد کے ساتھ کہا کہ ''اگر مولوی صاحب رہ گئے تو بمبئی پرسیڈینسی میں ان سے بہتر کوئی استاذ نہ ہوگا۔''

دکن کالج پونا میں پرنسپل بین اور سر عبدالقادر جب تک رہے مولانا عبدالباری ندوی کا کوئی بال بیکا نہ کرسکا، لیکن ان کے بعد جو لوگ ذمہ دار ہوئے انھوں نے ان کی حیثیت ومقام کو متاثر کرنا چاہا، مولانا عبدالباری ندوی اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

''پروفیسر شیخ عبدالقادر کے بعد ہوم جی نامی ایک پارسی صدر شعبہ مقرر ہوا، اس کے ایک دوست ڈپٹی باقر علی میرے بھی بہت عنایت فرما تھے، ایک دن انھوں نے ہوم جی کی یہ خواہش پیش کی کہ وہ مجھ سے عربی پڑھنا چاہتے ہیں، میں نے کہا بڑی خوشی سے پڑھیں، کچھ دنوں کے بعد انھوں نے یاددہانی کروائی کہ ہوم جی منتظر ہیں، میں نے کہا کاہے کے منتظر ہیں، کہا کہ ان کی خواہش یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ ان کے گھر جاکر پڑھائیں، میں نے کہا ضابطہ کا جواب تو یہ ہے کہ میں کالج کا ملازم ہوں ان کا نجی نہیں، اور تہذیب کی بنیاد استاد کے ادب پر ہے، اس لیے وہ کوئی وقت مقرر فرما کر آسکتے ہیں، میں تو

حاضری کو نہ ان کے لیے مناسب سمجھتا ہوں نہ اپنے لیے، بس قصہ ختم، پھر جب تک وہ صدر شعبہ رہا، میری پرزور مخالفت کرتا رہا، کہ مجھ کو علاحدہ کردیا جائے، پرنسپل بین کی دوسری شرافت بھی سن لیجئے کہ جب اس کے ریٹائر ہونے کا وقت آگیا تو ایک دن اس نے اپنے دفتر مجھے بلایا اور میز کی دراز میں سے ایک موٹی گڈی پرچوں اور کاغذات کی نکالی اور کہا کہ ہوم جی کی طرف سے یہ سب آپ کی شکایات ہیں، اور صرف میں درمیان میں حائل تھا، ورنہ ہوم جی اتنے دن تک آپ کو ہرگز نہ رہنے دیتے، کیونکہ میں نے اطمینان کرلیا تھا کہ آپ اپنے فرائض پوری دیانت اور اہلیت سے انجام دیتے ہیں، لیکن میرے بعد آپ یہاں رہنے نہ پائیں گے، اور یہی ہوا کہ ہفتہ عشرہ کے اندر ہی میرا تبادلہ گجرات کالج احمد آباد کردیا گیا۔''(۱)

مولانا عبدالباری ندوی آگے لکھتے ہیں:

''ایک دن میں حسب معمول لیکچر دے رہا تھا کہ چپراسی نے ایک لفافہ لاکر دیا، کھول کر پڑھا تو الزامات کی ایک لمبی فہرست تھی، جس میں سرفہرست یہ تھا کہ "He is implicated in Khilafat propagandda" یہ بھی خیال تھا کہ وہاں کا پرنسپل بین نہیں بلکہ ایک مشنری تھا اس نے پوچھا کہ سید سلیمان سے آپ کے کیا تعلقات ہیں، میں نے کہا سالہا سال تو میرے وہ طالب علمی کے ساتھی رہ چکے ہیں، پھر استاذ مقرر ہوکر میرے

---

(۱) بزم اشرف کے چراغ ص/۲۷۵

استاد بھی رہے، کہنے لگا وہ تو خلافت وفد میں جارہے ہیں، میں نے کہا اس کو میں کیا کروں، جواب دیا کہ گورنمنٹ ایسے لوگوں سے سرکاری ملازمتوں کا تعلق پسند نہیں کرتی، اس لیے یہ ایک ماہ کا نوٹس ہے، یا آپ ایسے لوگوں سے باز رہنے کا یقین دلائیے یا اپنے کو معطل سمجھئے، میں نے کہا کہ مجھ کو ایک ماہ کے نوٹس کی ضرورت نہیں، میں اسی وقت اجازت چاہتا ہوں اور یہ کہہ کر اس کمرہ سے نکل آیا اور پھر وہاں سے سیدھا وطن واپس آیا، اور گو میں ایک متوسط الحال گھرانہ کا تھا، تاہم الحمدللہ نوکری سے مجھے اتنی بیزاری تھی کہ مجھے اس کے چھوڑنے کے بعد ایسا بھی معلوم نہیں ہوا کہ ایک پیسہ بھی میری جیب سے گر گیا ہے، پھر کوئی سال بھر گھر ہی میں بیٹھا رہا، اس درمیان میں مسلسل سید سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط دارالمصنفین سے آتے رہے کہ بس اب دارالمصنفین چلے آؤ، یہاں نہ کوئی ملازمت ہے نہ افسری نہ ماتحتی۔''(۱)

گجرات کالج احمد آباد کا قیام اور ''مذہب وعقلیات'' کتاب کی تصنیف

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ لکھتے ہیں:

''دکن کالج کے بعد وہ عرصہ تک گجرات کالج احمد آباد میں رہے، وہیں انھوں نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں

(۱) بزم اشرف کے چراغ ص ۲۷۵-۲۷۶

شیروانی کے ایماء پر ''مذہب وعقلیات'' کے موضوع پر زبانی لیکچر دیا، جو بعد میں کانفرنس کی طرف سے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا، فلسفہ ان کے خاص ذوق کا مضمون تھا، ندوہ کی طالب علمی میں وہاں کے جید اساتذہ سے جن میں مولانا سید شیر علی صاحب حیدرآبادی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، انھوں نے فلسفہ قدیم کی اعلیٰ کتابیں دلچسپی اور محنت سے پڑھی تھیں، اور درسیات کے حدود سے قدم باہر نکال کر اس موضوع پر وسیع مطالعہ کیا تھا، پھر مولانا شبلی کی صحبت میں ان کو فلسفہ جدید اور علم کلام کا شوق پیدا ہوا، اور انھوں نے انگریزی میں اتنی استعداد بہم پہنچا کر کہ وہ فلسفہ کی کتابوں کا باطمینان مطالعہ کر سکیں، اس کا غائر نظر سے مطالعہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ذہن رسا اور نکتہ شناس بنایا تھا، انھوں نے بہت جلد مغز کی بات پالی اور جن نتائج تک لوگ بڑی غواصی اور شناوری کے بعد پہنچتے ہیں، اپنی سلامت طبع اور خدا کی رہنمائی سے وہ ان نتائج تک جلد پہنچ گئے اور انھوں نے فلسفہ وعقلیات کے حدود بہت جلد متعین کر لیے اور سائنس کا فرق بھی جو اس وقت تک اچھے اچھے پڑھے لکھوں پر پوشیدہ تھا، اور اس کی وجہ سے وہ اکثر خلط مبحث کرتے تھے ان پر جلد منکشف ہو گیا، یہ رسالہ ان کے مطالعہ کا نچوڑ اور ان کے ذہن کی صفائی اور درّاکی کا اعلیٰ نمونہ ہے، اس رسالہ کا ترجمہ عربی میں مولوی واضح رشید ندوی نے "الدین والعقل" کے نام سے کیا جو قاہرہ مصر سے شائع ہوا۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کر پڑھ کر برجستہ فرمایا کہ ''یہ مذہب کا آہنی قلعہ ہے'' اور جب ایک مرتبہ حیدرآباد میں بعض حلقوں میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ جامعہ عثمانیہ میں شعبہ فلسفہ کی صدارت ایک ایسے شخص کے سپرد ہوئی ہے جس کو فلسفہ کی کیا سرے سے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ سند بھی حاصل نہیں ہے، شیروانی صاحب سے جو یونیورسٹی کے چانسلر بھی تھے جواب طلب کیا تھا تو شیروانی صاحب نے حضور نظام کی خدمت میں یہی رسالہ ''مذہب وعقلیات'' اس تحریر کے ساتھ پیش کر دیا کہ ''ان کی سند یہ ہے کہ فلسفہ نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے،، جس کا اندازہ سرکار خود رسالہ ہذا کی چند سطروں کے ملاحظہ سے فرما سکتے ہیں''، اس جواب کے بعد استقلال کی کارروائی پر دستخط ہو گئے، راقم سطور نے جب اپنی محسن کتابوں پر مضمون لکھا تو اس کتاب کو بھی اپنی خاص محسن کتابوں میں شمار کیا اور اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

''مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالباری ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب ''مذہب وعقلیات'' پر نظر پڑی جس کو ذوق و ذہن نے پورے طور پر اپنا لیا، اس رسالہ سے عقل و نقل کے حدود اور تجربہ و علم انسانی کی نارسی و پائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ابتدائی تخیل حاصل ہوا، جو مطالعہ میں بہت کم آیا، اس کے بعد قدیم وجدید فلسفہ اور اس کی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا پڑھا، مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا، بلکہ جس قدر

پڑھا"إن هم إلا يخرصون" اور "كذبوا بما لم يحيطوا بعلمه ولما يأتهم تأويله" کی تفسیر وتوضیح ہی ہوتی رہی۔"(۱)

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (ہند) میں سب سے اہم نمایاں اور مرکزی ادارہ بلکہ مدرسہ تھا جو دارالعلوم کے نام سے قائم ہوا تھا، اس کو عربی، اردو، فارسی کے چنیدہ اور عظیم شخصیتوں کی خدمات روز اول سے حاصل رہیں، بعد میں مولانا حمیدالدین فراہی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے تخیل اور کوششوں سے اس کو یونیورسٹی کا درجہ ملا، نظام حیدرآباد نواب عثمان علی خاں اس کا خرچ اٹھاتے تھے، ان ہی کے نام سے موسوم ہوئی، مصنف "حیات گیلانی" "مفتی ظفیر الدین رقمطراز ہیں:

> "یہی دارالعلوم مولانا حمید الدین فراہی کی تحریک وتخیل اور بابائے اردو مولوی عبدالحق اور دوسرے لوگوں کی کوششوں سے عثمانیہ یونیورسٹی میں تبدیل ہوا، اگست ۱۹۱۹ء میں اس کی داغ بیل ڈالی گئی، نواب عثمان علی خاں والی حیدرآباد کے نام پر اس کا نام تجویز ہوا۔"(۲)

مولانا حمیدالدین فراہی دارالعلوم کے آخری پرنسپل تھے، انھیں اچھے باصلاحیت وباکمال افراد کی تلاش رہتی، جب مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا حیدرآباد آنا ہوا تو ان کی نگاہ دوررس نے انھیں تاڑ لیا، وہ ایک بار دارالعلوم دیوبند جانے کے بعد (جہاں وہ مدرس تھے) اپنے اساتذہ کا ایماء پاکر عثمانیہ یونیورسٹی آگئے، دوسری طرف نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی فکر وتوجہ نے اس کے

---

(۱) پرانے چراغ ۲/۱۱۷-۱۱۸۔

(۲) حیات گیلانی ص/۱۶۱۔

شعبہ دینیات وشعبہ السنہ مشرقیہ کو پروان چڑھانے میں کلیدی رول ادا کیا، انہیں اچھا اثر ورسوخ حاصل تھا، باکمال فضلاء کی خدمات لینے میں وہ پیچھے نہ رہتے، اور وہ لیاقت و استعداد کو سندات اور ڈگریوں پر ترجیح دیتے، اس کی کھلی مثال حضرت مولانا عبدالباری ندوی کی ہے، جنھیں صرف دارالعلوم ندوۃ العلماء کی سند حاصل تھی، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے ان کو اپنے ذاتی اعتماد کی بنا پر عثمانیہ یونیورسٹی بلالیا، اور شعبہ فلسفہ کی صدارت بھی سپرد کرادی، ان کی اہلیت کے لیے وہ آپ کی کتاب ''مذہب وعقلیات'' کو کافی سمجھتے تھے، اسی کتاب کی بناء پر صدرالصدور مملکت آصفیہ (حیدرآباد) نے دوسو روپئے کا دوسال کے لیے مشاہرہ مقرر کیا کہ وہ جدید علم کلام پر مستقل کتاب لکھنا چاہتے ہیں، اس کی تکمیل کریں، مولانا عبدالباری ندوی لکھتے ہیں:

> ''مجھ کو ابھی غالباً حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی پہنچے چھ ماہ بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ دوسو روپئے نقد النقد کے ساتھ صدرالصدور مملکت آصفیہ کے دستخط سے ایک مراسلہ اس مضمون کا ملتا ہے کہ ''مذہب وعقلیات'' کے لکچر کے سلسلہ میں اور اس کے بعد جدید علم کلام پر جو ایک مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا اس کی تکمیل کے لیے سردست دوسو روپیہ ماہوار دو سال کے لیے منظور کئے جاتے ہیں، امید ہے کہ کام شروع کردیں گے، باقی اگر تکمیل کے لیے مزید توسیع درکار ہوئی تو اس کا بھی انتظام ہوجائے گا۔'' یہ مراسلہ عین اس حال میں ملا کہ میں دمہ کے شدید دوروں سے بالکل فریش تھا، اور خود شیروانی صاحب ممدوح اپنی بزرگانہ شفقت کی بنا پر ہر دوسرے دن عصر

اور مغرب کے درمیان عیادت سے مشرف فرماتے۔"

مولانا عبدالباری ندوی کا ان حالات میں یونیورسٹی میں لکچر دینا دشوار ہو رہا تھا، چہ جائیکہ وہ زائد ذمہ داری قبول کرتے، آخر وہ چھٹی لے کر لکھنؤ آ گئے، اسی دوران حضور نظام حیدرآباد کو یہ بات پہنچائی گئی کہ ان کا تقرر ضابطہ کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے، "شیروانی صاحب نے فلسفہ کا صدر ایسے کو بنوا دیا ہے جس کو فلسفہ کی کیا سرے سے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ سند بھی حاصل نہیں" اس پر حضور نظام حیدرآباد نے جب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی سے جواب طلب کیا تو انھوں نے ان کی "مذہب وعقلیات" والی کتاب کے ساتھ ایک خط منسلک کیا جس میں یہ لکھا کہ "ان کی سند یہ ہے کہ فلسفہ نے ان کے ہاتھ سے اسلام قبول کیا ہے۔" اس پر حضور نظام حیدرآباد نے ان کو مستقل کر دیا۔"(۱)

مولانا عبدالباری ندوی نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی ایک شفقت یہ بھی لکھی ہے کہ وہ اس رقم کو اس خیال سے مولانا عبدالباری کے لیے اپنی دستخط سے وصول کرتے رہے کہ شاید یہ کسی وقت کام کو آگے بڑھائیں گے، مگر چونکہ وہ اس سلسلہ میں کام آگے نہ بڑھا سکتے تھے، اس لیے وہ رقم کل کی کل واپس کر دی۔

مولانا عبدالباری ندوی حیدرآباد میں جس نیک نامی و بلند مقامی کے ساتھ رہے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں امتیازی شان برقرار رکھے رہے، اس کا مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب "مذہب وسائنس" مضمون: اپنی کہانی اپنی زبانی، از مولانا عبدالباری ندوی۔

''مولانا عبدالباری ندوی نے جامعہ عثمانیہ میں جو اپنے ماہر فن اساتذہ اور نامور فضلاء کی بدولت اس عہد میں اس پورے تحتی براعظم میں بلند مقام رکھتی تھی، اپنے فرائض منصبی نہ صرف کامیابی اور نیک نامی سے ادا کئے بلکہ علماء کی خودداری وخودشناسی اور ذہنی واخلاقی بلندی کا نقش بھی قائم کردیا، وہ خود اپنا لطیفہ سناتے تھے کہ ایک مرتبہ مسٹر میکنزی جو ڈائرکٹر آف ایجوکیشن تھے (اس سے پیشتر وہ یوپی میں ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن رہ چکے تھے اور میرے زمانہ تدریس میں دارالعلوم معائنہ کے لیے آئے تھے، بڑے طنطنہ اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے) جامعہ کے معائنہ کے لیے آئے، وہ ہر کلاس میں جاتے تھے اور استاذ کا لکچر سنتے تھے، مولانا عبدالباری صاحب نے ان کو اپنے کلاس کی طرف آتے دیکھا تو لڑکوں سے کہا کہ ''دروازہ بند کردو، میں ایک بار ندوہ کا امتحان دے چکا ہوں، بار بار امتحان نہیں دیتا۔'' وہ یہ دیکھ کر واپس چلے گئے۔''(۱)

ایک عارف کی خدمت میں

حضرت مولانا محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ دکن کے مشہور عارف اور بڑے بزرگوں اور مشائخ میں تھے، جن کی مجلسوں میں اچھے بڑے پڑھے لکھے لوگ حاضری کا التزام رکھتے تھے جن میں ایک نام علامہ سید مناظر احسن گیلانی کا بھی ہے، ان کے ساتھ حضرت مولانا عبدالباری ندوی بھی جانے کا اہتمام کرتے، اور صرف یہی نہیں کہ خود جاتے اور استفادہ کرتے، دوسروں کو بھی ترغیب دیتے، جس کی وجہ سے بعض

(۱) پرانے چراغ ۲/۱۱۹

اہم شخصیات نے ان کی زیارت کی اور بعض متعلق بھی ہوئے۔(۱)

مصنف ''حیات گیلانی''، مفتی ظفیر الدین مولانا محمد حسین کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے قالاً وحالاً ترجمان تھے۔''

اوران سے مولانا گیلانی کے تعلق کی بابت رقمطراز ہیں:

''مولانا گیلانی کو یہاں پہنچ کر مناسبت تامہ حاصل ہوگئی، اور شیخ کی توجہات خصوصی کے مرکز بن گئے، اور تھوڑے ہی عرصہ بعد یہاں سے بھی خلافت کی دولت سے نوازے گئے۔''(۲)

مولانا سید مناظر احسن گیلانی سے یگانگت

مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی میں جو علمی، فکری، ذوقی یگانگت اور مزاجی اتحاد تھا، وہ دوسروں پر مخفی نہیں رہ گئی تھی، بلکہ مولانا عبدالباری ندوی کے الفاظ میں کہ: ''وہ میرے ہم قیام وہم طعام ہی نہیں بلکہ دونوں کی رفاقت حیدرآباد میں ضرب المثل تھی۔''(۳)

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کے تعلق کے بارے میں جو لکھتے ہیں اس سے مولانا عبدالباری ندوی کے اس جملہ کی پوری وضاحت اور تشریح ہو جاتی ہے، وہ رقمطراز ہیں:

---

(۱) جن میں ایک اہم نام پروفیسر محمد الیاس برنی کا بھی ہے جو ان کے مرید اور پھر مجاز وخلیفہ بھی ہوئے، اور ان کے ملفوظات وافادات کو جمع بھی کیا

(۲) حیات مولانا گیلانی ص/۲۵۱

(۳) تعمیر حیات (فروری ۱۹۷۶ء)

''مولانا حیدرآباد میں سیتا پھل منڈی میں جو جامعہ عثمانیہ سے قریب ہے، مقیم تھے، وہیں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی بھی تھے، اور جامعہ عثمانیہ کے ایک استاذ ڈاکٹر عثمان صاحب بھی، ان حضرات نے وہاں ایک مسجد تعمیر کروائی، شہر کے پَرلے سرے پر ہونے کی وجہ سے اس کا نام مولانا مناظر احسن صاحب نے ''المسجد الاقصیٰ'' رکھا، جس سے غالباً تاریخ بھی نکلتی ہے، میں ۱۹۴۶ء میں جب پہلی مرتبہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے ایماء پر والد ماجد کی تصنیف ''نزہۃ الخواطر'' کی طباعت کے سلسلہ میں حیدرآباد گیا، اور ڈاکٹر عثمان صاحب کے یہاں مقیم اور مولانا مناظر احسن صاحب کا مہمان ہوا تو مولانا عبدالباری صاحب وظیفہ سے سبکدوش ہو چکے تھے، افسوس ہے کہ میں اس ''قران السعدین'' کے منظر کو نہ دیکھ سکا جو دونوں فاضلوں اور ہم مذاق دوستوں کی یکجائی نے حیدرآباد میں پیدا کر دیا تھا، میں نے مولانا عبدالباری صاحب کا گھر بھی دیکھا، ابھی ان کا ذکر اور ان کی یاد اس ماحول میں تازہ تھی، اور ان کے شاگرد و شرکائے محفل مزے لے لے کر اس زمانہ کے واقعات سناتے تھے۔''(۱)

بیعت سلوک اور سفر حج (۱۹۲۸ء)

۱۹۲۸ء کا سال مولانا عبدالباری ندوی کے لیے بڑا مبارک ثابت ہوا، تلاش مرشد میں وہ اور ان کے دیرینہ رفیق مولانا عبدالماجد دریابادی پہلے سے سرگرداں اور فکرمند تھے، اس بار حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ان کو

(۱) پرانے چراغ ۲/۱۲۲۔

باریابی مل گئی، دیوبند ان کے قیام گاہ پر یہ لوگ پہنچ گئے، حضرت نے ان حضرات کی تکریم میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور خود سراپا تواضع بنے رہے، اور آخر میں خود ہی ان دونوں حضرات کو اپنے ساتھ لے کر تھانہ بھون گئے اور ان کو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہونے پر آمادہ کیا اور حضرت تھانوی کی خدمت میں اس کی گذارش بھی کر ڈالی مگر حضرت تھانوی کو ان حضرات کی حضرت مدنیؒ سے مناسبت کا اندازہ اور احساس تھا اس لیے اس بات پر وہ آمادہ نہ ہوئے اور پھر آخر حضرت مدنیؒ نے ان دونوں کو بیعت فرمایا، اس کے بعد حضرت مدنی سراپا تواضع ہی بنے رہے، مولانا عبدالماجد صاحب نے اپنی کتاب ''حکیم الامت نقوش وتأثرات'' میں اس کا پورا اعتراف کیا ہے، حافظ احمد البارری اپنے والد ماجد مولانا عبدالباری ندوی کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ:

''بیعت ہونے کے بعد حضرت مدنی کو دیکھا کہ آخر شب میں ہمارے پاؤں داب رہے ہیں کہ اٹھئے تہجد کا وقت ہوگیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ والد صاحب جب اس بات کا ذکر فرماتے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔''

وہ ایک دوسرا واقعہ بیان کرتے ہیں:

''اسی طرح حضرت مدنی کے ساتھ ٹرین پر ایک سفر میں تھے، باتھ روم گئے وہ گندا تھا، واپس آگئے، حضرت مدنی کو احساس ہوگیا، چند لمحے کے توقف کے بعد حضرت مدنی فوراً اٹھے اور جاکر باتھ روم کو صاف کیا پھر باہر تشریف لاکر فرمایا کہ جایئے فارغ ہوجایئے، صاف ہے۔''

حضرت مدنیؒ کے مشورے سے ان حضرات نے حضرت مولانا اشرف علی

تھانویؒ سے اصلاحی مکاتبت قائم کی، جس کے بعد یہ دونوں حضرت تھانوی کے گرویدہ ہوگئے، اور حضرت تھانویؒ کے علوم کی اشاعت کو اپنا وظیفہ بنالیا، مولانا عبدالباری ندوی کا حال یہ تھا کہ زندگی بھر حضرت تھانویؒ سے متعلق لکھتے لکھاتے رہے، اور خود حضرت تھانوی کا ان کے ساتھ ایسا شفقت کا برتاؤ تھا کہ خود مولانا عبدالباری ندوی فرماتے تھے کہ میرا کوئی خط ایسا نہیں ہے جو حضرت تھانوی نے ''النور'' (۱) میں شائع نہ فرمادیا ہو، اور فرماتے تھے کہ ہم نے حضرت تھانوی کو طویل طویل خط لکھے اور حضرت تھانوی کو لکھا کہ میں طویل طویل خط لکھتا ہوں حضرت کا بڑا وقت ضائع ہوتا ہوگا اور تکلیف ہوتی ہوگی، حضرت تھانوی نے فرمایا: ''محبوب کی زلف دراز سے بھی کسی کو تکلیف ہوتی ہے۔''

مولانا عبدالباری ندوی نے اپنے ان دونوں محسنوں و مربیوں کے تعلق کو بڑی خوبی کے ساتھ جمع کیا، جس طرح شروع میں حضرت مدنیؒ سے بڑی گرویدگی تھی آخر میں بھی یہ حال ہوگیا تھا کہ حضرت مدنی کا بہت تذکرہ فرمانے لگے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے یہ بات میں نے ذکر کی تو انھوں نے فرمایا: ''نسبت شیخ غالب آگئی۔'' (۲)

جہاں تک سفر حج کا تعلق ہے اس میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہم اللہ کا سہ آتشہ تھا، جذبات، احساسات، فکرورجحان اور تعلقات میں یہ تینوں حضرات ایک دوسرے کے قدم بہ قدم ہوتے، اپنی اپنی صلاحیتوں اور استعداد کے فرق کے ساتھ کبھی کوئی متبوع اور کبھی کوئی تابع ہوتا، سفر حجاز کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی رہا، ایک نے نیت وارادہ کیا، دوسرے نے بھی عزم کرلیا، تیسرے کو معلوم ہوا تو انھوں نے بھی اسی موقع کو غنیمت جانا کہ ہم مزاج، ہم

(۱) ''النور'' حضرت تھانوی کا رسالہ خانقاہ تھانہ بھون کا ترجمان

(۲) روایت جناب حافظ احمد الباری صاحب

فکر، ہم خیال اور ہم جذبات دوستوں کا قافلہ ہے، چنانچہ یہ تینوں حضرات حجاز مقدس کے لیے حج کی نیت سے روانہ ہوگئے، ان میں دو بزرگوں نے بڑے مؤثر انداز میں احوال سفر لکھے جو وہاں کی حاضری کا شوق پیدا کرنے اور آداب زیارت وقیام سے آگاہ کرنے میں مہمیز کا کام دیتے ہیں، ''سفر حجاز'' مولانا عبدالماجد دریابادی کی تصنیف ہے اور ''دربار نبوتؐ میں حاضری'' مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا تأثر نامہ ہے۔

بمبئی کی بندرگاہ سے یہ قافلہ روانہ ہوا تھا اور جدہ کی بندرگاہ پر اسے اترنا تھا، جدہ سے یہ قافلہ مدینہ روانہ ہوا، اس لیے کہ ابھی حج میں ایک ماہ باقی تھا، مدینہ پہنچتے ہی یہ تینوں صاحب دل وصاحب قلم اپنے اپنے حال میں گم ہوگئے، حب نبویؐ میں ایسے سرشار اور معاشرہ نبوی کی وادیوں میں ایسے سرگرداں کہ سب کچھ اس کے سوا بھول گئے۔

مدینہ منورہ میں ان کا قیام ایک ماہ یا اس سے کچھ زیادہ رہا، ۴؍ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوئے، اور وقت پر مکہ مکرمہ پہنچ گئے، احرام ذوالحلیفہ سے باندھا تھا، ہر عمل کرتے وقت سنتوں کا بڑا خیال رہتا تھا، مگر اس میں بھی اپنا علم وفہم کام دکھاتا رہتا، مولانا گیلانی نے قران کا احرام باندھا، یعنی عمرہ وحج کا ایک ہی احرام اور مولانا دریابادی ومولانا عبدالباری ندوی نے تمتع کا احرام باندھا یعنی صرف عمرہ کا، اس وقت یہ ان تینوں کی عاشقانہ کیفیت ایسی تھی کہ کلیجہ باہر آنے کو تھا، مولانا گیلانی نے بڑی خوب تصویر کشی کی ہے کہ:

> ''لبیک اللھم لبیک کی صدا گونجنے لگی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سینے پھٹ جائیں گے، روحیں قفس عنصری کو توڑ کر نکل پڑیں گی، محسوس ہوتا تھا کہ گویا ہر احرام باندھنے والے کے ہر بن مو سے وہی نغمۂ داؤدی اُبل رہا ہے۔''(۱)

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے حیات مولانا گیلانی ص/۲۶۲-۲۷۳۔

حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کے ساتھ چند لمحات

حضرت مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ شروع سے دینی جذبات کے حامل رہے، یہی جذبہ اور حوصلہ اور فکر وتڑپ انھیں ربانی علماء و مصلحین امت کی خدمت میں بار بار لے جاتا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے ایسی کئی اہم شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جن سے مولانا عبدالباری ندوی نے کسب فیض کیا، جن میں ایک اہم نام بانی تحریک دعوت وتبلیغ اور عظیم مصلح مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، اس تعلق سے ''پرانے چراغ'' کی عبارت اس طرح ہے:

> ''مولانا میری درخواست وتحریک پر نظام الدین بھی تشریف لے گئے اور مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت وہمرکابی میں میوات بھی گئے، وہاں کے جلسہ میں شریک ہوئے، واپسی پر اپنے گہرے تأثرات کا اظہار کیا، اور فرمایا ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل گونگا تھا، اس کے پاس زبان نہیں تھی، مولانا سے جو کچھ سنا، معلوم ہوا کہ میرا دل یہی کہنا چاہتا تھا، کہہ نہیں سکا۔'' (۱)

اس سے بڑھ کر بقلم خود مولانا عبدالباری ندوی کا یہ کھلا اعتراف موجود ہے جو انھوں نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''تجدید تعلیم وتبلیغ'' میں پوری حقیقت بیانی سے کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''احقر (مولانا عبدالباری ندوی) بستی نظام الدین حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، غالباً دوسرے ہی دن قصبہ نوح میں اس تبلیغی سلسلہ کا بڑا سالانہ اجتماع تھا، جس میں باصرار ساتھ چلنے کا حکم ہوا، دو تین دن مسلسل حضرت کی

---

(۱) پرانے چراغ ۲/۱۲۴۔

معیت اور تبلیغی خدمات کے معائنہ ومشاہدہ کی سعادت حاصل رہی، دہلی سے سیدھے تھانہ بھون حاضری تھی، جب رخصت ہونے لگا تو (مولانا الیاس کاندھلویؒ نے) فرمایا کہ حضرت مولانا تھانوی کی خدمت میں سلام عرض کرنا، یہاں کے کام کا ذکر کرنا، اور جو کچھ فرمائیں مجھ کو ضرور لکھنا۔

چنانچہ سلام رسانی کے بعد راقم احقر نے بستی نظام الدین کی بنگلہ والی مسجد سے لے کر قصبہ نوح تک کے جو اثرات تھے مختصر عرض کیے، (حضرت تھانویؒ نے) فرمایا "اصل کام تو یہی ہے۔" (۱)

مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کے ساتھ رائے بریلی کا ایک تبلیغی سفر

حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کی صحبت بابرکت کا اثر کہیے یا اندر سے دعوتی وتبلیغی فکر وجذبہ کا تأثر سمجھیے، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کے بعد بھی ان کے جانشین مولانا محمد یوسف کاندھلوی سے تعلق اور تعاون کا جذبہ رہا، اسی لیے جب لکھنؤ اور اس کے اطراف کرسی ورحیم آباد میں تبلیغی اجتماع طے ہوا اور اس میں اکابرین تبلیغ خصوصاً حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی اور حضرت مولانا احتشام الحسن کاندھلوی اور ان سب کے بزرگ اور مرشد کی حیثیت رکھنے والی شخصیت حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کی تشریف آوری بھی طے ہوئی، اور فروری ۱۹۴۷ء میں یہ مبارک قافلہ لکھنؤ پہنچا اور پھر رائے بریلی بھی گیا کہ جس شہر کو امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ سے نسبت حاصل ہے وہاں دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں کے گاؤں میں جو حضرت شہیدؒ کا وطن اور اسی طرح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا وطن ومستقر ہے، وہاں اس مبارک قافلہ کے ساتھ حضرت

---

(۱) تجدید تعلیم وتبلیغ ص/۱۷۱۔

مولانا عبدالباری ندوی بھی تشریف لائے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اس کی اجمالی روداد سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ میں اور ان کے خواہرزادے مولانا سید محمد ثانی حسنی نے ''سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ'' میں اس طرح بیان کی ہے:

''آپ (یعنی حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ) دہلی سے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ اور ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں قیام رہا، اور وہیں سے ۲۴ گھنٹہ کے لیے راقم السطور کے وطن رائے بریلی تشریف لائے، علماء اور عمائد کی ایک بڑی جماعت ہمراہ تھی، جن میں حضرت شیخ الحدیث اور مولانا محمد یوسف صاحب کے علاوہ پیر ہاشم جان صاحب مجددی، مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی، مولوی ظہیرالحسن صاحب کاندھلوی مرحوم، محمد شفیع قریشی مرحوم (سابق مقیم راولپنڈی) مولانا عبدالباری صاحب ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی بھی تھے، حضرت شاہ علم اللہ (جدامجد حضرت سید احمد شہیدؒ) کی مسجد کے سامنے دریا کے دوسرے کنارے یہ مبارک قافلہ اترا اور کشتی سے دریا عبور کر کے ''شاہ علم اللہ صاحبؒ کے دائرے'' میں داخل ہوا، یہ ایک شب و روز کا قیام عجب کیف و سرور کا تھا، جس کی لذت شرکائے سفر کو اور اہل شہر کو ابھی تک یاد ہے، دوسرے روز صبح لکھنؤ واپسی ہوگئی۔''

مولانا سید محمد ثانی حسنی مزید لکھتے ہیں:

''علماء اور عمائد کا یہ مبارک قافلہ ۸ ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ مطابق

۳۰ر فروری ۱۹۴۷ء بروز اتوار تقریباً ۹ بجے صبح ''دائرہ شاہ علم اللہ'' پہنچا، استقبال کے لیے بستی کے سارے حضرات نیز شہر کے اصحاب موجود تھے، ان حضرات کے قیام کے لیے مختلف بیٹھکوں میں انتظام کیا گیا، راقم سطور ایک روز پہلے ہی انتظام کے خاطر پہنچ چکا تھا، مولانا محمد یوسف صاحب نے اس ایک روزہ قیام میں تبلیغ کا کام کیا، اور بعد عصر قریب کے ایک گاؤں میدان پور میں گشت واجتماع کیا گیا، جس میں قریشی صاحب نے تقریر کی، بعد مغرب رائے بریلی کی عالمگیری مسجد میں اجتماع ہوا، جس میں مولانا کا خطاب ہوا، جس میں بستی کے حضرات شریک ہوئے، اس وقت مولانا پر عرب میں کام کرنے کا بہت زیادہ حال طاری تھا، خصوصی خطاب کے ختم پر اسی بستی کے ایک عالم مولانا سید ابوالخیر صاحب (جن کو عربی ادب وزبان سے اچھا مذاق ہے) سے تعارف کرایا گیا تو فرمایا: آپ عرب میں کام کے لیے مفید ثابت ہوسکتے ہیں، ''دائرہ شاہ علم اللہ'' کی یہ بستی صدیوں سے بزرگوں کی آمدورفت سے مستفید ہوتی رہی ہے، اور ہمیشہ بزرگوں نے اس بستی میں مزید قیام کی خواہش کی ہے، اس سے پہلے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ جاچکے تھے، مولانا نے بھی طویل قیام کی خواہش کا اظہار کیا تھا، دوسرے دن صبح کو لکھنؤ واپسی ہوئی اور وہاں سے ۱۱ر ربیع الثانی بدھ کو ہاوڑہ ایکسپریس سے براہ رامپور دہلی واپس ہوئے۔''(۱)

(۱) سوانح حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ مصنفہ مولانا سید محمد ثانی حسنی ص ۲۷۶، مطبوعہ کراچی

سیرت سید احمد شہید کا مطالعہ اور ایک تأثر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''۱۹۳۹ء میں میری کتاب ''سیرت سید احمد شہید'' نکلی، میں نے ایک نسخہ مولانا کی خدمت میں پیش کیا، وہ حیدرآباد جارہے تھے، راستہ میں انھوں نے کتاب پڑھی اور اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا، یہاں پر وہ خط نقل کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عثمانیہ کالج ڈاکخانہ لالہ کوڑا

حیدرآباد، دکن

۱۲/مارچ ۱۹۳۹ء

برادرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں آپ کی کتاب سفر میں ختم کی، بلکہ کہنا چاہئے کہ یہ سفر کاملین ایمان کی مجلس وصحبت میں تھا، ایمان واسلام ان ہی بزرگوں کا تھا، باب چہارم پڑھ کر تو یہ سنگ دل بھی اپنی آنکھوں کو خشک نہ رکھ سکا، جو ہمیشہ تری کو ترسا کرتی ہیں۔

واقعی مسلمانوں کے اندر ایمان کو تازہ رکھنے کے لیے تو ایسے ہی احوال وسوانح کی ضرورت ہے، فجزاکم اللہ عن المسلمین۔

میرے تو اس یقین کو بھی آپ کی کتاب نے اور مضبوط کردیا کہ

مسلمانوں کا کام آج کی انجمن بازیوں اور انجمن سازیوں سے ہرگز نہ چلے گا، اس کا کام کسی سربکف مومن کامل فرد ہی سے چلے گا، جس کے گرد خود ہی ہر خدمت و صلاحیت کے مخلصین جمع ہو جائیں گے، اور ایمانیوں کی سچی انجمن وہی ہوگی، دعا کیجئے کہ اللہ اب اس وقت امت محمدیہ پر رحم فرمائے، ذی الحجہ کا ''ترجمان'' کہیں ملے تو پڑھیے۔

والسلام

طالب دعا

عبدالباری

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی لکھنؤ تشریف آوری

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے بغرض علاج لکھنؤ کا سفر کیا، ۱۰/اگست ۱۹۳۸ء (۱۲/جمادی الاخری ۱۳۵۷ھ) کو اپنے مستقر سے مرشد تھانوی روانہ ہوئے، اور چالیس دن لکھنؤ میں گذارے، اس سفر میں مولانا جمیل احمد تھانوی، مولانا ابرارالحق حقیؒ، اور جناب وصل بلگرامی ساتھ تھے، مولانا عبدالباری ندوی بھی مع اہل وعیال گئے ہوئے تھے، وہ بھی ساتھ ہی لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے، قیام مولوی گنج میں مسجد خواص میں رہا، جہاں روز ایک وقت مجلس کے لیے مقرر تھا، جس میں لکھنؤ شہر کے سربرآوردہ لوگ علماء و مشائخ شرکت کرتے، قرب وجوار کے لوگ بھی آگئے جیسے بارہ بنکی سے مولانا مسعود علی ندوی آگئے اور کئی روز رہے اور پابندی سے مجلس میں حاضری دیتے رہے، مولانا سید سلیمان ندوی بھی ان دنوں یہیں تشریف فرما تھے، مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی روز ہی حاضری کی کوشش کرتے اور بقول جناب وصل بلگرامی:

''بعض حضرات ایسے تھے کہ اگر وہ روز شریک مجلس نہ ہوتے تو

ان کو صدمہ ہوتا، وہ کوشش کرتے تھے کہ جس طرح ممکن ہو، روزانہ شریک ہوں، گو عدیم الفرصتی کی وجہ سے مجبور ہوتے مگر پھر بھی وقت نکال کر برابر شرکت کرتے، ان میں جناب مولوی عبدالباری ندوی اور جناب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ سب سے مستعد پائے جاتے تھے، ان کی بیتابی، ان کا شوق، ان کی محبت ان کی عقیدت دیکھنے کے قابل تھی۔'' (۱)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے قیام لکھنؤ کے اس زمانہ میں ان کی خدمت میں حضرت مولانا ابرارالحق حقیؒ بھی بڑی مستعدی سے رہے، حضرت تھانوی کو ان سے شروع ہی سے انس تھا، اور ان پر حضرت کی بڑی شفقتیں تھیں انھوں نے حضرت کے ملفوظات عالیہ کے قلمبند کرنے کا بھی معمول بنائے رکھا، اس مجموعہ ملفوظات کو جناب وصل بلگرامی صاحب نے اپنی کتاب ''الاسفار عن برکات بعض الاسفار'' یعنی سفر نامہ لاہور ولکھنؤ میں شامل کیا ہے، اس میں وہ ملفوظات بھی ہیں جو حضرت تھانوی نے مولانا عبدالباری ندوی کے مکان پر قیام کے دوران ارشاد فرمائے تھے، جناب وصل بلگرامی کی روداد قیام لکھنؤ کے مطابق ایک روز بہ تقاضائے خود حضرت تھانوی ۱۵ ستمبر کو مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ناظم ندوۃ العلماء کے مکان بھی تشریف لے گئے، مسجد خواص سے پیدل ان کے مکان تک دس منٹ کا راستہ ہے، جو انھوں نے اسی طرح طے کیا، اور ایک دن شب گذاری کے لیے اپنے مسترشد مولانا عبدالباری ندوی کے مکان پر تشریف لے گئے، مولانا عبدالباری پر حضرت تھانوی کی شفقت یوں بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جب حضرت تھانوی لکھنؤ میں اپنے قیام کا چلہ پورا کر کے تھانہ بھون کے لیے روانہ ہونے لگے تو اسٹیشن جانے کے لیے جس گاڑی پر بیٹھے اس پر ان کے ساتھ یہی مولانا عبدالباری ندوی اور جناب وصل بلگرامی تھے۔

---

(۱) سفر نامہ لاہور ولکھنؤ از جناب وصل بلگرامی ص/ ۱۱۸، مکتبہ اشرفیہ فیروز پور روڈ لاہور۔

مستقر اور مقام

مستقر اور مقام کے اعتبار سے دیکھا جائے تو حضرت مولانا عبدالباری ندوی کے لیے حیدرآباد اور لکھنؤ کا قیام زیادہ سازگار رہا، حیدرآباد میں ان کا ساتھ عظیم اسلامی محقق اور ممتاز معلم مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا رہا، اور لکھنؤ میں ان کے دو قدیم محبّ ومحبوب تھے، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ناظم ندوۃ العلماء اور مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر ''صدق''، اس طرح مولانا کے شباب کا زمانہ حیدرآباد میں گذرا، اور زندگی کا آخری حصہ لکھنؤ کے حصہ میں آیا، جو زیادہ طویل اور خیر کا تھا، لکھنؤ کے قیام کی تفصیلات مولانا اپنے اس مضمون میں بیان کرتے چلے گئے ہیں جو انھوں نے سب سے عزیز ومحبوب دوست مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کی وفات پر سپرد قلم کیا تھا اور عنوان دیا تھا "إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ" جو بعد میں ''ایک فرشتہ صفت انسان'' کے نام سے رسالہ کی صورت میں شائع ہوا، لکھنؤ میں انھوں نے محلّہ ''قدم رسول'' میں سیتاپور روڈ پر ایک زمین خریدی اور مکان کی بناڈالی جس کا نام ''شبستان سعادت'' رکھا، جسے وہ شبستان قدم رسول بھی کہا کرتے تھے، وہ یہاں قیام اور شب گذاری کے لیے علماء ومشائخ کو دعوت بھی دیتے جو ان کے محبت وخلوص میں منظور بھی کرلی جاتی، اس طرح ان کی ضیافت کا موقع ملتا، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اس کی اچھی تصویر کھینچی ہے وہ رقمطراز ہیں:

> ''پھر وہ وقت آیا کہ ان کی کوٹھی جس کا نام انھوں نے ''شبستان سعادت'' رکھا تھا، محلّہ قدم رسول میں شیعہ کالج کے بغل میں بن کر تیار ہوگئی، مولانا حسین احمد مدنیؒ کی بھی اب لکھنؤ جلد اور بار بار تشریف آوری ہونے لگی، مولانا اگر ہمارے مکان کے علاوہ اگر کہیں شب گذارنے کے لیے آمادہ ہوتے تو وہ صرف

مولانا عبدالباری صاحب کی کوٹھی تھی، ممالک عربیہ میں تو اس کی بکثرت مثالیں ملیں گی، لیکن ہمارے علم میں ہندوستان میں کسی نے اپنے قلم کے زور سے ایسی اچھی شاندار کوٹھی نہ بنائی ہوگی، مولانا کبھی خود یہ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں نے ''دارالترجمہ'' کے لیے فلسفہ کی کتابوں کا ترجمہ کرکے جو مالی فائدہ حاصل کیا ہے اس سے یہ کوٹھی بنائی، نہایت وسیع و دلکشا، اچھے اچھے متعدد کمرے، بیچ میں وسیع ہال جس میں کتب خانہ تھا، سامنے چمن اور گرمیوں میں شام کی نشست کے لیے ایک چبوترہ جس پر کرسیاں پڑی ہوتیں، بغل میں ملازمین کے لیے کوارٹر، کرایہ پر اٹھانے کے لیے بھی کچھ حصے، غرض میں نے اس وقت تک کسی عالم کی قیامگاہ جس کے پاس کسی کالج یا یونیورسٹی کی سند نہ تھی، اور جو صرف قدیم تعلیم اور ذاتی مطالعہ اور محنت کا ممنون احسان تھا، ایسی مکلّف اور کسی حد تک رئیسانہ قیامگاہ نہیں دیکھی تھی، میرا ناچیز مشورہ شامل ہوتا تو میں اس کوٹھی کا نام بجائے ''شبستان سعادت'' کے ''دارالقلم'' یا ''بیت القلم'' رکھتا کہ یہ سب اسی قدیم فارسی شعر کی شرح تھی جو خوش نویسی کی مشق کے لیے تبرکاً اور تفاءلاً بچوں سے لکھوایا جاتا تھا ؎

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم(۱)

انھیں اپنی اس قیام گاہ کے تعلق سے یہ سعادت بھی حاصل ہوئی کہ جب

---

(۱) پرانے چراغ ۲/۱۱۶۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بغرض علاج لکھنؤ کا سفر کیا جو ۱۰/اگست ۱۹۳۸ء (۱۲/جمادی الاخری ۱۳۵۷ھ) شروع ہوا تھا، اور اس میں مولانا عبدالباری ندوی کو مع اپنے اہل وعیال کی رفاقت حاصل تھی (۱) حضرت کا قیام مولوی گنج میں مسجد خواص میں رہا تھا مگر ایک روز (۱۵/ستمبر کو) خود اپنے تقاضہ سے حضرت کچھ پیدل چل کر مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کے مکان (گوئن روڈ) پر تشریف لائے اور اگلے دن شب گذاری کے لیے اپنے مسترشد مولانا عبدالباری ندوی کے مکان پر بھی تشریف لے گئے، جس کی تفصیل جناب وصل بلگرامی بیان کرتے ہیں:

> ''اسی درمیان میں جناب مولوی عبدالباری ندوی نے غایت شوق سے درخواست کی کہ ایک شب کے لیے حضور والا مع مستورات کے میرے غریب خانہ کو بھی تشریف آوری سے رونق و عزت عطا فرمائیں، حضرت والا نے ان کے خلوص کو دیکھ کر منظور فرمالیا، چنانچہ ۱۶/ستمبر ۱۹۳۸ء کو نماز عصر سے کچھ دیر پہلے حضرت والا مع سواریوں کے وہاں تشریف لے گئے، مولوی جمیل احمد صاحب بھی ہمراہ تھے، حاجی عبدالستار اور عبدالمجید حضرت کی خدمت کرنے والے بھی حاضر تھے، اس خادم نے بھی حاضر ہونے کی اجازت لے لی تھی، چنانچہ یہ خادم اور عزیزی حافظ مولوی ابرار الحق سلمہ (۲) مغرب سے پہلے وہاں حاضر ہوگئے، ناسازیٔ مزاج کے بعد آج یہ دولت نصیب ہوئی کہ فریضہ مغرب حضرت والا کی امامت میں نصیب ہوا، میں نے اور مولوی ابرار الحق سلمہ نے واپسی کی اجازت کی درخواست کرنا چاہی، مگر مولوی

---

(۱) ملاحظہ ہو سفرنامہ لاہور لکھنؤ، از: وصل بلگرامی۔

(۲) حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقی رحمۃ اللہ علیہ۔ (م)

عبدالباری صاحب نے غایت محبت سے روک لیا، اور حضرت والا نے بھی اس کو پسند فرمایا کہ ہم دونوں خادم بھی یہیں رات بسر کریں، نماز عشاء بھی حضرت والا نے پڑھائی اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب اپنی اپنی جگہ پر گئے تاکہ سو رہیں۔

اسی زمانہ میں جناب مولوی افضل علی متوطن تھلوارہ ضلع بارہ بنکی جو حضرت والا کے مجاز طریقت بھی ہیں مع اہل وعیال کے مولوی عبدالباری صاحب کے یہاں مقیم تھے، ان کو دو تین روز سے کچھ دماغی شکایت پیدا ہوگئی جو اس سے پہلے اور بھی کئی بار ہوچکی تھی، لیکن آج اس دورے میں زیادتی تھی، اس رات کو جناب مولوی عبدالباری صاحب کی کوٹھی پر مولوی افضل علی صاحب کے دورے کی وجہ سے کوئی اطمینان سے سو نہ سکا، مستورات پر اس کا بہت اثر تھا، اور ان کی وجہ سے حضرت والا بھی متاثر تھے، غرض وہ رات عجیب بے چینی اور اضطرار میں بسر ہوئی، نماز فجر میں مولوی افضل علی صاحب شریک جماعت تھے، اس وقت بھی حضرت والا نے نماز پڑھائی، اور بعد فراغت نماز حضرت والا نے مولوی افضل علی صاحب سے فرمایا: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کچھ روز کے لیے مکان چلے جائیں، لکھنؤ کی آب وہوا آپ کے موافق نہیں ہے، انھوں نے اسی حالت میں اس کو منظور کرلیا، چنانچہ حضرت والا تفریح کے لیے جایا کرتے تھے اور اس وقت حضور ہی کے لیے وہ موٹر یہاں آیا تھا، مولوی افضل علی صاحب، ان کی اہلیہ اور ان کے خویش کو اسٹیشن بھیج دیا، وہ دن تانگے اور یکوں کی ہڑتال کا تھا، کوئی سواری نہیں

ملتی تھی، اور یہاں دیر ہوگئی تھی، حضرت والا نے فرمایا کہ میں ٹہلتا اور تفریح کرتا ہوا چلا جاؤں گا، آج مشی نہیں کی ہے (یعنی ٹہلا نہیں ہوں) مشی بھی ہو جائے گی، موٹر جس وقت آئے پہلے مستورات کو بھیج دیا جائے، اور اس کے بعد اگر وقت ہو تو راستہ میں مجھے موٹر مل جائے، اس طرح حضرت والا پیدل وہاں سے روانہ ہو گئے، حضرت والا کے ہمراہ یہ خادم اور مولوی ابرار الحق تھے، مولوی عبد الباری صاحب کی کوٹھی ڈالی گنج میں بالکل شیعہ کالج سے ملی ہوئی واقع ہے، ایک تانگہ والے کو دیکھا کہ کسی کو شیعہ کالج پہنچا کر واپس آ رہا ہے، وہ بیچارہ حضرت والا کو پیدل چلتا ہوا دیکھ کر خود ہی رکا کہ شاید تانگہ کی ضرورت ہو، میں نے اس سے ضرورت کا اظہار کیا اور وہ باوجود ہڑتال کے پیر جلیلوں کے محلّہ کے قریب تک پہنچانے کے لیے تیار ہو گیا، خداوند کریم نے غیب سے حضرت والا کے لیے راحت کا سامان فرمایا، اور حضرت والا نہایت آرام سے محلّہ مذکورہ تک پہنچ گئے، وہاں سے مولوی گنج زیادہ دور نہیں تھا، تھوڑی ہی دور پیدل چلے ہوں گے کہ چودھری خلیق الزماں صاحب کا موٹر جو مولوی افضل علی کو پہنچانے گیا تھا اور مستورات کو بھی پہنچا کر واپس آ گیا تھا، ڈھونڈھتا ہوا یہاں پہنچ گیا اور حضرت والا اطمینان و آرام سے قیام گاہ پر پہنچ گئے۔"(۱)

علماء و مشائخ کے قدوم میمنت کی سعادت سے مشرف ہونے والی یہ شبستان اپنے بانی کی آخری سانسوں تک اصحاب ذکر و فکر اور اہل قلم و بیان کی آمد و رفت سے مسعود

---

(۱) کتاب: الاسفار عن برکات بعض الاسفار یعنی سفر نامہ لاہور و لکھنؤ ص/ ۱۳۱-۱۳۳، مکتبہ اشرفیہ لاہور۔

ہوتی رہی، اور کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ آج بھی ان کے اخلاف کے ذریعہ جاری ہے۔

آزادیٔ وطن، پاکستان کا سفر اور ہندوستان میں قیام کو ترجیح

وطن عزیز کی آزادی کی جدوجہد میں علمائے کرام کی جو خدمات رہیں، تاریخی حقائق کی روشنی میں اس سے اب کسی کو انکار نہیں، مسلمان مؤرخین کے اعلان اور ہندو و انگریز مؤرخین کے اعتراف کے بعد یہ بات اب پردۂ خفا میں نہیں رہی ہے، مولانا عبدالباری ندوی تحریک آزادیٔ ہند کے عظیم رہنما و قائد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے نہ صرف ہم نوا اور ہم فکر تھے بلکہ ان کے سچے ارادت منداور جاں نثار معتقد و محب بھی تھے، مگر قیام پاکستان کے بعد ان پر اس بات کا دباؤ پڑا کہ ان کو اپنی صلاحیتوں کو پاکستان میں بروئے کار لانا چاہئے، چنانچہ ملک تقسیم ہونے کے بعد اہل پاکستان کا بڑا اصرار اس بات کے لیے ہوا کہ آپ اپنے وطن سے ہجرت کر جائیں، اور لاہور و کراچی میں بہت سی جگہیں لوگوں نے مکان کی شکل میں روک لیں۔

صاحبزادہ گرامی مرتبت حافظ احمد الباری کہتے ہیں کہ:

> ''کراچی میں جہاں ''ادارۂ تعلیم ملی'' ہے جو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے بھائی ڈاکٹر محمود صاحب نے قائم کیا تھا، یہ جگہ اہل تعلق نے والد صاحبؒ کے لیے روکی تھی کہ اپنی پسند کا ادارہ قائم کریں، والد صاحبؒ اور حضرت مولانا ابرار الحق صاحب ہوائی جہاز سے لاہور و کراچی تشریف لے گئے، وہاں جا کر ان دونوں بزرگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان ہی میں رہنا ہے، اور کچھ وقت گذار کر واپس اپنے وطن عزیز ہندوستان آ گئے اور یہیں خدمت دین وملت کے لیے اپنا میدان عمل بنایا۔''

تحریک ندوۃ العلماء سے وابستگی

ندوۃ العلماء کا وجود ایک تحریک کے طور پر ہوا تھا، ملی اختلافات کو (جو مخالفت وعناد کے حدود پار کر گئے تھے) دور کرنے اور اتحاد کی فضاء قائم کرنے اور تعلیمی نظام ونصاب کی درستگی اور اسے مزید مؤثر بنانے کے لیے علماء وقت نے لائحہ عمل مرتب کیا جس کے نتیجہ میں دار العلوم کا قیام ناگزیر سمجھا گیا کہ جس کے بغیر اس کے اغراض و مقاصد بروئے کار نہیں لائے جاسکتے تھے تو اس دار العلوم کے اولین باکمال فرزندوں میں ایک نام مولانا عبدالباری ندوی کا تھا، جو اپنی جامعیت، اور علوم اسلامیہ وعلوم جدیدہ میں یکساں عبور وقدرت اور رسوخ وکمال رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک صاحب دل شخصیت تھے، جنھیں اللہ نے لمبی عمر بھی دی جس کی وجہ سے انھیں اپنے معاصرین میں یہ تفوق وامتیاز حاصل رہا کہ دوسروں کی بہ نسبت ان سے کسب فیض کرنے والے زیادہ نسل کے لوگ رہے، انھیں یہ بھی خصوصیت حاصل رہی کہ عنفوان شباب سے ہی بڑی شہرت حاصل ہوئی اور قدیم وجدید دونوں طبقوں میں اپنی قابلیت تسلیم کرالی، جس کے لیے ان کا رسالہ ''مذہب وعقلیات'' خصوصیت سے قابل ذکر ہے، اس کے علاوہ مشہور فلاسفر برکلے پر ان کی تحقیق اور اس کے فکر وفلسفہ کی تحلیل وتجزئے نے انھیں مایہ ناز شخصیت بنادیا، اور بجا طور پر ندوۃ العلماء کو یہ حق حاصل ہوگیا کہ ان پر فخر کرسکے، چنانچہ ندوۃ العلماء کے ابتدائی جلسہ ہائے انتظامی کی رپورٹ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ندوۃ العلماء نے اپنے دار العلوم کی کامیابی ثابت کرنے کے لیے جہاں مولانا سید سلیمان ندوی اور دار المصنفین کی خدمات کو پیش کیا ہے وہیں مولانا عبدالباری ندوی کی خدمات وتحقیقات اور تصنیفات کا اہتمام سے ذکر ملتا ہے، اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں میں مدعو کئے جانے لگے تھے، اور اس کے جلسہ انتظامی میں شرکت فرماتے تھے، جس میں ان کی رائے وقیع مانی جاتی،

اور تجاویز میں ان کی تائید کو اہمیت دی جاتی۔(۱)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی انھیں ندوۃ العلماء کا قابل فخر فرزند اور اس کی گنی چنی شخصیات میں ایک خیال کرتے تھے، اپنے ایک خطاب میں انھوں نے یہ باور کرایا تھا کہ ہر ادارے کی چند آئیڈیل شخصیات ہوتی ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی جامع اور مثالی شخصیتیں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی ہیں، مولانا اسحاق جلیس ندوی مدیر ''تعمیر حیات'' نے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ: ''اپنی مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے انھیں گہرا تعلق تھا۔''(۲)

ابنائے ندوہ کے دوسرے بڑے مرکز علمی دارالمصنفین اعظم گڑھ سے بھی ان کا علمی وانتظامی دونوں طریقہ سے ربط رہا، البتہ وہ اپنی معذوریوں کی وجہ سے انتظامی رابطہ مسلسل قائم نہ رکھ سکے، اور استعفیٰ دے کر لکھنؤ میں یکسو ہو کر رہنے کو ترجیح دی، لیکن علمی مشوروں کا سلسلہ اور مطالعہ کا سفر جاری رکھا، جس کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ ان کی مفید علمی وتحقیقی کتابیں سامنے آتی رہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تاریخ ساز اور بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس پچاسی سالہ جشن تعلیمی منعقدہ لکھنؤ ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء میں اپنی معذوریوں اور شدید علالت کی وجہ سے شرکت فرمانے سے قاصر رہے، مگر ان کو ندوۃ العلماء اور اس کے تعلیمی ادارے دارالعلوم سے۔ جس کے وہ قابل فخر فرزند تھے۔ جو تعلق تھا اس کے باعث اس موقع پر یہ خلا پوری طرح محسوس کیا گیا اور اس کو پر کرنے کی اس طرح کوشش کی گئی کہ ان کی علمی ودینی خدمات کو پیش کر کے یاد تازہ کی گئی، جس کا مولانا سید محمد الحسنیؒ نے ''روداد چمن'' میں اس طرح اظہار کیا ہے:

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ ندوۃ العلماء جلد دوم از مولانا شمس تبریز خاں۔

(۲) تعمیر حیات (۱۰ر فروری ۱۹۷۶ء)۔

''اس موقع پر مولانا عبدالباری ندوی کی یہ کمی ہر شخص نے محسوس کی جو اس وقت ندوہ کے معزز ترین فاضل اور فرزند ہیں اور ایک طویل عرصہ سے صاحب فراش اور معذور ہیں، مولانا کے نام کا چارٹ نمائش میں صفحہ اول کے ندوی مصنفین کے ساتھ آویزاں تھا، ''البعث الاسلامی'' ندوۃ العلماء کے نمبر میں بھی اور منتخب لوگوں کے ساتھ ان پر بھی خصوصی مقالہ شائع کیا گیا، لیکن یہ سب دیکھنے اور ندوہ کی ترقی و اقبال سے خوش ہونے کے لیے وہ اس وقت یہاں موجود نہ تھے، افسوس ہے کہ مولانا نے ۲۷ محرم ۱۳۹۶ھ مطابق ۳۰ جنوری ۱۹۷۶ء میں جمعہ کو اس دار فانی سے کوچ فرمایا اور یہ مسند علم و فضل بھی جس سے ندوہ کا وقار بلند تھا خالی ہوگئی، رحمه الله رحمة واسعة۔''(۱)

☆☆☆☆☆

(۱) روداد چمن ص ۹۴ (مرتبہ از: مولانا سید محمد الحسنی مرحوم پہلا ایڈیشن)

باب سوم

حج وزیارت

سفر کی تیاری

مولانا عبدالباری ندوی کا گھرانہ خوش حال گھرانہ تھا، اس کے ساتھ دیندار، پرہیز گار اور دینی جذبہ وحمیت رکھنے والا خاندان تھا، جس کے افراد اہل اللہ اور علمائے وقت سے ربط وتعلق رکھتے تھے، اور حب نبویؐ سے سرشار تھے، والد ماجد بڑے ذاکر شاغل اور بزرگ شخص تھے ہی، والدہ ماجدہ بھی تقویٰ اور ذکر وشغل میں کم نہ تھیں، چنانچہ جب مولانا عبدالباری ندوی نے حج کا عزم مصمم کیا تو انھوں نے اپنے والدین کو بھی ساتھ لیا، دوسری طرف ان کے رفقاء واحباب میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالماجد دریابادی بھی ساتھ تھے، ہر ایک نے بڑے جذبہ حوصلہ اور عشق ومحبت میں ڈوب کر رخت سفر باندھا، اور ہر ایک کا ہی حال قابل رشک تھا، مولانا دریابادی مولانا گیلانی سے بڑے متاثر ہوئے اور اپنے اس تاثر کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے، جابجا ان کے یہ عقیدت ومحبت بھرے تاثرات ان کے ''سفرنامہ حجاز'' میں دیکھے جاسکتے ہیں، مولانا گیلانی نے ''دربار نبوت کی حاضری'' کے نام سے سفرنامہ لکھا، لیکن ہم یہاں ''مکاتیب گیلانی'' سے وہ اقتباس پیش کریں گے جو انھوں نے اسی رشتہ سے عرفات اور دیار حبیب میں رفاقت کے تعلق سے بڑے تاثر سے لکھا ہے۔

والدہ ماجدہ کی بزرگانہ شان

مولانا عبدالباری ندوی کی والدہ ماجدہ ایک برگزیدہ خاتون تھیں، مولانا سید

مناظر احسن گیلانی کی قدر دانی کے الفاظ ان کی عظمت و بزرگی کو عیاں کرتے ہیں:

"امیدوار رہتا ہوں کہ اوقات خاص میں اپنی مخلصانہ دعاؤں میں مجھے فراموش نہ فرمایا کریں گی، عرفات کے میدان میں جو قدرتی ایمانی ربط ہم لوگوں میں پیدا ہو چکا ہے، انشاء اللہ تا قیام قیامت اس کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔

اللہ اللہ مدینہ سے روانگی والی رات، سید الکونین صلوات اللہ علیہ وسلامہ نے براہ راست رؤیا میں آپ کی والدہ صاحبہ پر ظاہر ہو کر اس دلچسپی کا اظہار کیا، یہ کرامتیں جو محض ان کی ہستی پاک کی بدولت حاصل ہوئیں قابل فراموش ہوسکتی ہیں؟ میرا بہت بہت سلام، خدمت میں پہنچا دیجئے، اہلیہ کو بھی سلام کہئے۔" (۱)

مولانا عبدالباری ندوی خود اپنا تاثر اسی کے ذیل میں یوں بیان کرتے ہیں:

"حاضری بیت اللہ سے پہلے بیت الرسولؐ میں ہوئی تھی، آخر ذیقعدہ تک بیت اللہ حاضر ہو جانے کا قطعی پروگرام تھا، سفر پورے قافلہ کا دو لاریوں پر ہوا تھا، مگر واپسی میں ان کے ملنے میں اتنی دشواری ہوئی کہ ہر طرف ہاتھ پاؤں مارنے پر بھی نہ آج ملتی ہیں نہ کل، حج کی تاریخیں سر پر، قدرۃً ہر شخص قافلہ کا سراسیمہ، حضرت والد رحمہ اللہ مسجد نبویؐ میں ایک بواب حضرت عبدالرحمٰن سندھی کی خدمت میں کبھی کبھی جا بیٹھتے تھے، انھوں نے فرمایا پریشانی کی بات نہیں، جب اجازت ہوگی چلے جایئے گا، ہم اس اجازت کا مطلب کیا سمجھتے، پریشانی ساعت بساعت بڑھ رہی تھی، دوسری ذی الحجہ تک آ گئی، سامان باندھا گیا تھا، مگر

---

(۱) مکاتیب گیلانی: ۱/۲۳۳۔ (مرتبہ: مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی مطبوعہ خانقاہ رحمانی مونگیر بہار)

لاریاں آج بھی ندارد کہ تیسری کی علی الصباح حضرت والدہؒ نے مسرت اور جذبات سے بھری اور بھرائی آواز میں میرا نام لے کر پکارنا شروع کیا کہ تہجد کے بعد آنکھ لگ گئی تھی، کہ ابھی دیکھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عصا ٹیکے سامان کے پاس اس طرح تشریف فرما ہیں کہ گویا رخصت فرما رہے ہیں، میں نے عرض کیا، الحمدللہ بس اجازت مل گئی، اور انشاء اللہ اب لاریاں مل جائیں گی، اور دوسرے ہی دن بخیر و عافیت روانگی ہوگئی۔'' (۱)

والد ماجد کا ایمانی جذب وشوق اور عشق ووارفتگی

مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد حضرت حکیم عبدالخالقؒ کا حال بھی کچھ کم نہ تھا، سرزمین پاک حجاز مقدس پہنچ کر مدینہ طیبہ (علی صاحبہا الف الف صلاۃ وسلام) کے راستہ میں ان کی جو کیفیت ہوئی وہ بھی مولانا سید مناظر احسن گیلانی ہی کے قلم سے ملاحظہ کیجئے:

''رابغ جس کا قدیم نام جحفہ تھا اس منزل کی وہ بات دماغ سے نہیں نکلتی، تھوڑی دیر کے لیے یہاں بھی لاری ٹھہرائی گئی تھی، لوگ اتر کر ادھر ادھر ٹہلنے لگے، اس فقیر نے ان جھونپڑوں کے پیچھے اس وقت ایک کافی معمر سفید ریش بزرگ کو اس حال میں پایا کہ دونوں ہاتھ پھیلا کر وجد کے عالم میں کچھ اس قسم کے احساس کا اظہار فرما رہے ہیں کہ

کہاں میں اور کہاں رابغ کی منزل
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

(۱) مکاتیب گیلانی ۱/۲۳۴ مرتبہ: مولانا منت اللہ رحمانی۔

وہ استغراق کے عالم میں جھوم رہے تھے، دل سے باتیں کر رہے تھے، میری آہٹ پاکر سمٹ گئے، یہ بزرگ مولانا عبدالباری صاحب کے والد صاحب قبلہ تھے جواب دوسرے عالم میں ہیں۔''(۱)

دیگر رفقائے سفر

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رقمطراز ہیں:

''جہاز جس کا نام غالباً اکبر تھا، شاید ہزار سے اوپر آبادی کو لیے ہوئے پانی پر ایک مستقل گاؤں کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا، مولانا عبدالباری اوران کے والدین، مولانا عبدالماجداوران کی اہلیہ محترمہ اخت العرفات کے علاوہ حضرت مولانا محمد علی بانی و ناظم ندوۃ العلماء (مونگیری) کے تینوں صاحبزادے مولانا شاہ لطف اللہ مرحوم، مولانا نوراللہ، مولانا منت اللہ، ان کی والدہ اور ہمشیرہ اس خاص تعلق کی وجہ سے جو حضرت مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خاکسار رکھتا ہے (۲) یہ مجمع وحدت کی شکل میں جہاز پر سمٹا ہوا تھا، گویا ایک مختصر سا قافلہ اکیس آدمیوں کا بن گیا، اس کا مادی فائدہ یہ ہوا کہ اکیس آدمیوں کے اس قافلہ میں بعض

---

(۱) دربار نبوت کی حاضری، از مولانا سید مناظر احسن گیلانی ص/۵۲۔

(۲) قطب الارشاد حضرت مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء علم وفضل، روحانیت، بالغ نظری، دور بینی، فراست ایمانی، بصیرت دینی اور دین وملت کے لیے بے چینی اور جذبہ قربانی کسی چیز میں بھی اپنے معاصر علماء ومشائخ میں کم نہ تھے، اسی درد وسوز نے ان سے تحریک ندوۃ العلماء کی داغ بیل ڈلوائی، اور بہار سے قادیانی ومسیحی فتنوں کی بیخ کنی کرائی، ان کے یہ اوصاف ان کی اولاد میں بھی منتقل ہوئے، حضرت مولانا گیلانی کو حضرت مونگیری کی خدمت وصحبت بابرکت میں ایک سال گذارنے کا موقع ملا جس کا انھوں نے ذکر بھی کیا ہے۔(م)

کے پاس فرسٹ کلاس کے بھی ٹکٹ تھے اور زیادہ تر درجہ سوم کے ٹکٹ والے تھے، فرسٹ کلاس کے ٹکٹ والوں کے طفیل میں تھرڈ کلاس والوں کو عرشہ پر قیام کا بھی موقع ملا، اور درجہ اول کے بیت الخلاء، غسل خانہ کے استعمال کا بھی حق حاصل ہوا، یہ بھی ہوتا کہ فرسٹ کلاس والوں کے کیبن (کمرے) کے استعمال کی ضرورت اکیس آدمیوں کے اس قافلہ میں کسی کو اگر ہو جاتی تو اس اجتماعی شکل کا فائدہ یہ بھی ہوتا کہ ضرورت پوری ہو جاتی، یعنی فرسٹ کلاس کے ٹکٹ والے صاحب عرشہ پر چلے آتے اور اپنی جگہ تھرڈ کلاس کے ٹکٹ والے صاحب کو بھیج دیتے، عرشہ میں کیمپ کارڈ کھٹولے سے خوب مدد ملی، اس جہازی بستی کے باشندوں کے لیے ایک ہی مسجد کا انتظام تو ممکن نہ ہو سکا، مگر جماعت کی نماز متفرق جگہوں پر ہوتی رہتی تھی۔"(۱)

مولانا شاہ سید لطف اللہ

بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے صاحبزادے و جانشین صاحب دل اور صاحب علم و عشق ہستی اور متعدد کمالات و خصوصیات کے حامل شخص تھے، یہ حسن اتفاق تھا کہ جہاز میں اپنے حسب پروگرام وہ بھی اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ ہو گئے، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالماجد دریابادی سبھی کے لیے ان کا وجود بڑی مسرت و فرحت کا باعث بنا، مولانا سید مناظر احسن گیلانی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"حضرت کے بڑے صاحبزادہ مولانا لطف اللہ مرحوم سے

(۱) دربار نبوت کی حاضری ص/ ۲۷-۲۹۔

برادری کا تعلق بھی پیدا ہو چکا تھا، میری چھوٹی ہمشیرہ ان سے منسوب ہوئیں، مولانا لطف اللہ مرحوم پر حج وزیارت کا ذوق اس کے بعد اتنی شدت کے ساتھ طاری ہوا کہ اس سفر کے بعد انھوں نے دو سفر حجاز کے اور بھی کیے، آخری حج میں تو اپنے اہل وعیال کے ساتھ سال بھر تک حجاز میں قیام فرمایا، کچھ دن مکہ میں اور کچھ مدینہ میں گذارے، ہندوستان واپس ہوئے تو عمر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، اور شاید ان کی جوانی بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ خاکی زندگی کی مدت ختم ہو گئی، فغفر اللّٰہ له." (۱)

دربار نبوت کی حاضری

جدہ میں ساحل پر جہاز کے لگ جانے کے بعد گروپ اپنے اپنے طور پر الگ ہو گئے، پہلے مکہ مکرمہ کو جانے والے مکہ معظّمہ کو ہو لیے، حج کو ایک ماہ سے زائد کا وقت باقی تھا، مولانا گیلانی کے مشورہ سے ان کے گروپ نے دربار نبوت کی حاضری کو پہل کی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے الفاظ ہیں:

"دل میں جو خیال تھا کب تک دبتا، اسے ظاہر ہی کرنا پڑا، ہمارے رفقاء کی مہربانی تھی کہ ترک رفاقت پر آمادہ نہ ہوئے، خصوصاً ہوش وحواس رکھتے ہوئے جن بزرگوں نے ایک دیوانہ کے مجنونانہ مشورہ کے ساتھ ہم نوائی کی، دل ان کے اس کرم کا اب بھی ممنون ہے۔

---

(۱) دربار نبوت کی حاضری، از مولانا گیلانی، یادش بخیر کہ مولانا سید لطف اللہ صاحب طبقہ علماء ومشائخ میں تھے، جوانی ہی میں ممتاز ہو گئے تھے، ۱۳۲۰ھ میں پیدا ہوئے، ۱۹۲۷ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کی مسند پر بیٹھے، اور خانقاہ رحمانی میں مدرسہ کی بناء ڈالی جو، اب جامعہ رحمانی کے نام سے معروف ہے، ۱۹۴۲ء میں وفات پا گئے۔

بہر حال عجب تماشا تھا، فرنگی کپتان نے گھنٹی بجائی کہ نادیدہ یلملم کے سامنے تمہارا جہاز آ گیا ہے اور لوگ احرام باندھنے میں مصروف ہو گئے، صرف چند دیوانے اور ان کے ساتھ کچھ ہوش والے بھی تھے، جو احرام باندھنے والوں کو حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، دیکھئے ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے، بیچ میں ایک اعتدالی راہ بھی پیش ہوئی کہ عمرہ کی نیت سے مکہ معظمہ حاضر ہو کر زیارت کے لیے مدینہ چلے جائیں، اور حج کے موسم میں مکہ معظمہ پھر واپس ہو جائیں، مگر فقہاء نے لکھا تھا کہ اشہر حج میں مکہ پہنچنے کے بعد حج کرنے سے پہلے مدینہ نہ جانا چاہئے۔

پورا جہاز احرام کے لباس میں تھا، بجز ان چند ہوش حواس باختوں کے جو ساحل جدہ پر عام رواجی غیر احرامی لباس میں اترے تھے، ابھی ایک مہینہ سے زیادہ مدت موسم حج کی آمد میں باقی ہے، اس مدت کو گذارنے کے لیے اکیس آدمیوں کا یہ قافلہ جدہ سے براہ موٹر سیدھے مدینہ منورہ روانہ ہو گیا، ایک ہی لاری میں سب کو جگہ مل گئی۔" (۱)

حال اور کیفیت

حضرت مولانا عبدالباری ندوی مولانا مناظر احسن گیلانی مولانا عبدالماجد دریابادی اور بھی رفقائے سفر کا جو حال تھا وہ یہ کہ بقول مولانا سید مناظر احسن گیلانی:

"دنیا کی تمام نعمتوں میں جن دو نعمتوں کو بعض دیدہ وروں نے سب سے بڑی نعمتیں قرار دیا ہے، آج ہی دو نعمتوں میں سے

(۱) دربار نبوت کی حاضری، ص/۴۳-۴۵۔

ایک نعمت یعنی ''وجود مبارک محمد صلی اللہ علیہ وسلم بصورت حیات در مدینہ موجود است'' ان کے آغوش میں آرہی تھی، جنھوں نے نہیں مانا ہے، ان جھٹلانے والوں سے تو بحث نہیں مگر جو مان چکے ہیں وہ بہرحال یہی یقین رکھتے ہیں اور یہی یقین ان میں پیدا کیا گیا ہے کہ "ذائقة الموت" کی منزل سے گذرنے کے باوجود "الموت" کا اثر صرف اسی قدر ہے کہ اکل وشرب جیسی جسمانی ضرورتوں سے بے نیاز ہوکر "الرفیق الاعلیٰ" کی زندگی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم گذار رہے ہیں، اور پیغمبر تو خیر پیغمبر ہی ہیں۔''(۱)

آگے وہ اپنے قافلہ کا حال بیان کرتے ہیں:

''قافلہ بیر درویش کے بعد قریب قریب اپنے اوسان کھو چکا تھا، فاصلہ ختم ہورہا تھا، زندگی کی آرزو سب سے بڑی آرزو ایمان والوں کی پوری ہورہی تھی یا قریب تھا کہ پوری ہو، اپنے آپ کو معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کھوتا چلا جارہا ہے، اچانک اسی حال میں "مدینة النبی" (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز سواق (ڈرائیور) کی زبان سے نکلی، کلیجے نکل پڑے، جانیں قالب کو معلوم ہورہا تھا کہ چھوڑ دیں گی، بیس سال پہلے کان میں یہ آواز آئی تھی، لیکن اس کی گونج آج بھی تروتازہ ہے، ہم میں سے ہر ایک دوسرے کو شاید بھول گیا، "مدینة النبی" (نبی کا شہر) اس کے سوا نہ اندر ہی میں کچھ باقی تھا نہ باہر میں، لاری تیزی کے ساتھ گذرتی

---

(۱) دربار نبوت کی حاضری، ص/۵۳۔

جارہی تھی، یہ باہر میں ہورہا تھا، اور اندر میں جذبات کا طوفان تھا جو ابل رہا تھا۔''(۱)

دیارِ محبوب میں

مولانا گیلانی اپنا اور اپنے رفقاء قافلہ کا کیا خوب نقشہ کھینچتے ہیں:

''ایک ہفتہ کے بعد دل کی کیفیت یہ ہوگئی کہ مدینہ کے سوا کچھ یاد نہ رہا، ہندوستان کے اعزاء واقرباء، جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری، ہر چیز دماغ سے نکل گئی، یہ قطعی فیصلہ دل کا ہوا، زبان کا ہوا، ذائقہ کا ہوا، کہ جو پانی پینے کے لیے مل رہا ہے نہ پہلے کبھی کسی ملک میں ملا تھا اور نہ آئندہ ملے گا، نہ اتنا مینو سواد ماحول نہ یہ رعنائیاں، یہ زیبائیاں، کہیں اور میسر آئیں گی، نیند جیسی وہاں آتی ہے کہیں نہیں آتی، سرور ونشاط دل سے جتنا لبریز ہوا کبھی نہیں ہوا، دوسروں سے پوچھتا تھا تو وہ بھی یہی کہتے تھے، جنت میں داخل ہوجانے کے بعد اس سے باہر ہونے کی حماقت میں کون مبتلاء ہوگا، دل اس سوال کو اٹھاتا۔''(۲)

رؤیائے صادقہ

مولانا سید مناظر احسن گیلانی ہوں کہ وہ تو تنہا عازم حج ہوئے تھے، یا مولانا عبدالماجد دریابادی اور ان کی اہلیہ، اور مولانا عبدالباری ندوی اور ان کے والدین سبھی کا حال عجیب وغریب، مومنانہ، عاشقانہ تھا، کوئی کسی سے کم نہیں تھا، مگر ہر ایک اپنے کو دوسرے سے کم ہی سمجھ رہا تھا، کیا ہی مبارک تھا قافلہ جس کا ہر فرد تھا مقبول بارگاہ

(۱) دربارِ نبوت کی حاضری، ص/۵۶-۵۷۔

(۲) ایضا، /۶۵۔

ایزدی، ایک سے ایک خواب نظر آرہے تھے، جو نظر آیا پورا ہوا، مولانا عبدالماجد دریابادی کی اہلیہ نے مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی والدہ کو اسی سفر زیارت وحج میں ساتھ دیکھ لیا تھا، خواب سنتے ہی مولانا سید مناظر احسن گیلانی پر ان کے حج بدل کرنے کا ایسا غلبہ اور تقاضا ہوا کہ اس کے لیے ایک کو (بمشورہ مولانا سید احمد برادر مولانا حسین احمد مدنیؒ) تیار ہی کرلیا، بقول مولانا گیلانی:

''مولانا نے ایک صاحب کو تیار کیا، مدینہ منورہ سے میرے ساتھ چلنے کا وعدہ انھوں نے بہ نیت حج بدل فرمالیا۔''(۱)

دوسرا واقعہ بھی عجیب وغریب انداز سے اس طرح پیش آیا کہ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ جانے کے لیے عین وقت پر کچھ ایسی رکاوٹیں پیش آنے لگیں جس سے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں حج کی تاریخ نہ نکل جائے، اور حج جس کے لیے آئے تھے وہی رہ جائے، مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے الفاظ ہیں:

''اب وقت بالکل سر پر آگیا، ارادہ پہلے سے تھا کہ پہلی ذوالحجہ کو ہمارا قافلہ مدینہ منورہ سے نکل پڑے گا، مگر لاری والوں کی طرف سے کچھ ایسے معاملات پیش ہونے لگے کہ دل دھڑکنے لگا، آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں، بات ٹلنے لگی، ہاتھ پاؤں پھولنے لگے، کیا ہوگا، کیا ہم نصیبوں کے مقدر میں حج نہیں ہے، سب سے زیادہ متاثر فقیر تھا کہ اسی کے اشارہ سے لوگ مدینہ چلے آئے تھے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، کہ لاری والوں کے ساتھ کیا کیا جائے، حکومت کی زنجیر بھی کھٹکھٹائی گئی، مگر وہاں سے بھی چنداں حوصلہ افزا جواب نہ ملا، پریشانی کا عجب عالم تھا۔''(۲)

---

(۱) دربار نبوت کی حاضری، ص/۷۱۔

(۲) ایضا، ص/۷۲۔

یہ پریشانی کیسے عجیب وغریب انداز سے دور ہوئی اس کا واقعہ بھی خود مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے ہی الفاظ میں سنئے:

''رات کا وقت تھا، رباط جس میں مولانا عبدالباری ان کے والد، والدہ کے ساتھ یہ فقیر بھی مقیم تھا، سب سوئے ہوئے تھے، اسی فکر میں سوئے تھے کہ دیکھئے کل کیا صورت پیش آتی ہے، کیونکہ غالباً ذوالحجہ کی ۳ بھی گذر چکی تھی، ۴ر تاریخ تھی، تین بجے کا وقت ہوگا، ہم لوگوں سے دور مولانا کی والدہ آرام فرما رہی تھیں، کہ اچانک ان کی طرف سے ''پیارے پیارے'' کی آواز بھرائی ہوئی آنے لگی، یہ مولانا عبدالباری کا خانگی نام بچپن کا تھا، ان کی والدہ اب بھی زیادہ تر اسی نام سے مولانا کو پکارتی تھیں، میری آنکھیں بھی کھل گئیں، اور مولانا والدہ کے پاس دوڑے ہوئے پہنچے، کیا ہے اماں؟ کیا ہے اماں؟ ان کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں، ان ہی ہچکیوں میں ملی ہوئی آواز کے ساتھ فرما رہی تھیں:

''میں نے ابھی خواب دیکھا ہے، دیکھا کہ ایک بزرگ ہیں، دل میں القاء ہوا کہ خود مدینہ والے سرکار ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم، سامنے لاری کھڑی ہے، ہم لوگوں کا اسباب بھی پڑا ہوا ہے، حکم دیا جا رہا ہے کہ ''ان مسافروں کو جلد سوار کرو، ان کو فوراً حج کے لیے مکہ پہنچاؤ۔''

یہ یا کچھ اسی قسم کے الفاظ تھے، شاید یہ بھی مولانا کی والدہ ماجدہ نے فرمایا کہ ''خود ہی کچھ اسباب کو اٹھا اٹھا کر لاری میں دیکھا کہ وہ ڈال رہے ہیں۔

گفتی سر تو بستہ فتراک ما سزد
سہل است اگر تو زحمت ایں بار می کشی

خاکسار بھی سن رہا تھا، ہوش جاتے رہے، چیخ نکل گئی، مولانا کے والد بھی بیدار ہو گئے، اب کسی کو کسی کی خبر نہ تھی، یہ کیا ہے، یا اللہ یہ کیا ہے؟ گریہ وزاری میں رات کٹی۔

نظر جانب ہر گنہ کار واری

کے تجربوں کا اعادہ مسلسل ہو رہا تھا، صلوات اللہ علیہ وسلامہ، کہاں ہندوستان کے چند ٹوٹے پھوٹے نام کے مسلمان، حقیر ذرے، اور کہاں غیب وشہادت کا آفتاب عالمتاب، مرکز کائنات ایمان کے ساتھ حاضر ہونے والوں کو سلامتی کی دعا سے سرفرازی بخش جائے، اس قرآنی حکم کی تعمیلی شکل کا یہ کتنا اچھا مشاہدہ تھا، ایمان کے ساتھ ایمان کے عملی اقتضاؤں کی تکمیل کرنے والے کن نوازشوں سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں، ان کا کون اندازہ کر سکتا ہے، خالق کائنات کے ساتھ نسبت کی تصحیح کائنات کے ذرہ ذرہ کی نسبت کو درست کر دیتی ہے، اس راز کو وہ کیا پا سکتے ہیں جو مخلوق سے مستفید ہونے کے لیے مخلوق ہی کو پوج ڈالتے ہیں، وہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ خالق سے دور ہو کر اسی خالق کی مخلوق سے کیسے قریب ہو سکتے ہیں۔"(۱)

دربار نبوتؐ سے اللہ کے دربار کی طرف

مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے دربار نبوت کی حاضری کا اختتام بھی خوب

---

(۱) دربار نبوت کی حاضری، ص/۷۳-۷۴۔

دل سے اور عشق ومحبت میں ڈوب کر لکھا ہے، اور بحیثیت امتی کے ایک ایک حق ادا کرنے کی اچھی کوشش کی ہے، اور اللہ کے دربار کی طرف اپنے قافلہ کے کوچ کرنے کا خوب نقشہ کھینچا ہے، وہ ملاحظہ ہو:

''خیر صبح ہوئی، مسجد نبویؐ میں نماز ادا کر کے واپس لوٹ رہے تھے کہ راستہ میں کمپنی کا نمائندہ ملا، تیار ہو جاؤ، لاری بس اسی وقت کھلے گی، مسرت کی لہر دوڑ گئی، قافلہ کے لوگ تیار ہو گئے، سوار ہو گئے، اور ۴ر ذوالحجہ کو مدینہ منورہ میں تھے، شاید ۵ر کی شام کو وہ مکہ معظمہ میں گلیوں میں گھوم رہے تھے ؎

مور مسکیں ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد
دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

کا قصہ بجائے قصہ کے واقعہ بنا ہوا تھا، شاید ڈیڑھ دن میں راستہ طے ہوا، نکلنے کا خیال تو دل سے پہلے ہی نکال دیا گیا تھا، اس لیے مدینہ سے نکلنے پر جس کیفیت کا اندیشہ تھا، الحمدللہ کہ وہ طاری نہ ہوئی، ذوالحلیفہ (بیر علی) میں گاڑی رکی، سامنے مسجد تھی، مسجد کے پاس صاف وشفاف پانی سے بھری ہوئی ایک کافی عریض وعمیق باوڑی تھی، خوب نہائے، تیرے اور مسجد میں آکر احرام باندھا، الفاظ کہاں ہیں جو شکر وامتنان کے جذبات کی ترجمانی کی گنجائش رکھتے ہوں ؎

جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ کہ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

مدینہ منورہ کی منزل ختم ہوگئی، رسولؐ کے دربار سے باریاب ہو کر

اب اللہ کے بندے اللہ کے دربار میں تھے۔" (۱)

ایک نظر دیار محبوب کی طرف اور بھی

کیسے خوش کن دل فریب، سکون واطمینان، محبت و وارفتگی اور ایمان و یقین کے لمحات ان حضرات نے طیبہ میں گذارے اس کو بھی مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے ہی الفاظ میں بخوبی سمجھا جاسکتا ہے، ان کے الفاظ ہیں:

"سچی بات تو یہی ہے کہ ہر طرف یہاں بجلی ہی بجلی، برق ہی برق، نور ہی نور تھا، صرف روشنی تھی، تاریکی کا نام نہیں تھا، صرف سکون تھا، بے چینی کا پتہ بھی نہیں تھا، صرف محبت تھی، محبت ہی محبت کا چشمہ فوارہ کی طرح اچھل رہا تھا، ابل رہا تھا، صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ اجمعین." (۲)

طیبہ کی آخری بات

مولانا عبدالباری ندوی، ان کے والدین ماجدین اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدینہ منورہ میں ایک ہی مقام پر مقیم رہے، یہ چار لوگ تھے جن کے قیام و طعام کا نظم مشترک تھا، یہ مشترک نظم اور بھی تعلق ومحبت کا باعث بنا، آخر میں جب حساب مولانا عبدالباری ندوی نے کیا تو وہ اتنا کفایتی تھا کہ ہر ایک حیرت زدہ اور خود مولانا عبدالباری ندوی بھی حیران رہ گئے، تفصیل مولانا گیلانی کے الفاظ میں سنئے:

"ہاں! ایک آخری بات بھی سن لیجئے، مدینہ منورہ پہنچ کر اکیس آدمیوں کا یہ قافلہ مختلف قیام گاہوں میں تقسیم ہوگیا، مولانا عبدالباری ان کے والدین اور فقیر کا قیام ایک جگہ تھا، قیام کے

---

(۱) دربار نبوت کی حاضری، ص/۷۵-۷۶۔

(۲) ایضاً ص/۷۸۔

ساتھ ساتھ ہم چاروں کے طعام کا نظم بھی مشترک تھا، روانگی سے پہلے حساب کیا گیا کہ ایک مہینہ تین دن میں طعام کے مصارف کیا ہوئے، کھانے میں فراخدلی اور وسعت سے کام لیا جاتا تھا، ناشتہ میں چائے کے سوا کباب، انڈے، دہی اور طرح طرح کی چیزیں بھی شریک رہتی تھیں، یہ صحیح ہے کہ غیر تاریخی گرانی جس کا تجربہ جنگ عظیم کے بعد والی جنگ اعظم کے بعد دنیا کو ہوا ہے، اس کا ذکر تو شاید بنی نوع انسانی کو تاریخ کے کسی دور میں اس کا سان گمان بھی نہ ہوا ہوگا، اور موجودہ زمانہ کے لحاظ سے نسبتاً ارزانی ہی تھی، لیکن جنگ اعظم نہ سہی، یہ سفر ہم لوگوں کا جنگ کے بعد ہوا تھا، عرب جنگ عظیم سے غیر معمولی طور پر متاثر تھا، مسلسل انقلابیوں سے اس ملک کو گذرنا پڑا تھا، عربوں کو پیار کرنے والی حکومت ترکی کا اقتدار عرب سے ختم ہو چکا تھا، بھاؤ تو اب یاد نہیں رہا، مگر پھر بھی غیر معمولی گرانی ہی تھی۔

مگر مولانا عبدالباری صاحب نے جب حساب کیا تو وہ کچھ بھچکے سے ہو کر رہ گئے، میں بھی سن کر حیران تھا، جب مولانا فرمانے لگے کہ ایک مہینہ تین دن کی اس پوری مدت میں فی کس آٹھ روپیہ کا حساب پڑتا ہے، کل آٹھ روپئے، جس میں کھانا بھی ہے اور ناشتہ بھی اور چائے بھی، کچھ تکلفات بھی، بار بار میزان کی جانچ کی گئی، مدوں کو دیکھا گیا لیکن آٹھ سے آگے یہ عدد کسی طرح نہ بڑھا، مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ مہمانی میں درحقیقت یہ سارے دن گذر گئے، آٹھ کا عدد بھی صرف ''پردہ'' تھا۔

اس محسن کریم کے قربان جایئے
احسان جس کا صورت احسان میں نہ تھا

اللّٰھم صل وسلّم و بارك علیه و علی آله وصحبه وأهل بیته أجمعین. وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه رب العالمین.(۱)

لبّیك اللّٰھم لبّیك

مکہ مکرمہ حاضری ہونی ہے تو وہ عاشقانہ ہوگی، دو بے سلی چادریں، گویا کفن بردوش، سر کھلا ہوا، پاؤں کو بھی ڈھکنا نہیں ہے، یہ صدا لگاتے ہوئے: لبیك اللهم لبیك، لبیك لا شریك لك لبیك، إن الحمد والنعمة لك والملك، لا شریك لك لبیك. کہ میں حاضر ہوں، بارالٰہا حاضر ہوں (مخلصانہ وعاشقانہ حاضری ہے) کوئی بھی تیرا شریک نہیں، حاضر ہوں، واقعی ساری تعریفوں کا سزاوار تو ہی ہے، نعمتیں سب کی سب تیری ہی ہیں، حکومت واقتدار بلاشرکت غیرے تیرا ہی ہے، حاضر ہوں۔

یہ حال ہو، یہ عاشقانہ مجنونانہ کیفیت ہو، بے چینی بیتابی بیقراری آخر کس کے لیے ہے؟ اسی ایک اللہ رب العالمین کے لیے تو، جس نے بلایا تبھی تو حاضر ہوگیا، اور وہ بھی کہاں؟ اسی کے در پر، اسی کی چوکھٹ پر، کہاں سے؟ اپنے گھر سے، کہاں کو؟ اللہ کے گھر کو، جو خالق بھی ہے اور پالنہار بھی، اور پھر ہر چیز کا مالک، ہر چیز پر قادر، اور بدلہ کے دن کا مالک بھی، کیسے اس کو ترس نہ آئے، کیوں رحم نہ آتا، کیونکر توبہ نہ ہوتی، کہ سب سے کٹ کر ایک اسی کی طرف آیا جارہا ہے، یہاں تو رحمت بھیجنے کا ایک محرک اور بھی ہوگیا کہ دیار حبیب سے رب العالمین کے دربار کی حاضری ہے، محبوب رب العالمین کا مہمان بن کر اللہ رحمٰن ورحیم کا مہمان بنا جارہا ہے، وارے خوش نصیبی ان مہمانوں کی، کیسے نہ اس خوش نصیبی پر یہ معزز مہمان اپنا دل نکال کر رکھ دیتے، جبکہ ان

---

(۱) دربار نبوت کی حاضری، ص/۷۹-۸۰ (مطبوعہ مدینہ منورہ ومکتبہ الفرقان لکھنؤ)

میں ہر ایک یوں بھی معزز تھا، کہ تقوی و پارسائی، طہارت ظاہری و باطنی ان کا شعار بنی ہوئی تھی، جبکہ خود اللہ جل جلالہ کا یہ ارشاد بھی ہے: "إن أكرمكم عند الله أتقاكم".

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے دل کے ٹکڑے سامنے آچکے، دربار نبوت کی حاضری کی کہانی ان ہی کی زبانی رہی، اب مولانا عبدالماجد دریابادی کے شہ پارے بھی سامنے آجائیں، شہ پارے کیا اس سے بھی بڑھ کر کہ آدمی پڑھتا جائے اور سر دھنتا جائے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی شہادت واعتراف پہلے ملاحظہ کر لیجئے، وہ لکھتے ہیں:

> "۱۹۲۹ء میں مولانا نے حج وزیارت سے فراغت حاصل کی، اور وہ سفرنامہ ان کے قلم سے نکلا جو نہ صرف ان کی تحریروں بلکہ ان لاتعداد کتابوں میں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، امتیاز خاص رکھتا ہے،(۱) جہاں تک یاد ہے یہ مولانا کی پہلی کتاب تھی، جو میں نے بڑے شغف وانہماک کے ساتھ پوری پڑھی، پڑھتا تھا، اور مولانا کے زور قلم اور البیلے طرز تحریر پر جس میں ادب اور واردات قلب کا نہایت حسین اور دلآویز امتزاج ہے، جھوم جھوم جاتا تھا۔"(۲)

مکہ کی قیام گاہ سے خانہ خدا کی طرف

"..... مولوی شاہ لطف اللہ صاحب کی پانچ آدمیوں کی جماعت

---

(۱) یہ سفرنامہ سفر حجاز کے نام سے بار بار مختلف مکتبوں اور اکیڈمیوں سے شائع ہوتا رہا ہے، حاجی منظور علی صاحب لکھنوی ثم کلکتوی (جواب اپنے رب کے حضور پہنچ چکے ہیں رحمہ اللہ تعالیٰ وغفرلہ) نے ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ سے اور مولانا فضل ربی ندوی صاحب نے مجلس نشریات اسلام کراچی سے شاندار طباعت کے ساتھ اور اب صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ نے پھر سے بڑے اہتمام سے اعلیٰ طباعت کے ساتھ طبع کیا ہے، اس کے بعض اجزاء کا عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے، جو کہ پسند کیا گیا، اور سعودی عرب کے وزارت حج کے ترجمان مجلہ "الحج والعمرۃ" میں کچھ حصہ شائع بھی ہوا ہے، جس کی بڑی قدر ہوئی۔

(۲) پرانے چراغ ۲/۱۴۶۔

یہاں سے علاحدہ ہوگئی اور ہم ۱۶ رمرد وزن چار اعرابیوں پر سوار ہوکر چلے، حرم شریف کا نیز حیدرآبادی رباطوں کا فاصلہ یہاں سے ڈیڑھ میل دور تھا، ٹھہرنے کے لیے مقامات پیش نظر تھے، اور سب سے بڑھ کر مولوی محمد سلیم صاحب کا خلوص ومحبت سے بھرا ہوا دعوت نامہ مدرسہ صولتیہ سے متعلق موجود تھا(۱)، لیکن معلم سے معلوم ہوا کہ مدرسہ کا فاصلہ حرم سے اچھا خاصا ہے، پنج وقتہ حاضری نہ ہوسکے گی، اس لیے طے پایا کہ پہلے رباط حیدرآباد میں چل کر قیام کیا جائے اس کے بعد دیکھا جائے گا، یہ رباط مسفلہ میں واقع ہے، کئی درجوں کی وسیع عمارت مگر اس وقت ماشاء اللہ خوب کچھا کھچ بھری ہوئی ہے، اس کے مہتمم داروغہ حبیب اللہ صاحب خوش خلق، مستعد، کارگزار خدمت کرکے خوش ہونے والے، حرم سے یہ عمارت کوئی تین فرلانگ کے فاصلہ پر نہر زبیدہ کا ایک پائپ عین اس کے دروازہ پر اور یہ مکہ کے لئے ایک خاص نعمت ہے، ہندوستان والوں کو پانی کی اس اہمیت کا اندازہ کہاں؟

سکندر ذوالقرنین تو کہتے ہیں کہ حضرت خضر کی رہنمائی کا محتاج تھا، یہ سکندر ''مطوف'' خود ہادی ورہنما بن کر ہمراہ ہوئے، گدھے پر سوار، ہماری اعرابی کے ساتھ ساتھ باآواز بلند دعائیں

---

(۱) مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں یوپی والوں کی گویا رباط جیسے رباط حیدرآباد، رباط بھوپال، رباط ٹونک وغیرہ اس مدرسہ کے اس وقت کے ناظم مولانا محمد سعید صاحب ہندوستان ان دنوں آئے ہوئے تھے، انھوں نے اپنے صاحبزادہ مولانا محمد سلیم صاحب کو خط تحریر کردیا اور ان حضرات کے ساتھ خصوصیت برتنے کو کہا تھا۔ (م) ملاحظہ ہو: سفر حجاز از: مولانا عبدالماجد دریابادی

پڑھتے جاتے ہیں، اور ہم لوگ انھیں الفاظ کو دہراتے جاتے ہیں، اب تو یہ خیال نہیں کہ انھوں نے کونسی دعائیں پڑھائی تھیں البتہ کتابوں میں اس قسم کی دعائیں منقول ہیں۔'' (۱)

مسجد حرام و کعبہ مقصود

'' ..... لیجئے مسجد حرام کی چار دیواری شروع ہوگئی، کئی دروازے چھوڑتے ہوئے لوگ باب السلام سے اندر داخل ہوئے، (داخلہ کے لیے یہی دروازہ بہتر مانا گیا ہے) کس کے اندر داخل ہوئے؟ اس ارض پاک کے اندر، اس بقعۂ نور کے اندر جہاں کی ایک نماز ایک لاکھ یا کم از کم ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے، اندر داخل ہوتے ہی نگاہ اس سیہ غلاف والی عمارت پر پڑی جسے خشکی اور تری میں نہ سما سکنے والے نے، زمین و آسمان، عرش و کرسی کی سمائی میں نہ آنے والے نے، وہم و خیال کی وسعت میں نہ گھرنے والے نے، اپنا گھر کہہ کر پکارا ہے، نگاہ پڑی اور پڑتے ہی جہاں پڑی تھی وہیں جم کر رہ گئی، اس گھڑی کی کیفیت کیا اور کن لفظوں میں بیان ہو۔'' (۲)

پہلا طواف

''یہی بیت تھا جس کا طواف شروع ہوا، معلم عبدالقادر اسکندر اپنے ہمراہ مطاف کے اندر لائے اور سارے قافلہ کو اپنی رہنمائی میں طواف کرانا شروع کیا، ہجوم اچھا خاصا تھا لیکن مطاف بھی

---

(۱) سفر حجاز از مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۱۹۸ مطبوعہ ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ سنہ طباعت ۲۰۰۶ء

(۲) ایضاً ص ۲۰۶

ماشاء اللہ خوب وسیع ہے، زیادہ کشمکش نہیں ہونے پائی، اور اگر نجدی وبدوی حجاج اپنے کو ذرا قابو رکھیں تو اتنی بھی کشمکش نہیں ہونے پائے، خود معلمین بھی خاصی بے احتیاطی کرتے رہتے ہیں، اور لوگوں کو ڈھکیلتے اور دھکے دیتے رہتے ہیں، آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، بس ایک شے کے علاوہ مطاف ہر طرح پر بڑے امن اور دلچسپی کی جگہ ہے، بوڑھے، جوان، بچے، عورتیں، تندرست وتوانا، کمزور ولاغر سبھی طرح کی خلقت ہے، سب اپنے چکر میں مصروف، جو بوڑھے یا بیمار اپنے پیروں پر طواف نہیں کر سکتے ان کے لیے اجازت ہے کہ شبری پر طواف کریں، یہ ایک طرح کا کھٹولا ہوتا ہے، جسے جوان تندرست مزدور اپنے سروں پر اٹھائے رہتے ہیں، بہت سے بیماروں کو اس طرح لیٹے لیٹے طواف کرتے دیکھا، ناواقف حاجیوں کو تو معلم کے بغیر چارہ ہی نہیں، اچھے خاصے پڑھے لکھے بھی پہلی دفعہ چکر میں آجاتے ہیں، البتہ ایک مرتبہ واقف ہو جانے کے بعد پھر زیادہ دقت نہیں رہتی، بہتر یہ ہوگا کہ مناسک کی کتابیں پہلے سے ضرور دیکھ لی جائیں، ہم لوگ تو بالکل معلم کے ہاتھ میں تھے، جہاں سے انھوں نے شروع کرایا، شروع کیا، اور جہاں پر انھوں ختم کرایا ختم کیا، رمل اور اضطباغ وغیرہ سب انھیں کی ہدایت کے مطابق کرتے رہے، ایک چکر، دو چکر، تین چکر، لیجئے آدھ گھنٹہ کے اندر پورے ساتوں چکر ختم ہو گئے، اور ہم لوگ طواف ختم کر کے ﴿وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى﴾ پڑھتے ہوئے مقام

ابراہیم کی طرف بڑھے۔"(۱)

سعی

"عصر کا وقت آخر ہورہا تھا، جب ہم لوگ طواف متعلقات طواف سے فارغ ہوکر "سعی" کے لیے باہر نکلے، سعی کے لفظی معنی تیز چلنے یا دوڑنے کے ہیں، اصطلاح میں سعی نام ہے صفا و مروہ کے درمیان سات پھیرے کرنے کا، سعی کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے خانہ کعبہ میں حجر اسود کو بوسہ دے اس کے بعد باب بنی مخزوم سے یا کسی اور دروازے سے حرم شریف سے باہر نکلے اور ان مقامات کے درمیان سات پھیرے کرے، اس طرح کہ پہلا پھیرا صفا سے شروع ہو اور ساتواں پھیرا مروہ پر ختم ہو، صفا و مروہ کسی زمانہ میں اونچی پہاڑیاں تھیں، مائی ہاجرہ پانی کی تلاش میں مضطر و بیقرار ہوکر ان ہی پہاڑیوں پر چڑھ چڑھ کر دیکھتی تھیں کہ شائد دور سے کسی قافلہ پر نظر پڑ جائے اور اس سے پانی حاصل ہو جائے، اب تو پہاڑیاں باقی نہیں رہیں، معمولی بلندی کے چبوترے سے کچھ رہ گئے ہیں، حضرت ہاجرہ سات ہی پھیرے کرنے پائی تھیں کہ شیر خوار، نور نظر کی ایڑیوں کے نیچے سے پانی کا چشمہ ابلنے لگا تھا، اور اس صدیقہ کی سعی ختم ہوگئی تھی، بس اس سعی کی یادگار آج تک قائم چلی آرہی ہے، اللہ والوں اور اللہ والیوں کا مرتبہ ذرا دیکھنا، طالب خود اس راہ میں مطلوب بن جاتے ہیں، ہاجرہ صدیقہ نے زندگی میں ایک بار سات پھیرے

(۱) سفر حجاز از مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۲۲۵ مطبوعہ ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ سنہ طباعت ۲۰۰۶ء

کئے تھے، اس کی یادگار میں اس ساڑھے تیرہ سو برس کی مدت میں کتنے لاکھ، کتنے کروڑ، کتنے ارب، کتنے پھیرے اس راہ پر اپنے دربار میں حاضری دینے والوں سے کرائے جا چکے ہیں، اور دنیا کا کوئی ریاضی داں حساب لگا سکتا ہے کہ قیامت تک ان پھیروں اور پھیرے کرنے والوں کی تعداد کہاں تک پہنچ جائے گی، سالہا سال صدیاں گذر چکی ہیں، اور ہاجرہ کے نقش قدم پر چلنے والوں کا تانتا ہے کہ کسی کے توڑے نہیں ٹوٹتا۔'' (۱)

سعی کے بعد

''لیجئے جن رفیقوں کا میری طرح حج تمتع تھا ان سب کا عمرہ ختم ہو گیا، اس وقت کی خوشی کا کیا پوچھنا، عمرہ سے فراغت کیا ہوئی یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خزانہ مل گیا ہے، ہنستے ہوئے چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کو مبارکباد دی جانے لگے، طویل سفر سے چلے آرہے تھے، اور آتے ہی طواف وسعی میں مشغول ہو گئے تھے، خوب تھکے ہوئے تھے، لیکن دل کے انبساط نے جسم کے تکان کو بڑی حد تک رفع کر دیا، پیاس کی شدت میں شربت کے گلاس خوب برف ڈال ڈال کر پئے گئے، اور اسی وقت بجلی کی روشنی میں ایک حجام کی آراستہ وشاندار دوکان میں سر منڈائے گئے، اور بال کتروائے گئے، مغرب کے وقت کو ابھی آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ ہوا تھا۔'' (۲)

---

(۱) سفر حجاز از مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۲۳۴ مطبوعہ ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ سنہ طباعت ۲۰۰۶ء

(۲) ایضاً ص ۲۳۹

احرام حج

جولوگ قارِن تھے ان کے احرام تو بندھے ہوئے تھے ہی، انھیں کسی جدید احرام کی ضرورت نہیں تھی، باقی دوسرے لوگوں کو ۸ر ذوالحجہ کی صبح کو احرام باندھ کر روانہ ہونا چاہئے لیکن اس کے قبل ہی احرام باندھ لیا جائے تو بہتر ہے، اور فقہاء نے اسے مستحسن لکھا ہے، مولانا شفیع الدین مدظلہ (۱) نے بھی یہ خاص طور پر ارشاد فرمایا تھا کہ احرام ۷ر اور ۸ر کی درمیانی شب میں بعد عشاء حرم شریف ہی بلکہ حطیم کے اندر باندھ لینا۔'' (۲)

''بہر حال مولانا کے ارشاد کے ایک جزو کی تعمیل ہوگئی یعنی احرام کے لیے ۸ کی صبح کے طلوع ہونے کا انتظار نہیں کیا گیا بلکہ شب ہی میں باندھ لیا گیا، البتہ اس کے لیے مقام حطیم نصیب نہ ہوسکا، مغرب وعشاء کی نمازوں کے وقت حرم شریف کے اندر ایک خاصی تعداد احرام پوشوں کی نظر آئی۔'' (۳)

منیٰ کی طرف

''۸ ذی الحجہ جمعہ سہ پہر ہم لوگوں کو چلنے میں اس قدر تاخیر ہوئی کہ وقت مستحب نکل چکا، ہزارہا قافلے آگے جاچکے پھر بھی بہت

---

(۱) مولانا شفیع الدین بجنوری نگینہ کے رہنے والے تھے، مکہ مکرمہ میں نصف صدی سے مقیم ایک مرتاض بزرگ تھے، شادی نہیں کی تھی، مکہ مکرمہ آئے تو پھر وطن واپس نہیں گئے، حضرت حاجی امداد مہاجر مکیؒ کے خلیفہ تھے۔

(۲) حطیم خانہ کعبہ کا ہی اس کے شمالی جانب ایک ایسا حصہ ہے جس پر نصف قد آدم دیواریں ہیں مگر چھت نہیں ہے، اس میں بھی اللہ کی بڑی مصلحت ہے عوامی مفاد کے لیے۔ (ص ۲۴۴)

(۳) سفر حجاز از مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۲۴۵ مطبوعہ ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ سنہ طباعت ۲۰۰۶ء

سے باقی رہ گئے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ چل بھی رہے ہیں، ہزاروں انسان پیدل چل رہے ہیں، ہزار ہا اونٹوں پر سوار ہیں اور ہزار ہا خچروں اور گدھوں پر، ہر شخص احرام پوش، لبیک لبیک کی صدا ہر طرف سے چلی آرہی ہے۔

.....قافلہ کے آٹھوں اونٹ ۱۶ رسواروں کو لیے ہوئے ایک دوسرے کے آگے پیچھے، دو یا تین بدو ہمراہ، ہر اونٹ کے ساتھ ایک شتربان نہیں ہوتا، تین تین چار چار اونٹوں کے لیے بس ایک ہی بدو کافی سمجھا جاتا ہے، ایک اونٹ پر ہم میاں بیوی، ایک پر مولانا مناظر احسن صاحب اور حکیم عبدالخالق صاحب، اسی طرح دو دو سواریاں باقی سب پر، اونٹ پر سوار ہونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔"(۱)

منیٰ میں

"ظہر کا وقت آخر ہو رہا تھا، جب مکہ معظمہ سے چلے تھے، عصر کا اوسط وقت گذر چکا تھا جب منیٰ پہنچے، کل صبح عرفات کے لیے روانہ ہونا ہے، مسنون طریقہ یہ ہے کہ ۸ ذی الحجہ کی ظہر سے لے کر ۹ کی فجر تک پوری پانچ نمازیں منیٰ میں ادا کرے، اور اسی لیے ۸ کو ہم لوگ مکہ سے صبح سویرے چلنے کی اس قدر عجلت کر رہے تھے لیکن معلم صاحب کا خدا بھلا کرے محض ان کی عنایت سے ہم لوگ ایسے وقت یہاں پہنچے کہ جمعہ وظہر کا وقت الگ رہا عصر کا بھی اول وقت کچھ دیر ہوئی رخصت ہو چکا تھا،

---

(۱) سفر حجاز از مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۲۵۱ مطبوعہ ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ سنہ طباعت ۲۰۰۶ء

خیموں کی طرف سے تو معلم صاحب چلتے وقت مایوس ہی کر چکے تھے، سڑک کے کنارے میدان میں ہمارے شغدف اتار کر رکھ دیئے گئے اور ہم کو حکم ملا کہ اس سہ پہر سے لے کر کل صبح تک کا وقت انھیں شغدفوں کے اندر یا ان کے باہر آسمان کی چھت کے نیچے اور زمین کے فرش کے اوپر بسر کرنا ہے۔'' (۱)

عرفات کا دن

''آج کا دن خاص فضیلتوں اور برکتوں کا، رحمتوں اور نوازشوں کا دن ہے، راستہ میں جس قدر بھی ہو سکے تلبیہ و تکبیر، درود و استغفار جاری رہنا چاہئے، سعادت کی یہ گھڑیاں اگر عمر میں ایک بار بھی نصیب ہو جائیں تو خوش نصیبی ہے۔

..... لیجئے عرفات کے حدود شروع ہو گئے، ایک لق و دق میدان، مبصروں کا اندازہ ہے کہ دس میل مربع سے کیا کم ہوگا، جہاں تک نظر کام دیتی ہے میدان ہی میدان اور اردگرد پہاڑیاں اور اونٹوں کی تعداد حساب و شمار سے خارج اور خیموں کا گویا ایک جنگل لگا ہوا ہے، ہر طرف خیمے ہی خیمے، جن کو خیمہ کی استطاعت نہیں انھوں نے معمولی چادریں تان رکھی ہیں، بعض جن کو یہ بھی نصیب نہیں بیچارے دھوپ میں پناہ لینے کے لیے شغدفوں کے نیچے گھسے ہوئے ہیں، دوپہر سے کچھ قبل کوئی گیارہ پونے گیارہ کا وقت ہوگا کہ ہم لوگ پہنچ گئے۔'' (۲)

---

(۱) سفر حجاز از مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۲۵۳-۲۵۴ مطبوعہ ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ سنہ طباعت ۲۰۰۶ء

(۲) ایضاً ص ۲۵۹

حج پورا ہوا

''اپنے خیمہ میں ہی مختصر سی جماعت مل گئی، مولانا مناظر صاحب ہر موقع کی طرح آج بھی ہمارے قافلہ میں سب سے زیادہ نصیب ور رہے، نماز پڑھنے مسجد نمرہ گئے، واپسی میں خیمہ کا راستہ بھول کر خدا جانے کہاں کہاں بھٹک گئے، اور ساتھیوں سے گم ہو کر یہاں کی تنہائیوں اور خلوتوں میں کیا کیا پالیا، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ. کی تصدیق ایک بار پھر ہو کر رہی، ہدایت ایسے ہی کھوئے ہوؤں کے نصیب میں آتی ہے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى.

ہم لوگ یہاں قبل دوپہر پہنچ گئے تھے، دوپہر ہوتے ہوتے جنہیں غسل کرنا تھا وہ غسل سے اور باقی وضو کر کے تیار ہو گئے، ۱۶/آدمیوں کے لیے دو خیمے تھے، ایک خیمہ میں خاص میرے قافلہ کے آٹھ آدمی (مرد و زن) آ گئے، دوسرے میں بقیہ آٹھ آدمی رہے۔''(۱)

''.....اعمال حج کا رکن اعظم یہی وقوف عرفات ہے، جس وقت سہ پہر کو (اندازہ کے لیے اوسط وقت عصر سمجھئے) امام خطبہ پڑھ چکتا ہے تو وہ وقت عجیب مسرت کا ہوتا ہے ''حج ہو گیا'' ''حج ہو گیا'' کی صدائیں ہر طرف سے آنے لگتی ہیں، اور ایک دوسرے کو مبارکباد دی جانے لگتی ہے۔''(۲)

''.....حج کا رکن اعظم بحمد اللہ ختم ہو چکا، اس وقت دل کی

---

(۱) سفر حجاز از مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۲۷۲-۲۷۳ مطبوعہ ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ سنہ طباعت ۲۰۰۶ء

(۲) ایضاً ص ۲۷۶

مسرتوں کا کیا پوچھنا، بات کہنے کی نہیں، تجربہ کرنے کی ہے، ہر چہرہ کھلا جارہا ہے، ہر طرف مسرت وانبساط۔"(۱)

مزدلفہ

عرفات کے بعد ہی حاجیوں کو مزدلفہ میں قیام کرنا ہوتا ہے، یہ ایک وسیع میدان کا مشہور نام ہے، جو منیٰ وعرفات کے درمیان واقع ہے، منیٰ سے عرفات کے دو راستہ میں ایک سیدھا اور ایک کسی قدر چکر کے ساتھ منیٰ سے عرفات جاتے ہوئے سیدھے راستہ سے جانا مسنون ہے، ادھر مزدلفہ نہیں پڑتا، عرفات سے واپسی دوسرے راستہ سے مسنون ہے، جو ذرا چکر کھا کر ہے، مزدلفہ اسی راستہ میں پڑتا ہے....."(۲)

"....قرآن مجید میں اس کا نام "مشعرالحرام" آیا ہے، اور یہاں کے قیام کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ خود کلام پاک میں یہ تصریح موجود ہے کہ عرفات سے واپسی میں "مشعرالحرام" میں ذکر الٰہی کرو، فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ. مشعرالحرام کے مفہوم میں سارا میدان داخل ہے۔"(۳)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے مزدلفہ کی شب گذاری میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی کمی کو بہت محسوس کیا، جو مسجد نمرہ میں نماز ادا کرنے گئے تو پھر قافلہ سے بعد میں اس وقت ملے جب مزدلفہ کے اعمال بھی پورے ہو چکے تھے، مولانا عبدالباری

---

(۱) سفرحجاز از مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۲۷۸ مطبوعہ ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ سنہ طباعت ۲۰۰۶ء

(۲) ایضاً ص ۲۷۸

(۳) ایضاً ص ۲۷۸

ندوی اور باقی سبھی رفقاء ساتھ رہے، تعب وتکان کا جو حال تھا اسے مولانا دریابادی کی زبانی ہی سنئے:

''ہماری ساتھ کی بیبیاں دن بھر کے سفر اور تکان کے بعد قدرتاً بھوکی تھیں، قافلہ کے دوتن مرد بازار کھانا لینے گئے، واپسی میں راستہ بھولے اور ان پر جو کچھ گذری بس انھیں کا دل جانتا ہے، ایک ہی طرح کے ہزار ہا اونٹ اور ہزار ہا شغدف ہر طرف نظر آرہے تھے، بالکل بھول بھلیاں کا منظر، قدم قدم پر بھٹکتے تھے اور اپنے قافلہ والوں کو چیخ چیخ کر پکارتے تھے، پکارتے پکارتے گلے پڑ گئے تھے، جب جا کر کس مشکل سے پہنچ پائے ہیں۔''(۱)

مگر یہ سارا تکان اس وقت کافور ہوگیا جب اس مبارک و پرنور شب میں پورے الحاح وزاری کے ساتھ دعاؤں کی توفیق ہوئی، اور اللہ کی رحمت کو متوجہ پایا، قافلہ کے اس حال و کیفیت کو مولانا دریابادی نے پوری ادیبانہ شان کے ساتھ یوں بیان کیا ہے:

''اللہ اکبر! جو کچھ عرفات میں بھی نہ ملا تھا، مزدلفہ میں مل گیا، اس رحمت بے حساب کا کوئی حساب لگا سکتا ہے، اس کرم بے نہایت کی کوئی پیمائش کرسکتا ہے، مزدلفہ کی بزرگیوں اور عظمتوں کا کون اندازہ کرے گا؟ اور جس نے مزدلفہ میں یہ دعائیں مانگیں، اس کے لطف وشفقت کا کون احاطہ کرسکتا ہے؟ اور پھر سب سے بڑھ کر جس نے ان دعاؤں کو قبول کیا، اس کی شان رحمت ومغفرت کے اظہار کے لیے کوئی لفظ، کوئی عبارت کافی ہوسکتی ہے؟''(۲)

---

(۱) سفر حجاز از مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۲۸۵ مطبوعہ ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ سنہ طباعت ۲۰۰۶ء

(۲) ایضاً ص ۲۸۸

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی اور اپنے قافلہ کی روداد سفر حج آگے بھی جاری رکھی ہے، مزید منیٰ کا قیام، رمی جمرات، قربانی، حلق اور مکہ کے اعادہ کا خوب خوب تذکرہ کیا ہے، کبھی کچھ بڑے جذبۂ ہمت اور عشق و وارفتگی سے کیا گیا۔

واپسی

حج کے بعد زیادہ دن ٹھہرنا نہیں ہوا، مدینہ پاک کی زیارت پہلے ہی کی جا چکی تھی، اللہ اکبر! ''اکبر'' نامی جہاز (بحری) سے سفر شروع ہوا تھا، اور ''رحمانی'' جہاز سے واپسی کا پروگرام بن گیا، یہ رہا اللہ کا رحم وکرم، ۱۸ر ذی الحجہ (۲۷ر مئی) کی تاریخ تھی، تین مہینہ پر محیط رہا، ۶ر جون کو بمبئی کا ساحل ملا، اور ۹ر جون کو یہ مبارک قافلہ لکھنؤ پہنچ گیا، جَعَلَ اللّٰہُ تَعَالیٰ حَجَّھُمْ حَجّاً مَبْرُوْراً وَسَعْیَھُمْ سَعْیاً مَشْکُوْراً وَذَنْبَھُمْ ذَنْباً مَغْفُوْراً.

☆☆☆☆☆

باب چہارم

سلوک ومعرفت

سلوک ومعرفت کہیں یا تزکیہ واحسان، مولانا عبدالباری ندوی نے اس وادی میں بھی قدم رکھا، اور وہ نمایاں مقام حاصل کیا کہ ان کے معاصرین کو بھی اس میں ان کے فضل وکمال اور امتیاز واختصاص کا اعتراف کرنا پڑا، انھوں نے اس میں ترقی کے کیا کیا مدارج طے کیے، اس سے بحث نہیں کرنی ہے، لیکن انھوں نے انتفاع واستفادہ میں جو مجاہدے وریاضتیں کیں اور پھر افادہ ونفع رسانی کے لیے جو مساعی پیش کیں ان پر کچھ روشنی ڈالی جائے گی، ان کی وفات پر ان کے ایک اہم معاصر اور عظیم دینی وعلمی شخصیت مفسر قرآن مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی (ثم کراچوی) مفتی اعظم پاکستان کا تاثر اہمیت کا حامل ہے وہ ملاحظہ ہو:

> ''حضرت مولانا عبدالباری ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی اطلاع بھی مل چکی ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، قحط الرجال کے اس پرآشوب دور میں ایسے حضرات کا وجود مسعود ملک وملت کے لیے باعث برکت ہوتا ہے، افسوس کہ سب ہی اکابر واحباب ایک ایک کرکے جدا ہورہے ہیں، یہ ناکارہ ہی سب کے رنج وغم سہنے کے لیے جی رہا ہے، مولانا مرحوم حضرت سیدی حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز تھے، احقر کا تعلق مولانا مرحوم سے بہت قریبی رہا ہے، مولانا نے حضرت رحمۃ اللہ کے دامن سے وابستہ ہوکر دنیا کی ہر آسائش کو

چھوڑ دیا، اور اپنی جائیداد اور وسائل معاش کو خدمت دین کے لیے وقف کر دیا، زندگی بھر حضرتؒ کے علوم و معارف سے نئی نسل کو روشناس کرایا اور حضرتؒ کی متعدد تصانیف کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا، اب تو لکھنے پڑھنے سے معذور ہو چکا ہوں، کچھ لکھنے سے قاصر ہوں، مجھے اس سانحہ سے بہت صدمہ ہوا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مرحوم کو جنت میں درجات عالیہ نصیب فرمادیں، آمین۔''

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے ان کا تعلق اس وقت قائم ہو چکا تھا جب وہ عنفوان شباب میں تھے، ۱۹۲۸ء میں تلاش مرشد انھوں نے اور ان کے رفیق دیار مولانا عبدالماجد دریابادی نے شروع کی، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مرید ہو گئے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ان دونوں کے مربی و مرشد اور مصلح ٹھہرے، طلب صادق میں کوئی کمی تھی نہیں اس کو یہ دونوں بزرگ اور زیادہ پختہ کر چکے تھے، کبھی ادھر کبھی ادھر کر کے خوب آزما چکے تھے، جانچ پڑتال کر چکے تھے، اب اپنا لینے میں دونوں کو کوئی تردد و تذبذب نہ تھا، اور ادھر دونوں نے اس تعلق کو خوب نباہا، مولانا عبدالباری ندوی نے تو اپنے طرز عمل سے سبھی کو حیران کر دیا، دو کشتیوں پر سوار ہو کر لب دریا پر پہنچ جانا سب کے بس کی بات نہیں، مگر انھوں نے اس ناممکن کو ممکن العمل بنا کر دکھلایا، اور یہ ثابت کر دیا کہ جیسا بھی نظام اللہ رب العزت کی طرف سے طے ہو جائے اس کے مطابق پورے اظہار عبدیت کے ساتھ زندگی گذار دینا ہی اسلام و استسلام ہے، وہ یقیناً اس پر کھرے اترے، ان کے گھر پر جسے انھوں نے لکھنؤ میں تعمیر کیا تھا، دونوں حلقوں کے علماء اور وابستگان جمع ہوتے اور قیام کرتے، اس سے بڑھ کر خود حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی

کا وہاں قیام رہا، گو مختصر سہی، اور جب حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی لکھنؤ تشریف لاتے اور لکھنؤ میں اپنے میزبان مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء کے یہاں قیام فرماتے تو اپنے ان مخلص و صادق مرید مولانا عبدالباری ندوی کو بھی وقت دیتے، اور وہاں بھی قیام ہو جایا کرتا۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی خدمت میں

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے عہد کے نامور شیخ طریقت، عظیم مرد مجاہد، محدث کبیر، اور ملک وملت کے بے لوث و مخلص رہنما اور قائد تھے، سیاسی بصیرت، علمی رسوخ اور روحانیت میں بلند مقام رکھنے اور اپنی قربانیوں و مجاہدوں کی وجہ سے ایک محبوب و دل آویز شخصیت کے مالک تھے، پھر بھی بعض سیاسی نظریات میں ایک جماعت کے متفق نہ ہونے کی وجہ سے انہیں اپنی محبوبیت و مقبولیت کے باوجود بڑے صبر آزما حالات سے بھی گذرنا پڑا، مگر آپ کبھی بھی ایک حرف بھی شکوہ وگلہ کا اور اظہار غضب و ناراضگی کا زبان پر نہ لائے، یہ آپ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو آپ کے تعلق مع اللہ کی مضبوطی اور علم و معرفت میں ید طولیٰ رکھنے کی غماز ہے، اور آپ کی ربانیت صادقہ اور حکیم الامت حضرت تھانوی کی نگاہ میں راہ نبوت پر قائم ہونے کی علامت ہے، اور یہی اسباب و محرکات تھے کہ مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت ہو گئے، بیعت ہونا کوئی رسمی چیز نہیں، دینی امور میں اس کی امارت کو تسلیم کرنا ہے، تقویٰ، للّٰہیت، طہارت باطنی اور زہد و عبادت میں اپنا امام ماننا ہے، پھر بھی ان دونوں عظیم علمی شخصیتوں کے ذوق و مزاج کا خیال کرتے ہوئے حضرت مدنی نے حضرت تھانوی کی ہی طرف رجوع کو کہا تھا، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ خود ان دونوں کو لے کر تھانہ بھون گئے،

اور اپنی معروض پیش کی، مگر یہ کہہ کر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے معاملہ رفع دفع کیا کہ آپ ہی بیعت کریں، آپ راہ نبوت پر ہیں (۱) اور ہم راہ ولایت پر، اور آخر حضرت مدنی اس پر تیار ہوئے کہ بیعت میں کرلیتا ہوں مگر تربیت واصلاح آپ فرمائیں گے، چنانچہ پھر یہ لوگ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کے ساتھ ہی تھانہ بھون سے دیوبند واپس ہوئے اور داخل سلسلہ ہوگئے، اور اس تعلق کو ان دونوں نے آخر تک قائم

---

(۱) یہ بات مولانا دریابادی کے قلم سے نظر سے نہیں گذری البتہ دوسرے ذرائع سے معلوم ہوئی، ہمیں ہمارے دادا مخدومی جناب سید محمد مسلم حسنی صاحب زید مجدہ (داماد حضرت ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی صاحبؒ) نے مولانا محمد مرتضیٰ نقوی بستوی سابق ناظر کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے حوالہ سے یہ بات بتائی، بہر کیف راہ نبوت کہیں یا ولایت انبیاء، حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے حضرت سید احمد شہیدؒ سے اسی طرح کا جملہ فرمایا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وانعام سے تم کو ولایت انبیاء سے نوازا ہے'' حضرت سید صاحبؒ نے جب اس کی تشریح چاہی تو حضرت شاہ صاحبؒ نے مطلق ولایت یعنی ولایت اولیاء کی تعریف بیان کرنے کے بعد ولایت انبیاء کے سلسلہ میں فرمایا کہ:

''ایثار اور پیغمبرانہ اخلاق وعادات اس کی صورت وسیرت میں نمایاں ہوجائیں، اور یہ خصائل حمیدہ نفسانی وجسمانی ظلمتوں اور کدورتوں کو معدوم کردیں وہ ہمیشہ خلق خدا کی ہدایت، مجرمین وفساق کو نصیحت، اللہ کے فرائض کو جاری اور قائم کرنے اور انبیائے مرسلین کی سنتوں کو زندہ کرنے، کفار کے خلاف جہاد، اشرار کی تادیب اور گنہگاروں کی تعزیر میں مشغول رہے، اکثر مسلمانوں کی مجلسوں اور ان کے مجمعوں میں جاکر ان کو وعظ ونصیحت کرے، اگرچہ اہل مجلس اس کے سننے کی طرف متوجہ نہ ہوں، اس مشرب کو صوفیوں کی اصطلاح میں قرب الفرائض کہتے ہیں، اس مشرب کے لوگوں کا عمل اکثر عبارۃ النص اور تنزیل قرآنی پر ہوتا ہے، اس مرتبہ کو ولایت کے تمام مرتبوں سے اعلیٰ یقین کرنا چاہئے، ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم.'' (ملاحظہ ہو، سیرت سید احمد شہیدؒ ۱/۱۲۳)

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (جانشین حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ) نے امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید سے ان کے متعلق یہ بات فرمائی تھی جو پچھلے دور میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے ان کے متعلق فرمائی، بطور لطیفہ کے اس مناسبت سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا وہ خواب ذکر کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب انھوں نے امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ کی خواب میں زیارت کی تو ان کے ساتھ اسی چارپائی پر حضرت مولانا حسین احمد مدنی کو بھی بیٹھے دیکھا، جو ان دونوں شخصیتوں کے زمانی فرق کے باوجود ذوق ومشن میں اتحاد ومناسبت کی بات ضرور ہے۔ والغیب عند اللہ.

رکھا، اور ذوقی ومزاجی اختلاف کو اس تعلق میں حارج نہیں بننے دیا، اور بقول حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ: ''مولانا تھانوی کی پوری عقیدت اور ذہنی وذوقی مناسبت کے ساتھ مولانا مدنی کی عقیدت میں فرق نہیں آنے دیا۔'' (۱)

مولانا عبدالباری ندوی کو اپنے شیخ بیعت سے عقیدت ومحبت کا جو تعلق رہا اس کا یہ اثر تھا کہ وہ ان سے استفادہ کے لیے اور کچھ وقت صحبت میں گذارنے کے لیے ان کے جائے مستقر وہ دیوبند ہوتا جہاں ان کی تعلیمی سرگرمیاں جاری تھیں یا ٹانڈہ فیض آباد ہوتا جو ان کا وطن تھا حاضری دیتے اور استفادہ کرتے، اس سلسلہ کا وہ خود ایک واقعہ سنایا کرتے، جب وہ اس تعلق کے بعد سچے طالب اور مخلص نیاز مند بن کر پہلی بار بنفس نفیس حاضر ہوئے، تھانوی مذاق لیے ہوئے اور زمیندارانہ مزاج کے ساتھ، اور یہاں کا مزاج ومذاق اس سے بالکل مختلف اور الگ تھا، ایک صراحی ایک گلاس سب اسی سے پانی پی رہے ہیں، اور ان کے ساتھ ایک ملازم تھا جو صراحی اور اسٹینڈ ساتھ رکھے تھا، جو پچھلے دور کے خوشحال گھرانوں کا طریقہ ہوا کرتا تھا، مولانا نے یہاں کا طریقہ کار دیکھا، اسی وقت اپنے ملازم کو حکم دیا کہ صراحی اور اسٹینڈ پھینک دو، اور انھوں نے اپنے کو اسی نظام میں ڈھال لیا۔

مخدومی جناب سید محمد مسلم حسنی اطال اللہ بقاءہ (داماد حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی) جنھوں نے اس واقعہ کو خود مولانا عبدالباری ندوی کی زبان سے سنا تھا، آگے کا واقعہ مزید بیان کرتے ہیں:

پھر ایک دوسرا مرحلہ کھانے کے وقت پیش آیا، اور یہ بھی ان کے لیے کسی ابتلاء سے کم نہ تھا کہ حضرت مدنی دسترخوان پر استفسار کرتے ہیں کہ آپ کے ساتھی کہاں رہ گئے، انھوں نے کہا کہ حضرت! وہ بعد میں کھالیں گے، وہاں سے اشارہ ہوا

---

(۱) پرانے چراغ/۱۲۲۔

کہ نہیں، ساتھ ہی کھائیں گے، بلا لیجئے، سخت پس وپیش کے بعد گھر کے وہ خادم حاضر ہو گئے، اور ایک ساتھ سب نے کھانا کھایا، پیر، مرید اور مرید کا خادم سب ہی ایک دسترخوان پر، اور ایک ہی برتن میں، کہ حضرت مدنی کے یہاں برتن بھی ایک ہی ہوا کرتا تھا، سارے حجابات یک لخت دور، سارے امتیازات بیک وقت کافور، تربیت کا ایک رنگ یہ بھی ہے۔

ایک واقعہ اور بھی انہیں سے متعلق ہے، اور خود ان ہی کا روایت کردہ، بات یہ ہے کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی لکھنؤ کثرت سے آمد ورفت رہتی تھی، لکھنؤ کے دینی، دعوتی اور ملی وسیاسی تقاضے سبب ہوا کرتے تھے، قیام حضرت مدنی کا ۳۱-۱۹۳۰ء سے باقاعدہ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے یہاں ہونے لگ گیا تھا، مولانا عبدالباری ندوی کا اس زمانہ میں حیدرآباد میں ملازمت کا تعلق تھا، وہ اپنی ان تعطیلات میں لکھنؤ آیا کرتے تھے، وہ اپنی تعطیلات میں اور پھر جب وہ مستقلاً لکھنؤ میں رہنے لگ گئے تھے تو اس زمانہ میں بھی اور زیادہ اہتمام سے ڈاکٹر صاحب کے مکان پر آکر حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے استفادہ کرتے (۱) اور اپنے گھر تشریف آوری کی درخواست خدمت میں گذار دیتے، جو اکثر بیشتر منظور ہو جایا کرتی، اور بخوشی حضرت مدنی ان کی رہائش گاہ ''شبستان سعادت'' میں کچھ وقت یا کوئی شب گذارتے، اور وہ اپنے شیخ کی دعوت کا اہتمام کرتے، اسی مناسبت کا ایک واقعہ یہ پیش آیا، مخدومی جناب سید محمد مسلم حسنی کہتے ہیں کہ ہم نے خود ان کے منہ سے سنا، دسترخوان پر حضرت مولانا

---

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اسی زمانہ کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''یہی زمانہ تھا جب مولانا عبدالماجد صاحب نے مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت واسترشاد کا تعلق پیدا کیا، میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب نے بھی اسی زمانہ میں مولانا سے تعلق پیدا کیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کا گھر لکھنؤ میں مولانا کی مستقل فرودگاہ بن گیا، اس جدید روحانی رشتہ سے مولانا عبدالماجد صاحب اور مولانا عبدالباری ندوی صاحب کی جلد از جلد زیارت ہونے لگی۔''

(پرانے چراغ ۲/۱۴۶)

سید حسین احمد صاحب مدنی اور ڈاکٹر صاحب (مولانا سید عبدالعلی حسنیؒ) تھے اور میں تھا، ہم نے ایک ہڈی چوس کر کنارے ڈال دی، حضرت کو محسوس ہوا کہ اس میں کچھ بوٹی کا اثر رہ گیا ہے، انھوں نے وہ ہڈی اٹھائی اور خود صاف کی۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے ایسے اعلیٰ اخلاق، ایثار و بے نفسی، تواضع، فنائیت اور سنت کی معمولی معمولی چیز کے اتباع کا کیسے ان پر اثر نہ پڑتا، یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے واقعات بڑی محبت و وارفتگی کے ساتھ سناتے، اور بڑے خورد بن کر ان کے ارشادات کو سنتے، اور ان کو عمل میں لاتے، مولانا عبدالباری ندوی کی رہائش گاہ میں حضرت مدنی کے قیام کی بابت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا مدنی ان کی کوٹھی پر کبھی کبھی رات گذارتے اور بڑے منشرح رہتے، مجھے بھی ایک دوبار اس کا اتفاق ہوا ہے، صبح کی آم خوری کی مجلس، صحن چمن میں چبوترہ پر نشست، شیخ وقت کی موجودگی، اور ایک چیدہ و بزرگ مجمع اور اس کی شستہ و شائستہ گفتگو بھولنے والی چیز نہیں۔'' (۱)

ایک بار حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے مولانا عبدالباری ندوی کی بڑے بلیغ انداز میں تعریف فرمائی کہ ''مولانا عبدالباری چاہتے ہیں کہ شیطان مرجائے اور ایسا ممکن نہیں۔'' (۲)

مولانا عبدالباری ندوی کی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے مراسلت کا بھی پتہ چلتا ہے، حضرت مدنی ان کے اشکالات و شبہات اور معروضات کے جواب میں کبھی کسی شعر کبھی کسی جملہ سے کام چلا لیتے، مصنف ''سوانح شیخ الاسلام'' اصلاح نفس کے تعلق سے حضرت مدنی کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

---

(۱) پرانے چراغ ۲/۲۳-۱۲۲۔

(۲) ایضاً ص/۱۲۷

''مولانا عبدالباری لکھنوی کو خط میں مندرجہ ذیل شعر لکھا:

و النفس کالطفل أن تمهله شبّ علی

حب الرضا و أن تفطمه ینفطم

''نفس کی حالت تو دودھ پیتے بچہ کی طرح ہے جو دودھ پیتا ہے، اگر اس کے دودھ کو بچپن میں (مدت پوری ہونے پر) نہ چھڑایا گیا تو جوان ہونے پر دشواری ہوگی۔''(۱)

مولانا عبدالباری ندوی ہوں یا مولانا عبدالماجد دریابادی ان کو حضرت مدنی سے کیونکر عقیدت ومحبت ہوئی اور کیا فکری مناسبت پائی جس کی وجہ سے باوجود حضرت تھانوی سے عقیدت اور ان کے مصلحانہ مقام اور مربیانہ کردار کی شہرت اور خواص میں مرجعیت کے حضرت مدنی کے ہاتھ میں ہاتھ دینا طے کیا، بقول مولانا دریابادیؒ:

''مرشد کی تلاش کے عنوان پر قلم ذرا تفصیل کے ساتھ ''سچ'' کے صفحات میں چل چکا تھا، اب دل بے چین تھا کہ اس تلاش میں حرکت قلم سے زیادہ قدم کو ہو، قدم متحرک پہلے ہی سے تھا، تقاضا یہ پیدا ہوا کہ حرکت تیز سے تیز تر کی جائے۔''(۲)

آخر مولانا دریابادی نے اپنے محبوب قائد اور تحریک خلافت کے رہنما مولانا محمد علی جوہر سے مشورہ کیا، انھوں نے اپنے ہم مذاق اور ہم فکر تحریکی مرشد کا مشورہ دیا، اور بقول مولانا دریابادی ''بلاتأمل ووٹ، مولانا حسین احمد صاحب کے حق میں دیدیا۔''(۳)

اب دوستوں، رفیقوں، ہم خیالوں تک بات پہنچی، ان میں مولانا عبدالباری ندوی کا نام سرفہرست ہے، انھوں نے اور سرگرمی دکھائی، اور اب دونوں نے انتخاب

---

(۱) سوانح شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ از مولانا عبدالقیوم حقانی، ص/۲۱۵ مطبوعہ مکتبہ یحیوی سہارنپور

(۲) حکیم الامت نقوش وتاثرات، ص/۱۱

(۳) ایضاً۔

مرشد کی ٹھان لی، کیوں کس کا انتخاب کیا، اور حضرت مدنی کو حضرت تھانوی پر کن اسباب سے ترجیح دی، یہ سب عقدے مولانا دریابادی خود حل کئے دیتے ہیں، ملاحظہ ہو!

''دوستوں، رفیقوں سے گفتگو گھنٹوں اسی موضع پر رہا کرتی، لڑکپن کے ایک رفیق (اور اب مولانا حاجی شاہ) عبدالباری ندوی تھے (انھیں ان کے ہم نام فرنگی محلی عالم اور لیڈر سے خلط نہ کر دیجئے گا) ان سے برابر چرچے، تذکرے یہی ہوتے رہتے، عقیدت اس وقت سب سے زیادہ مولانا تھانوی ہی سے تھی، بزرگی سب سے بڑھ کر ان ہی کی مسلم تھی، دل سب سے زیادہ ان ہی کی طرف کھنچ رہا تھا، لیکن ساتھ ہی اختلافات کی بھی ایک خلیج اپنے اور ان کے درمیان حائل پا رہا تھا، ان میں سب سے بڑھ کر سیاسی اختلاف تھا، دل اس پر آمادہ نہ ہوا کہ آنکھ بند کر کے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا جائے، مولانا حسین احمد صاحب سے عقیدت اس درجہ کی نہ تھی، لیکن ساتھ ہی کوئی اختلاف کسی بھی شدید قسم کا نہ تھا، اور سیاسیات میں تو بالکل ہمرنگی تھی، پھر نفس نے یہ بھی سمجھایا- شعور کے ساتھ ساتھ تحت الشعور بھی تو اپنا کام کرتا رہتا ہے، اور کیا حرج ہے، اگر آپ طبیب کی حذاقت کے کارناموں کی داستان کے ساتھ ساتھ مریض کی تحلیل نفسی کی سرگذشت بھی مریض ہی کی زبان سے سنتے چلیں- کہ حضرت تھانویؒ حاذق ترین طبیب سہی، ان کا معالجہ مؤثر ترین و کامیاب ترین سہی، لیکن ان کے باقاعدہ علاج و منضبط پرہیز کی پابندیاں کس سے برداشت ہوں گی، طبیب کی حذاقت سے قطع نظر

مریض کی ہمت و برداشت بھی تو آخر ایک چیز ہوتی ہے، مولانائے دیوبندی کے مزاج کی سادگی، تواضع، فروتنی دیکھ کر خیال یہ پیدا ہوا کہ یہاں کوئی پابندی کسی شدید قسم کی نہ ہوگی، پس ہاتھ ان ہی کے ہاتھ میں دیدیا جائے۔ نفع کامل میں کچھ دیر سہی، لیکن دوا کی تلخیوں سے تو جان بچی رہے گی، مریض کے لیے یہ لالچ کچھ کم ہوتا ہے؟'' (۱)

آخر یہ دونوں مفکر، مصنف، محقق، فلسفی کب تک سوچتے رہتے اور خیال پر خیال جماتے رہتے، اب کچھ کر گذرنے کی ٹھان لی، اور دیوبند کا رخ کیا کہ اب اپنا مدعا حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے سامنے رکھ ہی دیں گے، مولانا دریابادی لکھتے ہیں اور اس انتخاب مرشد میں حسن انتخاب کی کئی وجوہات بتاتے ہیں، ان کے الفاظ ہیں:

''رفیق قدیم مولوی عبدالباری صاحب ندوی کے ساتھ مل کر دیوبند چلنے کی ٹھہر گئی، اور جون ۱۹۲۸ء کی کوئی آخری تاریخ تھی کہ صبح کے وقت ہم دونوں لکھنؤ سے لمبا سفر کر کے دیوبند اسٹیشن پہنچ گئے، ان کی حاضری کا یہ بالکل پہلا موقع تھا، اسٹیشن پر دیکھا تو مولانا خود استقبال کے لیے موجود، مولانا کی بزرگی کے قائل، خوش عقیدہ حضرات جن بناء پر بھی ہوں، اپنی نظر میں تو ان کی بڑی کرامت ان کا ایثار، انکسار، تواضع، بے نفسی ہی ہے (۲)، علم

---

(۱) ملاحظہ ہو حکیم الامت نقوش تاثرات ص/۱۱-۱۲۔

(۲) ان کی ان ہی صفات کا اثر شروع سے مولانا دریابادی پر تھا، جبکہ تحریک خلافت کے پروگراموں میں ساتھ ہوتا رہتا تھا، اور یہ باتیں مشاہدے میں آتی رہتی تھیں، مولانا محمد علی جوہر بھی متاثر تھے ہی، اسی لیے انھوں نے بھی ان ہی کا مشورہ دیا، مولانا عبدالباری ندوی بھی ان ہی وجوہات سے اور پھر کچھ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی وجہ سے کہ وہ ان سے بیعت ہو چکے تھے، مولانا مدنی کے معتقد تھے، مگر یک گونہ ان دونوں کے حضرت تھانوی کی طرف بھی رجحان کا اثر حضرت مدنی پر روحانی طور پر پڑا اور انھوں نے حضرت تھانوی سے وابستہ ہونے کا مشورہ دے ڈالا۔

وفضل، فقر ودرویشی کی بحثوں کو چھوڑ یئے لیکن جہاں تک ؎

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

کا تعلق ہے، مولانا ۱۹۲۸ء ہی میں نہیں، ۱۹۴۳ء بلکہ عین اس وقت یعنی ۱۹۴۸ء میں بھی، اس دیکھنے والے کی نظر میں اپنی نظیر میں آپ ہی ہیں، اور محمد علی جوہرؒ نے یہ شعر کہا تو اپنے شیخ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے حق میں ہے لیکن صادق مولانا دیوبندی پر بھی لفظ بہ لفظ آرہا ہے ؎

ان کا کرم ہی ان کی کرامت ہے ورنہ یاں
کرتا ہے کوئی پیر بھی خدمت مرید کی

دوسروں کو شاید کام لینے میں وہ لطف نہ آتا ہو جو ان مولانا کو دوسروں کا کام کر دینے میں آتا ہے، گھر پر آکر ملئے تو آپ کے لیے کھانا اپنے ہاتھ سے جاکر لائیں، آپ کے لیے بستر بچھادیں، سفر میں ساتھ ہو جائے تو دوڑ کر آپ کے لیے ٹکٹ لے آئیں، قبل اس کے کہ آپ ٹکٹ گھر کے قریب بھی پہنچ سکیں، تانگہ کا کرایہ آپ کی طرف سے ادا کر دیں، اور آپ کا ہاتھ اپنی جیب میں ہمیشہ ٹٹولتا ہی رہ جائے، ریل پر آپ کا بستر کھول کر بچھائیں، آپ کے لوٹے میں پانی لے آئیں، آپ کا سامان اپنے ہاتھ سے اٹھانے لگیں (۱) - تین دن کے قیام دیوبند میں

---

(۱) مولانا دریابادی نے اپنے مراد کی صفات وکمالات ایک ایک کر کے خوب گنا ڈالے جب بھی بہت سے رہ گئے۔ ''سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لیے۔'' راقم کے دادا سید محمد مسلم حسنی صاحب بھی ان ہی مولانائے دیوبندی جو مولانا مدنی کے نام سے زیادہ معروف ہیں سے بیعت رہے، وہ کہتے ہیں: (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

روایتیں مشاہدہ بن کر رہیں، اور شنیدہ دیدہ میں تبدیل ہوکر، تکلفات اور خاطر میں اور مہمانداریاں کھانے پر کھانا اور چائے پر چائے، بیعت کے سوال پر ارشاد ہوا کہ یہاں کیا رکھا ہے، ذرا تھانہ بھون تو چلئے، یہاں تو نیت ہی یہی تھی، ایک روز سہ پہر کو مختصر سا قافلہ چل کھڑا ہوا، گویا ع

مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ (۱)

البتہ یہاں اپنے ساتھ پارسا ایک نہیں دو تھے (۲)، اور سفر کعبہ کا نہیں، کعبہ مقصود کا تھا - ایسی منزل کے لیے رہبر بھی اس سے بہتر اور کون مل سکتا تھا، اللہ! اللہ! ایسے سفر کی سعادت ہی کب نصیب میں معلوم ہوتی تھی ؎

ہے آرزو کہ ابروئے پرخم کو دیکھئے
اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے

تھانہ بھون تو یہ حضرات پہنچ گئے، حکیم الامت حضرت تھانوی نے بڑی مسرت کا اظہار کیا، وقت دیا، عرض و مدعا سنا، حضرت مدنی کی سنی، ان لوگوں کی بھی سنی، اور بات اس پر ختم ہوئی کہ بیعت حضرت مدنی ہی کریں گے، ان دونوں نے اپنے دونوں شیخوں سے تعلقات نبھانے اور دونوں کی عظمت و محبت کو برقرار رکھنے میں جس استعداد و صلاحیت کا ثبوت دیا اس پر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے بہت

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) سلام میں بھی ان سے کوئی پہل نہیں کرسکتا تھا، کئی بار ہم پوری تیاری کے ساتھ گئے پھر بھی سبقت حضرت ہی کو حاصل رہی، اسی طرح کہتے ہیں کہ ایک بار عرض کیا کہ بڑا ہی گنہگار ہوں دعا فرمائیں، ارشاد ہوا، یہی اپنے لیے کہتا ہوں، وقت مانگا کچھ عرض و معروض کرنے کے لیے، انھوں نے ایک وقت متعین کردیا، ہمیں اس کا صحیح اندازہ نہیں ہوا، وہ وقت پر آئے، ادھر ادھر تلاش بھی کیا، بعد میں ہم جب دوبارہ ملے تو صرف اتنا کہا کہ میں تو حاضر ہوا تھا، پھر وقت دیدیا، اللہ اللہ! کیسا مرشد سراپا تواضع و عبدیت کہ مرید پانی پانی ہوجائے۔

(۱) مومن بڑے اسلامی الذہن شاعر گذرے ہیں، حضرت سید احمد شہیدؒ کے مریدوں میں تھے۔

(۲) دوسرے پارسا مولانا عبدالباری ندوی ہیں جن کے والد خود پایہ کے بزرگ تھے۔

خوب لکھا ہے وہ کہتے ہیں:

''ان کی بیعت اصلاً مولانا حسین احمد مدنی سے تھی (۱) اپنے رفیق خاص اور ہم سفر و ہم مذاق مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے مقابلہ میں مولانا کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ انھوں نے شیخ بیعت مولانا مدنی اور شیخ صحبت و تربیت (مولانا تھانوی) کے تعلق کو زیادہ جامعیت و توازن کے ساتھ قائم رکھا، اور مولانا تھانوی کی پوری عقیدت اور ذہنی و ذوقی مناسبت کے ساتھ مولانا مدنی کی عقیدت و عظمت میں فرق نہیں آنے دیا، ان کے متعلق یہ مصرعہ پڑھا جاسکتا ہے ع

یوں کئے کس نے بہم ساغر و سنداں دونوں؟

واقعہ بیعت اور ضابطہ کا اصلاحی و تربیتی تعلق حضرت حکیم الامت سے قائم ہونا جبکہ ان دونوں شیوخ طریقت کے درمیان ان دنوں بعض مسائل میں بڑا نظریاتی اختلاف تھا، جس کی وجہ سے لوگوں میں بڑی غلط فہمیاں پھیل رہی تھیِ اس سے الفت و محبت اور اعتماد و تعلق کی وہ مثال سامنے آئی جس کے بعد سبھی انگشت بدنداں رہ گئے، اس داستان پراثر کو حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی کتاب حکیم الامت نقوش و تاثرات میں بڑے دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے، بلکہ کتاب کا آغاز ہی اس واقعہ سے ہے، جسے وہاں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) یہ دونوں حضرات بیعت ہونے کے لیے جب دیوبند حضرت مدنی کی خدمت میں پہنچے تو اس وقت دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم حضرات میں امیر شریعت حضرت مولانا شاہ سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، جس کا اظہار خود انھوں نے مکاتیب گیلانی کے حاشیہ میں اس طور پر کیا ہے کہ ''مولانا عبدالباری صاحب کو بیعت حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے تھی، جس وقت موصوف اور مولانا عبدالماجد دریابادی حضرت علیہ الرحمہ سے بیعت کے لیے دیوبند حاضر ہوئے تھے راقم الحروف دیوبند میں زیر تعلیم تھا۔ (مکاتیب گیلانی ص/۲۶۰)

ایک حیدرآبادی عارف کی خدمت میں

مولانا شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے قوی النسبت بزرگ اور شیخ اکبر ابن عربی کے علوم ومعارف کے نہ صرف قدرداں بلکہ شارح وترجمان کی حیثیت سے معروف تھے، مولانا سید مناظر احسن گیلانی ان کی صحبت میں بیٹھنے کا التزام رکھتے تھے اور پھر ایسا قرب حاصل کرلیا کہ مرید خاص بنے اور اجازت وخلافت سے بھی سرفراز ہوئے، دوسرے علماء وفضلاء میں مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا لطف اللہ ابن مولانا محمد علی مونگیریؒ، مولانا فضل اللہ صاحب (نبیرہ مولانا محمد علی مونگیریؒ) اور دانشوروں میں پروفیسر محمد الیاس برنی اور ڈاکٹر میر ولی الدین جیسے افاضل زمانہ ان کی مجلسوں میں شرکت کرتے، پروفیسر الیاس برنی ان کے ترجمان اور ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کو بقول مولانا عبدالباری ندوی ان کی زبان کی حیثیت حاصل تھی، مولانا شاہ فضل اللہ صاحب کو جنھیں بعد میں امام بخاری کی اخلاقیات سے متعلق مجموعۂ احادیث ''الادب المفرد'' کی شرح ''فضل اللہ الصمد'' کے ذریعہ بڑی شہرت حاصل ہوئی، ان سے اجازت وخلافت بھی حاصل تھی، مولانا عبدالباری ندوی نے باضابطہ روحانی واصلاحی تعلق تو نہیں قائم کیا لیکن پابندی سے ان کی مجلسوں میں حاضری سے اس سلسلہ میں بڑا کسب فیض کیا، مرتب مکاتیب گیلانی حضرت مولانا شاہ سید منت اللہ رحمانی مولانا عبدالباری ندوی کے شاہ محمد حسین صاحب سے عقیدت مندانہ تعلق کو بڑے بلیغ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی تو انھیں وقت کا ابن عربی ہی کہا کرتے تھے، یہاں تک کہ تحریری رنگ میں بھی مولانا ندوی کو ''فتوحات'' کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔''(۱)

---

(۱) حاشیہ مکاتیب گیلانی، ۱/۱۲۵۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ان کے شوق وذوق اور مناسبت وارتباط کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں:

''اپنے تدریسی مشاغل اور مطالعہ وتصنیف کے علاوہ وہ دکن کے ایک مشہور عارف مولانا محمد حسین صاحب کی خدمت میں بھی بڑے اہتمام کے ساتھ جاتے اور اپنے یارغار مولانا مناظر احسن گیلانی کے ساتھ ان کی صحبتوں اور مجلسوں سے مستفید ہوتے، مولوی صاحب موصوف جج کے عہدہ پر فائز تھے، لیکن چشتی سلسلہ کے ایک بزرگ مچھلی شاہ صاحب کے مجاز وخلیفہ تھے، مولوی صاحب پر توحید کا غلبہ تھا، ان کی کوئی مجلس اور ملفوظ اس کے ذکر اور تذکیر سے خالی نہیں ہوتی تھی، صاحب قال ہی نہیں تھے، صاحب حال بھی تھے، ان کے توحید ''توحید وجودی'' سے مل گئے تھے اور اہل علم جانتے ہیں کہ فلسفہ کے ذہین طالب علموں اور فاضلوں کے لیے خاص طور پر جن پر کبھی انکار یا ارتیابیت کا حملہ ہو چکا ہے (اور ہمارے مولانا اس منزل سے گذر چکے تھے) اس مشرب وفلسفہ میں تسکین بلکہ تاثر کا بڑا سامان ہوتا ہے، مولانا لکھنؤ آتے تو ان کی منھ بھر بھر تعریف کرتے، توحید کے غلبہ کے واقعات سناتے، ان ہی کے شوق دلانے سے بھائی صاحب مرحوم بھی جب ایک مرتبہ ایک مریض کو دیکھنے حیدرآباد گئے تو ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، انھوں نے بھائی صاحب کو اس پر بھی آمادہ کرلیا تھا کہ مجھے ان سے استفادہ کے لیے حیدرآباد بھیجیں، مگر اس کی نوبت نہیں آئی،

مولانا گیلانی پر بھی ان کا گہرا اثر بلکہ رنگ تھا، مولانا عبدالباری صاحب پر ان کی صحبت کا جو رنگ چڑھا تھا، اس نے مولانا تھانوی کی بیعت وصحبت سے ہلکا ہوکر نئے رنگ کے ساتھ مل کر ایک نیا رنگ پیدا کرلیا تھا، جس میں مولانا نے اپنی ذہانت سے کشمکش کے بجائے ہم آہنگی پیدا کرلی تھی، ان ہی مولوی محمد حسین صاحب کے ایک فیض یافتہ اور مجاز پروفیسر محمد الیاس برنی بھی تھے جنہوں نے مولانا کے بہت سے ملفوظات وافادات بھی محفوظ کردیئے تھے۔''(۱)

مشہور ادیب ونقاد اور اسلامی شاعر مولانا ماہرالقادری بھی شاہ محمد حسین صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس کے محرک یہی مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی تھے، ماہرالقادری صاحب کہتے ہیں:

''ایک بار مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی غریب خانہ پر تشریف لائے، اور مشہور صوفی بزرگ مولوی محمد حسین (ناظم سمستان ونیرتی) کی مجلس وعظ وارشاد میں مجھے لے گئے، مولوی محمد حسین مرحوم نے گھنٹہ سوا گھنٹہ لا الہ الا اللہ کی تشریح فرمائی، تقریر خاصی دلنشیں تھی، وہ دینی عالم نہ تھے مگر اپنے وعظ میں ایسے نازک نکتے بیان کرتے جو بقول مولانا مناظر احسن گیلانی ''تصوف واخلاق کی کتابوں میں نہیں ملتے۔''(۲)

حضرت تھانوی کی خدمت میں بار بار حاضری اور اجازت وخلافت

مولانا عبدالباری ندوی نے بیعت واصلاح کا تعلق محض رسماً قائم نہیں کیا

(۱) پرانے چراغ ۲/۱۲۰ (۲) یادِ رفتگاں ۲/۱۶

تھا، کہ جس میں نہ اطلاع ہو نہ انقیاد کے مرحلہ سے گذرنا پڑے اور نہ ہی محنت ومشقت سے کام لینا پڑے، "کالمیّت فی ید الغسّال" ہوکر انھوں نے اپنے کو مرشد کے حوالہ کردیا تھا، تھانہ بھون جاتے اور خاصے خاصے دن قیام کرتے، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ مولانا عبدالماجد دریابادی علیہ الرحمہ کو ایک مکتوب میں جو وسط جنوری ۱۹۴۲ء کا ہے، لکھتے ہیں:

"مولوی مسعود علی صاحب یکم جنوری سے تھانہ بھون مع مولوی عبدالباری صاحب گئے ہوئے ہیں۔"

خود اس مکتوب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دو ہفتے تو ان کے قیام کے گذر ہی گئے تھے، مولانا عبدالباری ندوی اس وقت بھی تھانہ بھون میں اپنے شیخ کی خدمت میں معتکف تھے، جب وہ بغرض علاج لکھنؤ آنے کا قصد فرمارہے تھے، چنانچہ وہ ساتھ آئے اور پھر لکھنؤ میں بھی پابندی سے ان کی خدمت میں حاضری دینے کا معمول بنائے رکھا، جس کا حضرت تھانوی کے قلب پر بڑا اثر پڑا، اور پھر ان کی اس درخواست کو پورے انشراح سے قبول فرمایا کہ ایک شب ان کے مکان "شبستان سعادت" (واقع سیتاپور روڈ لکھنؤ) میں گذاری جائے، بالآخر حضرت تھانوی نے اپنے گھر والوں اور بعض خدام کے ساتھ وہاں وقت گذارا، بلاشبہ مولانا عبدالباری ندوی کو حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے یہاں بڑا قرب واختصاص حاصل ہوچکا تھا، اور ایسا تعلق خاطر ہوچلا تھا جس نے ان کو اپنے شیخ کا نہ صرف معتمد بلکہ مجاز طریقت (اجازت بیعت کی خصوصیت کے ساتھ) بنادیا، اصلاح وتربیت کے دائرہ میں آنے کے کتنے عرصہ کے بعد وہ مجاز بیعت ہوئے، اس کا تو علم نہیں ہوسکا، لیکن اعتماد کی سندیں بارگاہ اشرفی سے انھیں روز اول سے ملتی رہیں، یعنی جب سے شناسائی ہوئی تعلق بڑھتا ہی گیا، اور حکیم الامت حضرت تھانوی کے زمانہ میں ہی ان کی کیفیت ایسی

بلند ہو چکی تھی کہ ان کے ایک نامور اور بلند مقام معاصر مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ علامہ سید سلیمان ندویؒ کو ایک مکتوب میں جو انھوں نے ۳؍مارچ ۱۹۴۳ء (۱۴؍صفر ۱۳۶۲ھ) کو حیدر آباد دکن سے ارسال کیا ہے، جس کا ضروری حصہ نقل کیا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

سیدی الکریم زادکم اللہ عرفانا وقربا۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یقیناً ہم زمینوں کے حدود سے آپ بہت بلند ہو چکے ہیں، یوں ہی بلندی کیا کم تھی، اور اب تو ماشاء اللہ حکیم الامت مدظلہ العالی کی نیابت وخلافت کی دولت سے سرفراز ہیں، چالیس سال تک مولوی شبلی صاحب کی نیابت اور عمر عزیز کے چہل سال کے بعد مولانا تھانوی کی ع

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

آگے لکھتے ہیں:

اور کیا عرض کروں، جی رہا ہوں، آپ کو اور مولانا عبدالباری کو دیکھتا ہوں شعر یاد آتا ہے ؎

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالہ جرس کارواں رہے

اور کیا عرض کروں مولانا عبدالباری کا حال حدود رشک سے بھی آگے نکل گیا، اب میرے نزدیک تو وہ اچھے خاصے صاحب دل بزرگ ہیں، کثّر اللّٰہ أمثالھم. (۱)

ایک دوسرے مکتوب میں جو حضرت حکیم الامت تھانوی علیہ الرحمہ کی وفات

---

(۱) مکاتیب گیلانی ۱/۳۰-۲۲۵ مرتبہ مولانا منت اللہ رحمانی۔

کے بعد کا ہے اور وہ بھی حضرت سید صاحب کے نام سے ہے لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالباری صاحب کی حالت دن بہ دن بہت زیادہ قابل رشک بنتی جارہی ہے، میں تو ان میں ہر دن ارتقاء کی کیفیت پارہا ہوں، وہ بڑی روح اور بڑے نفس کے آدمی ہیں۔''(۱)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے اصلاح و استفادہ کا تعلق قائم ہوجانے کے بعد سے مولانا عبدالباری ندوی نے پھر کسی تساہل و تغافل سے کام نہیں لیا، انھیں اپنے شیخ بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے پورے انشراح کے ساتھ بلکہ صرف انشراح ہی نہیں ان کا ایماء ومشورہ بھی شامل تھا اس معاملہ میں یکسوئی حاصل کرلی تھی، چنانچہ وہ حیدرآباد میں ہوتے تو وہاں سے اور لکھنؤ میں ہوتے تو یہاں سے تھانہ بھون جاجا کر لمبا لمبا قیام کرتے، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی ان کے اس شوق کو مہمیز دیتے اور ان کی اس طلب پر رشک کرتے نظر آتے ہیں، ان کا ایک اہم مکتوب راقم کی نظر سے گذرا جو انھوں نے اپنے ہمدم رفیق و یارغار مولانا عبدالباری ندوی کو اس وقت لکھا ہے جب خود وہ تعطیلات گرما میں اپنے وطن گیلان آئے ہوئے تھے، اور مکتوب الیہ تھانہ بھون کے کہف سلوک میں کیفیت عشق ومستی کے ساتھ جام معرفت پی رہے تھے، اور ساقی یہی میر تھانہ بھون یعنی حضرت حکیم الامت قدس سرہ تھے، مکتوب پر ۱۹ر مئی ۱۹۳۱ء یکم محرم الحرام ۱۳۵۰ھ کی تاریخ درج ہے، عبارت کا ایک حصہ یہ ہے:

''گرامی نامہ ملا، بڑے انتظار کے بعد ملا، اور یہ پہلا احسان نہیں ہے جو ندوہ کے فلسفی درویش کی طرف سے دیوبند کے ایک شقی ملا پر ظاہر ہوا، فجزاکم اللہ خیر الجزاء۔

---

(۱) مکاتیب گیلانی ص ۳۵۲ (مورخہ ۱۷ر اگست ۱۹۴۴ء/ ۲۷ر شعبان ۱۳۶۳ھ حیدرآباد، دکن)

آپ سے کیا عرض کرسکتا ہوں وہاں مدینہ کی خوشبو کیوں نہ آئے گی، جہاں صاحب مدینہ کے عشق صادق کا مجسمہ جیتا جاگتا نگاہوں کے سامنے آتا ہو، آپ خوش بخت، نفع اٹھایئے، صحبت اولیاء کو غنیمت شمار کیجئے، خاکسار کے لیے تو گیلان کا خلوت کدہ ہی لکھا گیا ہے۔'' (۱)

سلوک کی کہانی خود مولانا عبدالباری ندوی کی زبانی

سلوک ومعرفت میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے ربط وتعلق اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کی کہانی خود مولانا عبدالباری ندوی لکھنوی کے قلم سے پیش کی جارہی ہے جو بڑی سبق آموز ہے اور دلچسپ بھی، ''بزم اشرف کے چراغ'' سے ان کی سرگذشت حیات کا یہ روشن باب سبھی کے لیے چراغ کی حیثیت رکھتا ہے، وہ کہتے ہیں:

''مولانا عبدالماجد دریابادی سے میرے کم وبیش ساٹھ سال کے تعلقات ہوچکے ہیں، جب وہ بی.اے. میں فلسفہ کے طالب علم تھے تو میں ندوہ میں متوسطات کا، ان پر عقلیت، ارتیابیت اور اس کے بعد الحادیت تک کا دور گذرا، ان کے والد مرحوم جب حج کے لیے گئے تو سنا ہے رو رو کر بس ان ہی کے لیے دعائیں کرتے رہے اور دعا ہی نہیں خود بھی ایسے مقبول ہوئے کہ وہیں آخرت کی جنت تک روک لیے گئے، ایک جملہ معترضہ اور کہ تحریکات کے دوران میں ان کو مولانا محمد علی سے بغایت عقیدت ہی نہیں محبت ہوگئی تھی، اور انھیں کی وجہ سے چند دن سیاست میں بھی شریک

(۱) مکاتیب گیلانی ۱/۱۱۹ مرتبہ مولانا منت اللہ رحمانی۔

رہے بلکہ شاید خلافت کمیٹی یوپی کے صدر بھی رہے، اور مولانا محمد علی کی زیرادارت دہلی سے جو "ہمدرد" اخبار نکلتا تھا اس کے بالکلیہ ذمہ دار اور نگراں تھے، "آمدم برسر مطلب" نہیں معلوم کیونکر اچانک ان کو کسی سے بیعت ہونے کا خیال آیا خواہ اس کو الحاد کا ردعمل کہہ لیجئے یا ان کے والد مرحوم کی دعاؤں کی مزید مقبولیت، احقر کے تعلقات ان سے اتنے زیادہ تھے کہ وہ اس راہ میں بھی رفیق طریق بنانا چاہتے تھے، ان کا رجحان مولانا مدنی کی طرف ہوا اور ان سے دونوں کا بیعت ہونا طے ہوگیا، جب ہم لوگ دیوبند اسٹیشن پر پہنچے تو دیکھا مولانا تشریف فرما ہیں، اور ڈبہ کا دروازہ کھلتے ہی بجائے قلی کے خود ہی ہم لوگوں کا سامان اٹھالینا چاہا، کچھ طلباء بھی ساتھ تھے، انھوں نے حضرت سے سامان لے جاکر تانگہ پر رکھ دیا، اور ہم دونوں کو مولانا کے ساتھ بٹھادیا، اس زمانہ میں آپ کا قیام حضرت شیخ الہند کے مکان پر تھا، ہم لوگوں کو بھی وہیں ٹھہرایا اور جس مدعا کے لیے حاضر ہوئے تھے اس کی نسبت فرمایا کہ میں اس کے لائق بالکل نہیں تم دونوں کو مولانا تھانوی سے بیعت ہونا چاہئے، ماجد میاں نے برجستہ اپنی ذہانت کا ثبوت دیا اور عرض کیا کہ حضرت سنا ہے کہ اس راہ کا پہلا قدم تو خودرائی کو فنا کرنا ہے اور ہم پہلے قدم آپ کی مخالفت کریں گے تو آگے کیا چلیں گے، مگر مولانا نے اس قسم کے سارے معروضات سنے اَن سنے فرمادیئے اور دوسرے ہی دن غالباً پہلی گاڑی سے ہم دونوں کو لے کر تھانہ بھون پہنچے، حضرت تھانوی

نماز کے بعد فارغ ہوئے ہی تھے کہ نظر حضرت مدنی پر پڑی پھر ان کو ساتھ لے کر اپنی مستقل نشست گاہ سہ دری میں تشریف فرما ہو گئے، اور جلد ہی ہم دونوں کو حاضری کا ارشاد ہوا، حاضری پر دیکھا تو دونوں میں گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ ہر ایک دوسرے کو کہہ رہا بلکہ اس پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ میں ان کے لائق نہیں، آپ ہی قبول فرمالیں، چند منٹ کے لیے دونوں حضرات نے تخلیہ بھی فرمایا، اس کے بعد پھر ہمارے حضرت مدنی اپنی ہی درخواست پر اصرار فرمارہے تھے، چنانچہ حکیم الامت قدس سرہ نے اپنے حکیمانہ رنگ کا جواب دے کر معاملہ ختم کر دیا کہ نہ تو میں جنید و شبلی ہوں اور نہ ہی آپ، ان کے لیے دونوں کافی ہیں، مگر ان کو مناسبت آپ سے زیادہ ہے اس لیے ان کو آپ ہی اپنے ساتھ لے جائیں، مناسبت کا اندازہ حضرت نے شاید اس طرح فرمایا کہ ماجد میاں تو اس وقت اپنے محبوب و ممدوح مولانا محمد علی مرحوم کے کھدری لباس میں سر سے پاؤں تک ملبوس تھے، اور شاید اس وقت کی رائج الوقت کھدر کی ٹوپی میرے سر پر بھی تھی۔

اس کے بعد سالانہ حاضری تو ہم دونوں کی دونوں جگہ ہوتی تھی، مگر میری زیادہ سے زیادہ ہفتہ دو ہفتہ، ماجد میاں اہل و عیال کے ساتھ کم و بیش ہر سال ماہ دو ماہ مستقل تھانہ بھون میں مقیم و مستفید رہتے، اپنی بدقسمتی اور حیدرآباد کی ملازمت کی پابندیوں کی وجہ سے تعطیلات گرما میں ہفتہ عشرہ یا زیادہ سے زیادہ دو ہفتہ کے لیے تھا بہ بھون میں اور آتے جاتے ایک دو دن کے لیے دیوبند

میں حاضری دیتا، ایک بات رہ گئی کہ دیوبند واپسی پر حضرت مدنی نے ہم دونوں کو بیعت فرمالیا تھا، آخیر آخیر میرے دل میں بھی یہ تقاضا شدت سے پیدا ہوا کہ مستقل تھانہ بھون میں ہی پڑا رہوں لیکن ملازمت کی زنجیر توڑنا آسان نہ تھا، اس کے لیے حضرت تھانوی نے خود حیدرآباد کے صدر اعظم نواب چھتاری کو نواب ممدوح کے سالے یا بہنوئی نواب باغپت کے ہاتھ سفارشی خط لکھا، صدر اعظم نے کار بھیج کر مجھ کو تیسرے پہر کی چائے پر مدعو کیا اور فرمایا کہ میں خود تمہاری سفارش کروں گا کہ تم کو قبل از وقت پنشن دیدی جائے مگر بدقسمتی یا خوش قسمتی کون بدل سکتا ہے، یونیورسٹی کونسل نے جواب دیا کہ ان کی ملازمت میں ابھی پانچ سال اور باقی ہیں اور ہمارے پاس کوئی اور دوسرا آدمی بھی نہیں اس لیے کونسل عذر خواہ ہے، خود حضرت تھانوی کو اس کا اتنا خیال تھا کہ جب مرض الموت میں آخری حاضری ہوئی تو فرمایا کہ چھتاری نے کیا کیا، میں نے پہلے تو خاموشی سے چاہا کہ حضرت اس کی طرف توجہ نہ فرمائیں مگر آپ نے دوبارہ سوال فرمایا تو عرض کرنا پڑا کہ اگر کوئی زوردار صدر اعظم ہوتا تو بیک جنبش قلم کام ہو جاتا مگر کونسل نے یہ لکھ دیا کہ ان کی ملازمت کی مدت پانچ سال باقی ہے اور ہمارے پاس آدمی نہیں ہیں، اس لیے معذوری قبول کی جائے، میں حضرت قدس سرہ کی خدمت میں یہ تفصیل عرض کرنا نہیں چاہتا تھا مگر آخر حضرت کے تاسف سے متاثر ہو کر عرض کرنا پڑا تو فرمایا کہ افسوس چھتاری سے اتنا بھی نہ

ہو سکا، نواب صاحب مرحوم کی عقیدت کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب حضرت بسلسلہ علاج لکھنؤ تشریف لائے تو نواب صاحب اس وقت یوپی کے گورنر تھے، مگر جب حضرت کی عیادت کے لیے حاضر ہوتے تو فرش کے کنارے جہاں دوسروں کی جوتیاں پڑی ہوتی تھیں انھیں کے قریب بیٹھ جاتے بہر حال سارا قصور اپنی کوتاہ قسمتی کا تھا ورنہ ارادہ بھی کر لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے پنشن دلا دی تو خواجہ صاحب کی طرح تھانہ بھون میں ایک مکان کرایہ پر لے کر حضرت کی زندگی تک اسی کو وطن بنالوں گا، مگر اس کا کیا علاج کہ ؎

خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

حضرت تھانوی نے بندہ پر جو عنایات فرمائیں ان میں ایک بات یاد آ گئی جس کی سعادت اس تباہ کار کے سوا شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہے، اہل و عیال کے ساتھ تو کم و بیش تھانہ بھون میں زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ حاضری نصیب ہوتی، باقی آخر میں جب حیدر آباد سے گرمیوں کی تعطیل میں آتا جاتا تھا تو ہفتہ یا دو ہفتہ کی حاضری ہوتی تھی، ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا کہ جب تم اتنی ہی مدت کے لیے آتے ہو تو میرے مہمان کیوں نہ ہو جایا کرو، اللہ تعالیٰ نے میری زبان سے اور حضرت ہی کی صحبت کی وجہ سے یہ نکلوا دیا کہ حضرت آخر میں کیوں اپنے کو اس سعادت سے محروم رکھوں، مگر کھانے کے اوقات و عادات صاف صاف بتلانا ہوں گے، احقر نے عرض کیا کہ معمولاً کھانا

جو آپ کا ہوتا ہے، دال گوشت روٹی احقر کا بھی ہے، البتہ ایک کوئی میٹھی چیز ضرور کھاتا ہوں، پھر دو وقتہ میٹھی چیز کوئی نہ کوئی ضرور ہوتی، کچھ نہیں تو دودھ میں جلیبیاں آخر تک یہی معمول رہا، احقر حضرت کی زندگی کے جس پہلو سے بہت متاثر تھا وہ تقویٰ تھا جو ہدایت یابی کے لیے "ذٰلِكَ الْكِتَابُ" نے "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کی پہلی شرط لگائی ہے، باقی ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

میں جس وقت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، دین و دل کے امراض کے لحاظ سے مہلک امراض میں مبتلا تھا، اس کے بعد جو کچھ بہتری اللہ تعالیٰ نے کسی اعتبار سے پیدا فرمائی وہ بالکلیہ حضرت حکیم الامت کے حکیمانہ معالجات اور جوتیوں کے صدقہ میں ہے۔

راقم الحروف نہ شریعت کا عالم نہ طریقت سے آگاہ، البتہ ان بزرگوں ہی کی خدمت میں کچھ حاضری سے جو کچھ سمجھ میں آیا اس کی بناء پر عرض ہے کہ شریعت وطریقت کا ایسا صحیح ومتوازن اجتماع کہ دونوں میں فرق محسوس نہ ہو، اگر کسی کو دیکھنا ہے تو خانقاہ اشرفیہ میں دیکھے، نہ متصلب سے متصلب عالم شریعت کو حرف گیری کی گنجائش ہو نہ محقق طریقت کو، ایک طرف اگر اللہ اکبر کی کامل نگہداشت "السنة الجليلة فی چشتية العلية" سے ہے تو دوسری طرف شیخ اکبر کی بڑائی کی حفاظت "التنبيه الطربی فی تنزيه ابن العربی" سے ہے۔

تعلیم وتربیت کے لیے تو کہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو بنایا ہی اسی لیے ہے ساری زندگی کا محور یہی معلوم ہوتا ہے، اس باب میں اتنا اہتمام فرماتے کہ خود طالب بھی اپنے لیے مشکل سے کرے گا، بلکہ اس کی نظر ہی وہاں جانا دشوار ہے، مکاتبت، مجالست، مکالمت حتی کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز میں طالب علم کے لیے نفع واصلاح کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور مرعی ہوتا، اس میں مرید ہونے کی بھی شرط نہیں بعض حیثیات سے تو ایسا یاد آتا ہے کہ حضرت نے خود فرمایا کہ وہ تعلق ارادت کے بغیر زیادہ آزادی ووسعت محسوس فرماتے ہیں۔

اکثر اطباء علاج میں صرف مرض کا خیال کرتے ہیں مریض کا نہیں، شخصی حالات یا زمان ومکان کے اختلافات پر بہت کم نظر جاتی ہے، حضرت کے یہاں روحانی معالجہ میں دونوں باتوں کا پورا لحاظ رہتا، مثلاً کم خوری، کم خوابی یا دیگر ریاضیات شاقہ وغیرہ کو اس زمانہ کے لوگوں کے لیے بالعموم ترک ہی فرمادیا، اذکار و اشغال وغیرہ تمام چیزوں میں طبیعت کی مناسبت اور برداشت کا خاص خیال رکھتے، زیادہ زور احکام پر تھا، تشخیص مرض اور نفس شناسی میں تو حضرت کی بصیرت حیرت انگیز ہے، جہاں حضرت کی نگاہ پہنچتی تھی وہاں کسی ماہر نفسیات کی نگاہ کہاں پہنچے گی۔

ایک شخص اپنی جس صفت کو تواضع سمجھ رہا ہے، حضرت کی نگاہ اس کو کبر کا مرض تشخیص فرماتی ہے اور پھر مرید کو خود نظر آجاتا ہے کہ ہاں یہ تواضع نہیں کبر تھا، بعض مرتبہ کوئی آدمی اپنا کوئی ایسا حال

بیان کرتا ہے کہ دوسرا مرشد تو شائد اس کی ولایت کی تصدیق کردے گا مگر حضرت یبوست دماغ کا علاج کرانے کی ہدایت فرماتے ہیں، اسی طرح دوسری طرف بعض حالات وخیالات پر انسان کو اپنے کفر ونفاق تک کا گمان ہونے لگتا ہے لیکن حضرت کی تشخیص میں وہ ایمان واخلاص کے منافی نہیں ہوتے، کم ہمت سے کم ہمت کو بھی حضرت ہمت شکستہ نہیں ہونے دیتے، بلکہ جہاں تک بھی اس کی ہمت یاری کرے دین کا یسر یہ ہے کہ خدا سے لپٹائے رکھتے، عادات واخلاق میں سب سے نمایاں وصف بے تکلفی اور ضبط اور انتظام تھا، محض تکلف یا رسم ورواج کی خاطر کوئی ایسی بات نہ تو پسند اور نہ ہی اختیار فرماتے جو اپنے یا دوسرے کے لیے بار خاطر یا حقیقی نفع کے منافی ہو، لیکن چونکہ لوگ عام طور سے تکلف وتصنع کے ہی عادی وطالب ہوگئے ہیں، حضرت کی معاشرت میں بعض باتیں نامانوس نظر آتی ہیں اور غلط فہمی کا سبب بن جاتی ہیں، مثلاً:

لوگ کثرت سے حاضر ہوتے رہتے جن کی عام طور سے مہمانداری کا اہتمام حضرت نے اپنے ذمہ نہیں رکھا، ابتداء میں کچھ دن رکھا تھا، مگر حضرت کی طبیعت وطریقہ سے جو لوگ واقف تھے، جانتے ہیں کہ چھوٹا بڑا جو کام بھی اپنے ذمہ قبول فرمالیتے، اس کا پورا اہتمام وحق بھی ادا فرمانا چاہتے تھے، جس کا اثر لازماً ارشاد وافادہ کی ان خدمات پر پڑتا جو حاضر ہونے والوں کا اصل مقصود ہوتا، یاد آتا ہے کہ خود حضرت نے بھی یہی وجہ بیان فرمائی تھی۔

اسی طرح دیکھا کہ بعض آدمی پہلے سے اپنے حالات وخیالات کی اطلاع کے بغیر خدا جانے کن کن مزعومات کے تحت آجاتے اور پھر نہایت بے فکری کے ساتھ بے سروپا سوال وجواب شروع کردیتے، حضرت کو اس سے قدرۃً گرانی ہوتی، خصوصاً اس لیے کہ حضرت خود دوسروں کے بارے میں بہت فکر فرماتے، اس کے علاوہ اس طرح آپڑنے والوں کو اگر اپنے مزعومات میں مایوسی ہو تو ممکن ہے کہ کچھ نفع حاصل کرنے کی جگہ الٹے سفر اور زحمت سفر کا تاسف واپس لے کر جائیں، باقی جہاں تک سچی راحت وسہولت، ہمدری وخیر خواہی اعانت ورعایت کا تعلق ہے وہ جتنی حضرت دوسروں کی فرماتے وہ خود بھی بیچارے نہیں کر سکتے، اس کا اندازہ راقم کے چند معمولی تجربات سے ہوگا، ایک دفعہ گھر کے لوگوں کے ساتھ حاضر ہوا، خانقاہ کے قریب کرایہ کا جو مکان لینا چاہا، مالک مکان نے اس کا کرایہ ایک روپیہ کہلا بھیجا، حضرت نے فرمایا کہ نہیں آٹھ آنے، میں نے عرض کیا کہ ایک روپیہ زیادہ معلوم نہیں ہوتا، فرمایا کہ بہت بیچارے ایسے بھی آتے ہیں کہ ان کے لیے یہ بھی زیادہ ہوگا اور جو شرح ایک دفعہ قائم ہوجاتی ہے مالک مکان اس کے متوقع رہتے ہیں، پھر مجھ سے فرمایا کہ مکان دیکھ لیا ہے، ٹھیک ہے؟ عرض کیا جی ہاں! اس کے بعد مجھ کو ساتھ لے کر خود ملاحظہ کیا اور خاص طور سے بیت الخلاء کو دیکھا جس کی طرف میرا ذہن بھی نہیں گیا تھا، یہ بہت تنگ اور غالباً ایک ہی قدمچہ تھا، فرمایا مستورات کو تکلیف ہوگی، اور دو ہی

چار روز بعد حضرت کا آستانہ خالی ہوگیا، وہ عطا فرمادیا، جس میں بہت آرام تھا۔

ایک بار جس مکان میں قیام ہوا وہ خانقاہ سے ذرا فاصلہ پر تھا، صبح کی مجلس کے لیے خاص طور پر پہلے مجھ کو اطلاع کراتے پھر خانقاہ والوں کو تا کہ فاصلہ کی وجہ سے ان سے نہ بچھڑ جاؤں، ساتھ یہ بھی فرمادیتے کہ اطلاع کا مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ اب میں فارغ ہوں، جی چاہے آسکتے ہو۔

ہر حاضری میں کئی کئی وقت حضرت کا مہمان رہنے کی سعادت حاصل رہی، بعض اوقات ہم طعامی کا بھی شرف بخشتے لیکن اکثر خصوصاً جب ایک سے زیادہ مہمان ہوں تو یہ تکلیف نہیں فرماتے، تکلف پسند مہمانوں کو یہ بات گراں ہوسکتی ہے، راقم بھی اس کی توجیہ سے قاصر تھا، ایک مرتبہ خود ہی فرمایا میزبان کے ساتھ مہمان بے تکلف ہو کر نہیں کھاتا، اندازہ کرنا چاہئے کہ جب اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں میں ایسی دقیق رعایتیں فرماتے تھے، تو مہمات امور میں کیا کیا حکمتیں نہ پیش نظر رہتی ہوں گی۔

یہی صورت پابندی اوقات کی تھی کہ عام طور پر کام کا وقت بندھا ہوتا تھا۔

اس میں اپنے اور دوسروں سب کے لیے جو کثیر منافع ہیں ان سے کون انکار کرسکتا ہے، تصنیفات و تالیفات کی سیکڑوں تک تعداد، خانقاہ کے مقیموں اور باہر سے حاضر ہونے والوں کو بلا ناغہ دو وقت کی مجلس میں چار پانچ گھنٹے مستقلاً استفادہ کا موقع،

روز کے روز تمام خطوں کا جواب جن کی اوسط پندرہ بیس رہتی تھی، یہ سب اسی پابندی اوقات اور انتظام کی برکات تھیں لیکن قواعد انسان کے لیے ہیں انسان قواعد کے لیے نہیں کہ ان میں مستثنیات نہ ہوں، مغرب کے بعد عموماً ملاقات کا وقت نہیں لیکن راقم نے جب تخلیہ میں کچھ عرض کرنے کی درخواست کی تو مغرب کے بعد بھی آدھ آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت عطا فرمادیا، اور جب تک کچھ عرض کرتا رہا تشریف فرما رہے، ایک مرتبہ تو شاید عشاء کا وقت اسی میں آ گیا، تعویذ لکھنے کا وقت ظہر وعصر مابین مجلس ہوتا، لیکن ایک مرتبہ میرے ملازم کو ضرورت پڑی تو بلا میری درخواست کے خود ہی نہایت شفقت سے عشاء کے بعد تحریر فرمادیا۔

راقم ہذا کے جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کی فطرت کو زود اعتقادی سے کتنا بعد ہے اور چشم بد بین کے لیے کتنا بدنام ہے، لیکن حضرت کی شخصیت میں اس کو سراپا شفقت ومحبوبیت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا، یہ حال تو ایک ظاہر بین اور ناقص نظر کا تھا، باقی دیدہ کامل کو کیا کچھ نظر آتا ہوگا یہ کسی کامل سے پوچھنا چاہئے۔

عجب بات ہے کہ جس طرح رسوم وتکلفات کی عادت بعضوں کی نظر سے حضرت کی سچی شفقت اور حقیقی لطف وکرم کو چھپا لیتی ہے اسی طرح عبارت آرائی کی جستجو حضرت کی تالیفات وتصنیفات کے معاملہ میں بہتوں کو لفظ بگذار وسوء معنی روی سے محروم کر دیتی ہے، سطحیت پسندی اس زمانہ کی عالمگیر وبا ہے، تحریر میں بھی لوگ تکلف وتصنع شاعری ولفاظی کے اتنے خوگر ہو گئے ہیں کہ خالص

علم طلبی و معنی جوئی کے لیے مشکل ہی سے کوئی کتاب یا مضمون پڑھ سکتے ہیں، ایک اچھے دیندار صاحب علم کو حضرت کی تصانیف کے متعلق کہتے سنا کہ پڑھنا چاہا لیکن پڑھی نہیں جاتیں، خود راقم السطور بھی اس مرض میں مبتلاء رہا، والد صاحب مرحوم حضرت کی اکثر کتابیں وغیرہ منگواتے رہتے تھے، بارہا مجھ سے بھی استفادہ کے لیے ارشاد فرماتے، مگر زبان کے چٹخارے پر جان دینے والے کو جان بخش غذا کی طرف کیا رغبت ہوتی۔

حضرت کی خدمت میں حاضری کے بعد سے حضرت کے علوم و معارف کا کچھ اندازہ ہوا، اب تو بلا مبالغہ یہ حال ہے کہ ''چشم بدبین نہ کند بہ کس نگاہے'' جتنا علم جتنا عمق اور جتنا ذوق واثر حضرت کی تحریروں میں ملتا ہے، کہیں نصیب نہیں، حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کثیر تصانیف کے باوجود حضرت کا طرز تحریر اتنا قلیل اللفظ کثیر المعانی کیسے ہے، پھر اکثر دیکھئے گا کہ جس معنی و مفہوم کو جس لفظ و عبارت سے ادا کیا گیا جو صحت و جامعیت اس میں ہے وہ اس کی جگہ دوسری تعبیر سے حاصل نہیں ہوتی، سچ پوچھئے تو انشاء کا بھی اصل کمال یہی ہے۔(۱)

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب سے اصلاحی ربط و تعلق

حضرت مولانا عبدالباری ندوی جو کہ حکیم الامت کی جانب سے سند یافتہ روحانی طبیب و حکیم اور مرد دانا و بینا تھے، پھر وہ حضرت حکیم الامت کے ہی ایک ممتاز خلیفہ اور اپنے عہد کی مصلح شخصیت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے ایک مریض

(۱) بزم اشرف کے چراغ از پروفیسر سعید احمد صاحب، ص/۲۷۶-۲۸۳۔

روحانی بن کر کیونکر جا پڑے؟

درحقیقت یہی ان کا کمال اور ان کی فنائیت وتواضع کی بات اور اس حقیقت پر یقین کا عمل ہے کہ انسان خواہ جتنا ہی علم وعمل کی راہوں سے گذرتا جائے، جب تک وہ دنیا میں ہے شیطان کے نرغہ سے بالکلیہ آزاد نہیں ہے، اور اس کے لیے ہم نئے نئے باطنی امراض کے پیدا ہونے کے خطرات ختم نہیں ہوتے ہیں کہ وہ اپنے کو طبیب روحانی سے آزاد کرالے جس طرح آخر وقت جسمانی معالج سے کوئی بھی اپنے کو آزاد نہیں خیال کرسکتا۔

رہی یہ بات کہ ان کی نظر انتخاب حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب پر ہی کیوں پڑی جبکہ خود ان کے شیخ بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی باحیات تھے(۱) اور خود ان کے شیخ تربیت حکیم الامت حضرت تھانوی کے کئی اہم اور ایسے خلفاء بھی موجود تھے جن کو حضرت تھانوی نے اپنے مسترشدین کے لیے رجوع واستفادہ کے خاطر گیارہ رکنی فہرست میں (جس میں مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کا نام بھی شامل تھا) ان سے مقدم وسرفہرست رکھا تھا، ان میں ایک دو تو جیسے حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب اور حضرت شاہ محمد عیسیٰ الہ آبادی وفات تھانوی کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں انتقال کر گئے مگر اور حضرات بعد میں عرصہ تک بقید حیات رہ کر افادۂ خلق کے کام میں مصروف رہے، حضرت مولانا عبدالباری ندوی کی حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

---

(۱) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے سانحہ وفات سے کون تھا جو متاثر نہ ہوا تھا، مولانا عبدالباری ندوی تو ان کے عاشق زار اور خدمت عالی میں بار بار لمبی لمبی مدت قیام کر کے عشق حقیقی اور دولت باطنی کے حصول کے لیے سرگرداں رہتے، ان کی طبیعت بڑی ہی بے چین وبیقرار ہوتی، اطباء روحانی پر نظر ڈالتے، کسی پر بھی جہاں وہ وقت فارغ کر کے رہ سکیں، نگاہ جمتی نظر نہ آتی، ان کے شیخ بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی جن سے وہ استفادہ کا رابطہ رکھتے تھے، مگر ان کے ہجوم کار، اسفار کی کثرت، قید وبند کی صعوبتوں اور ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد میں زیادہ وقت لگانے، مزید برآں تدریسی خدمات کیوجہ سے مرشد تھانوی کے ہی جانشینوں پر گئی، اور حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کی خانقاہ پر جا پہنچے۔

سے استفادہ کے لیے مناسبت کے جو بھی اسباب رہے ہوں ایک بڑا سبب ان کا نمایاں وصف فنا فی اللہ اور بقاء باللہ نظر آتا تھا، اور نمایاں دعوت ازالۂ نفاق و اصلاح اخلاق نظر آتی ہے، جس کے متعلق مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے بڑی جامع بات کہی ہے کہ ''جس کے گرد اُن کی پوری دعوتی و اصلاحی جدوجہد گردش کرتی رہی۔''(۱)

اس کی وضاحت کے لیے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی تحریر کا وہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو انھوں نے حیات مصلح الامت کے مقدمہ کے طور پر قلمبند فرمائی تھی، وہ لکھتے ہیں:

> ''اصلاح معاملات و اخلاق اور اصلاح معاشرت و اصلاح رسوم وہ عنوان و میدان ہے جس کے اس دور میں امام و مجدد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تھے، اور میری ناقص معلومات میں اس میں ان کے نقش قدم پر ان کے خلفاء میں (جو سب کے سب قابل احترام ہیں) سب طرف سے آنکھیں بند کر کے چلنے والے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری نظر آتے ہیں۔''(۲)

آگے لکھتے ہیں:

> ''حضرت کی زندگی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے شیخ کی طرح تصوف کے رسوم و مظاہر اور سلسلہ کی توسیع و اشاعت سے مستغنی ہو کر اور ان سے صرف نظر کر کے اصلاح و تربیت کے کام میں سرگرمی کے ساتھ مشغول تھے، اور "ولا یخافون لومة لائم" پر پورا عمل تھا، ظاہر کے بجائے باطن پر، قشر کے بجائے لب پر اور جسم کے بجائے جوہر پر نظر تھی، مسلمانوں کی

---

(۱) از مقدمہ حیات مصلح الامت از مولانا اعجاز احمد اعظمی۔

(۲) حیات مصلح الامت از مولانا اعجاز احمد اعظمی، ص/۵۔

زندگی، امراض باطنی، معاشروں کی خرابیوں اور شاہ ولی اللہ صاحب کی اصطلاح میں ''غوائل رسوم'' پر گہری نظر تھی، حاضرین کو آپ کی مجالس میں شریک ہو کر صرف حلاوت ایمانی اور ذوق عبادت اور خیال آخرت ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، بلکہ اپنی کمزوریوں کا اور اپنی خصوصی بیماریوں کا بھی احساس ہوتا تھا، اور وہ ان مجالس سے محض اطمینان لے کر نہیں اٹھتے تھے، اصلاح حال کا خیال اپنی خامیوں کا احساس اور پچھلی زندگی پر ندامت بھی لے کر واپس ہوتے تھے، جو اہل اللہ کی مجالس اور مصلحین امت کی خدمت میں حاضری اور مجلسوں میں شرکت کا اصل فائدہ اور ثمرہ ہے۔''(۱)

''چار ہفتہ ایک کہف میں'' (☆)

مولانا عبدالباری ندوی اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''.....تھانہ بھون کا چمن جب سے اجڑا، اس آوارہ و ناکارہ کو اپنی شامت اعمال سے بھاگنے اور پناہ لینے کے لیے کوئی گوشہ نہ ملتا تھا، کبھی کبھی بیقراری میں دوسرے حلقوں کی طرف نگاہ دوڑائی، مگر تھانہ بھون نے نظر ایسی بگاڑ دی ہے کہ معاملہ ''چشم بد بین نہ کند بکس نگاہے'' ہی کا رہا، ادھر آپ جانتے ہیں کہ بعض اسباب نے

---

(۱) حیات مصلح الامت از مولانا اعجاز احمد اعظمی، ص/۶

(☆) یہ وہ اہم روح پرور مضمون ہے جو مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرشد حکیم الامت حضرت تھانوی کی وفات کے بعد تلاش مرشد میں بیقراری کے نتیجہ میں انھیں کے ایک عظیم المرتبت خلیفہ حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کے دربار میں رسائی کے بعد تحریر کیا تھا، اور مکتوب کی شکل میں مدیر ''صدق'' اور اپنے رفیق قدیم مولانا دیابادی کو روانہ کیا تھا، جسے انھوں نے ''صدق'' میں شائع کیا اور عنوان لگایا ''چار ہفتہ ایک کہف میں'' اور بعض مصنفین نے اپنی کتابوں میں اس کو جگہ دی، اور بعینہٖ پورا مضمون شائع کیا، اس کی حیثیت طالبین سلوک کے لیے ایک ناقابل فراموش باب کی ہے۔

شدت اضطرار کی صورت پیدا کی، کہیں نہ کہیں فرار سے چارہ کار نہ رہا، انتظار شاید اسی "المضطر إذا دعاہ" والے اضطرار کا تھا۔

تا نہ گریہ طفل کے جوشد لبن (۱)

آپ ہی آپ کہنا چاہئے کہ بالکل الہاماً، نام ذہن میں مولانا وصی اللہ صاحب فتح پور تال نرجا اعظم گڑھ کا آیا، کوئی ملاقات یا نیم ملاقات کیا صورت تک کبھی دیکھنا یاد نہ آرہی تھی، لیکن خیال آنا تھا کہ زیارت کا تقاضا قلب میں تیز ہوتا ہی گیا، ابتداء نیم زیارت سے کی، خصوصیت سے بعض ناموافق دنیوی حالات عرض کئے، جو اس اضطرار کے ظاہری باعث اور فرار کے محرک ہو رہے تھے، جواب کیا آیا کہ کسی نے آگ پر برف رکھدی۔

"دنیا میں اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا مدار دنیا کے ہونے نہ ہونے پر نہیں، ممکن ہے کہ دنیا موافق ہو اور اللہ تعالیٰ ناراض ہوں اور دنیا موافق نہ ہو لیکن اللہ تعالیٰ راضی ہوں، لیکن ہم لوگ ضعیف ہیں اس لیے دعاء فلاح دارین کی کرنی چاہئے، میں بھی کرتا ہوں۔"

بات بالکل ہوئی ہے تاہم استحضار خواص اہل علم وصلاح کو بھی اس کا کم ہی رہتا ہے لیکن حضرت حکیم الامت کی تعلیم وتربیت میں گونا گوں حکیمانہ عنوانات سے یہ سبق اتنا رٹایا جاتا تھا کہ اس غافل وغبی کو بھی ذہول ہرگز نہ ہوتا تھا، خود اپنے اور دوسروں کے لیے اس کی فہم وتفہیم سے کچھ نہ کچھ تسکین وتسلی کا سامان ہوتا ہی رہتا تھا، مگر مکتوب بالا سے جیسی خنکی قلب کو نصیب ہوئی، اس نے ایسے مواقع کے تھانوی مکتوبات کی تاثیر وتسلی کی یاد تازہ کردی۔

---

(۱) جب تک بچہ نہ روئے چھاتی میں دودھ کا ابال کیسے ہو۔

اوراد و وظائف وغیرہ کی اجازت کا بزرگوں میں جو ایک دستور چلا آرہا ہے مجھ کو تو اس کی بناء بھی کچھ یہی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ قول و تعلیم میں قائل و معلم کے مرتبہ و مقام کی جو تاثیری برکت ہوتی ہے وہی نوعیت اس اجازتی نسبت کی بھی ہے۔ واللہ اعلم عند اللہ۔

معلم و مربی کی شخصیت ہی کی دوسری زیادہ محسوس و مشاہد کرامت ملاحظہ ہو!

نالائق زادوں کی نالائقیوں سے آپ واقف ہیں، اپنی والی اصلاح و درستگی کی کوئی فکر و تدبیر اٹھا نہیں رکھی، تھانوی و غیر تھانوی دونوں رنگ کے بعض مدرسوں اور مربیوں کی اس بدحالی کے حال پر خاص عنایت و شفقت ہے، اس کا حق مہینوں اور برسوں نالائق زادوں کے حق میں بھی انھوں نے ادا فرمایا (جزاہم اللہ عنی وعنہم) مگر معلوم ایسا ہوتا رہا کہ ہر تریاق زہر کے اثر کو تیز کرتا چلا جا رہا ہے، برا بھلا ایمان رکھ کر اللہ تعالیٰ سے تو کیسے مایوس ہوتا لیکن اسباب و تدابیر سے ہار قطعاً مان چکا تھا، جی میں آیا کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان نالائقوں کی اصلاح کا وسیلہ اپنے اس خاص وصی اللہ ہی کی وصیت تقویٰ "أوصیکم بتقوی اللہ" کو ٹھہرا رکھا ہو، سب کی انتہائی نالائقیوں کا کچا چٹھا لکھ بھیجا، ایسی انتہائی جن کی بدولت قریب کے قریب عزیز بھی روادار نہ تھے، کہ ان کے قریب کھڑے ہوں، اندیشہ تھا اور بالکل واجبی تھا کہ مولانا بھی اپنے مدرسہ و خانقاہ کی فضا مسموم کرنا کیسے پسند فرمائیں گے، ساتھ ہی ساتھ صاف صاف لکھنا بھی ناگزیر تھا، کہ کوئی دھوکہ یا غلط فہمی نہ رہے، جواب مختصر تھا، لیکن حق تعالیٰ پر توکل و اعتماد کا پورا غماز اور جلد از جلد بھیج دینے کی ہدایت۔

بسم اللہ پہلے ایک سے کی اور صرف ایک چلہ کے لیے، واپسی پر دوسرے کی ہمت کی جو پورا حافظ ہو چکنے اور محراب سنا چکنے کے بعد اتنا بگڑا تھا کہ کہیں ٹھہرتا ہی نہ تھا، ایک ابتدائی اچھے اور ایسے مدرسہ میں جہاں کے مہتمم اور اساتذہ راقم ہذا کے ساتھ

خصوصی عنایت ومحبت کا معاملہ رکھتے ہیں، بالآخر وہاں سے بھاگا، کئی بار سمجھا سمجھا کر بھیجا گیا، ہر بار بھاگا، کبھی راستہ ہی سے اور کبھی پہنچ کر اور سال بھر سے تو اب آوارہ گرد ہی تھا، جب تک خود مولانا کے قلم سے فتحپور پہنچ جانے کی رسید نہ آئی برابر احتمال رہا کہ راستہ ہی سے کسی اور طرف کا راستہ نہ لیا ہو، خیال تھا کہ کم از کم دو مہینے تک جاتا، تو پہلے کے تجربہ سے اتنی امید پڑ چکی تھی کہ انشاء اللہ غیر متاثر یہ بھی نہ رہے گا، ایک مہینہ ہی ہوا ہوگا کہ خود ہی خواہش کی ایک سال اور رہنے دیا جائے، غرض راستہ دونوں کا بحمد للہ بدلا معلوم ہوتا ہے، رفتار تبدیلی کی سست البتہ بہت ہے، دل ساتھ دے نہ دے، زبان پر سالہا سال سے حقیقی مربی کی سکھائی ہوئی دعاء تو جاری رہی ہے "رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَاماً."

بہر حال دونوں کے معاملہ میں اس خلاف امید کیا بالکل کرامتی تجربہ نے خود اپنا شوق زیارت قدرۃً زیادہ بڑھا دیا اور یہ تصور وتوقع باندھ کر حاضر ہی ہوگیا کہ ؎

چونکہ گل رفت و گلستان شد خراب
بوئے گل را از کہ جویم جز گلاب

حاضری پورے ایک مہینہ رہی، تھانہ بھون کے اجڑے ہوئے گلستان کی بوئے گل سے فتح پوری گلاب تصور وتوقع سے بڑھ کر مشام جان کو معطر کرتا رہا، بارك الله فی برکاتهما.

مہینہ بھی دن رات کی برکتوں والا رمضان المبارک کا تھا، عام مسجدوں میں ہمارے عام اماموں اور مقتدیوں کی جہالت کی بدولت نماز و جماعت کی جو گت ہوتی ہے، اس کے زخم رسیدہ شاید آپ بھی کم نہیں، اور یہ کم ظرف تو مسجد کی حاضری کا بس فرض ہی اتارتا ہے، خصوصاً رمضان میں قیام وتراویح کی گت کیا ایسی درگت

ہوتی ہے کہ بارہا مسجد میں تراویح کو دور ہی سے سلام کرنا پڑتا ہے، یا ہو پاتا ہے تو گھر میں انتظام ہو جاتا ہے، لیکن فتح پور میں اس برکتوں بھرے مہینہ کی جیسی جیسی ظاہری و باطنی برکتیں محسوس و مشاہد ہوئیں، زندگی میں یاد نہیں، سو ڈیڑھ سو بلکہ دو سو تک کی جماعت عوام کی نہیں، علماء و صلحاء، ذاکرین و شاغلین کی، اور امام (مولانا مدظلہ کے داماد) قاری محمد مبین سلمہ کا تو کہنا ہی کیا، ماشاء اللہ چہرہ باطنی و بطنی آثار سعادت کا آئینہ بہت ہی نمایاں "أثر السجود" سے پرانوار، رفتار و گفتار میں سراپا عجز و انکسار، نماز میں قرأت بالکل دل کی آواز، یہ بے بہرہ ساتھ ہی خاصا بہرہ آواز کے سوا الفاظ کم ہی سن پاتا تھا لیکن نفس تکبیر "اللہ اکبر" ہی کی لذت و حلاوت ایسی کہ آج تک کانوں میں بسی ہے، ترویحہ کا حق بھی پورا ادا ہوتا، جتنا قیام کم و بیش اتنی ہی استراحت، نہ مزدور حافظوں کی "یعلمون، تعلمون" والی دوڑ بھاگ کہ ایک کا بوجھ اتارا، اور مزدوری وصول کر کے دوسری کے لیے بیتاب، نہ سننے والے ہی کسی نہ کسی طرح بس ایک ختم کی بے گار جلد از جلد پوری کر کے مٹھائی چراغاں کا تماشا دیکھ دکھلا کر آمادۂ فرار۔ (۱)

کم از کم ایک پارہ کا اوسط رہا، ۲۸ر کو ختم ہوا، نہ ختم کی مٹھائی نہ چراغاں کا تماشہ نہ مٹھائی اور تماشہ والے نئے نئے نمازیوں کی بھیڑ بھاڑ، نہ نماز کے دوران ہی سے نماز برباد کرنے والا مسجد کے اندر باہر بچوں اور عورتوں کا شور و شغب، اس سب کی جگہ عاجزی و بندگی والی عبادت و عبودیت کا یہ نظارہ کہ ختم کے بعد دعاء میں امام سلمہ پر رقت و گریہ کا کچھ ایسا عالم طاری ہوا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ساری

---

(۱) حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کی وفات کے بعد ان کے جانشین یہی حضرت تسلیم کئے گئے، دامادوں میں دوسرے حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب الہ آبادی بھی آج حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کے علوم و معارف کے احیاء اور نشر و اشاعت کے کام میں مصروف عمل رہ کر تربیت مریدین میں بھی بڑی شہرت رکھتے ہیں، أطال اللہ بقاءھما و بارك فی فیوضھما و برکاتھما.

صفیں زار و قطار رو ہی تھیں، آہ و بکاء سے مسجد کے در و دیوار گونج رہے تھے ع

حالت رفت کہ محراب بہ فریاد آمد

دس پندرہ منٹ تک یہی حالت رہی ہوگی اور بڑھتی ہی جارہی تھی، غالباً حد سے بڑھتی دیکھ کر آخر خود مولانا ہی نے حکیمانہ و حاکمانہ لہجہ میں فرمایا کہ ''بس مبین بس۔''

عجب نرالا رنگ نہ دوکاندارانہ پیری مریدی نہ رائج الوقت قسم کا کوئی ادارہ و انجمن نہ مدرسہ نہ مرکز نہ جلسہ و خطابت نہ انشاء پردازی نہ انشاء گفتاری نہ اعلانی و اشتہاری تبلیغ و دعوت نہ زبردستی لوگوں کی گھیر گھار بلکہ دینی و اخلاقی ظاہری و باطنی ہر طرح کی کوتاہیوں اور خامیوں پر "أوصیکم بتقوی اللہ" کی گرج و پکار، مواخذہ و گرفت، گھڑکیاں اور جھڑکیاں، جگہ کوئی بڑا چھوٹا شہر کیا قصبہ تک نہیں کہ آنے جانے والے ہی محفل کی رونق بڑھا رہے ہوں، بجز دیہات اور کوردہ نہ ریل، سڑک نہ سواری، ڈاکخانہ ندارد، اگر خود اپنا اخبار نہ جاتا تو کسی اخبار تک کی صورت نہ دکھائی پڑتی، گویا بیسویں صدی کا کہف، لیکن مخلوق ہے کہ دور و نزدیک چھوٹی بڑی بستیوں ہی سے نہیں دوسرے صوبوں تک سے جوق در جوق اس کہف کی طرف بھوکی پیاسی روزہ رکھے مئی کی چلچلاتی دھوپ اور لو میں زیادہ تر پیدلوں یا سائیکلوں پر کھنچی دوڑی چلی آرہی ہے، روزانہ رمضان بھر یہی تانتا بندھا دیکھتا رہا، عوام بھی خواص بھی، امیر بھی غریب بھی، جوان بھی بوڑھے بھی، نئے بھی پرانے بھی، ڈاکٹر بھی طبیب بھی، دس دس پندرہ پندرہ تک کا اوسط تو خالی علماء ہی کا رہتا تھا، ایسے دور افتادہ ویرانہ میں خلقت کی یہ کشش سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ ؎

ہر کجا بوئے خدا می آید
خلق بیں بے سر و پا می آید

ظاہری رنگ اس بوئے خدا کا ذرا جذب و جوش اور جلال کا ہے مگر باتیں ماشاء اللہ خوب ہوش و کمال کی، سالک مجذوب کی بڑی دلکش جامعیت و شخصیت، نکلا تو تھا زیادہ تر کچھ تھانوی شخصیت تعلیم و تربیت کی امید لگا کر لیکن پائی ساتھ ساتھ حکیم الامت کے حکیمانہ و عارفانہ علوم کی شان بھی اس کی زبردست توثیق اپنوں سے بڑھ کر پرایوں کے محبّ اعز و اکرم مولانا علی میاں سلمہ کی شہادت ہے جو بڑی حد تک بالکل ایک دوسرے مذاق و مسلک کے بزرگ سے وابستہ و فیض یاب رہے ہیں۔

احقر کے دوران قیام ہی میں ممدوح کا ایک مکتوب مولانا مدظلہ کی خدمت میں گیا، اصل درخواست تو ماہ مبارک (رمضان) میں خود اپنے حق میں خاص دعاؤں کی تھی، ضمناً حضرت مولانا کے علوم و افادات سے اپنی مناسبت و استفادہ کا بھی ذکر بطور خاص ہی تھا، علم و فضل کے گوناگوں کمالات کے باوصف چونکہ موصوف سلمہ کا رنگ دوسرا ہی ہے، اس لیے تھانوی رنگ کے کسی بزرگ سے اتنی مناسبت پر کچھ حیرت کے ساتھ مجھ کو مسرت زیادہ ہوئی، اس کا اظہار بے ساختہ فتح پور ہی سے ایک نیاز نامہ میں کیا تھا، جواب لکھنؤ کی واپسی پر توثیق مزید کا وہی ملا کہ واقعی مولانا مدظلہ کی خدمت میں دوبار حاضری ہوئی اور ان کے علوم و افادات سے مناسبت معلوم ہوئی اور بہت مخلصانہ و عارفانہ باتیں معلوم ہوئیں، اللہ تعالیٰ ان کی ذات بابرکات کو تادیر سلامت رکھے، ایک معاملہ میں حضرت فتح پوری اپنے مرشد اعلیٰ حضرت تھانویؒ سے آگے ہی نظر آئے، یعنی کتابوں پر بھی بڑی نظر ہے، اخلاق محسنی، سکندر نامہ تک پر تفسیر و حدیث اور فقہ کی متداول کتابوں کا تو ذکر ہی کیا، باقاعدہ درس بھی ہوتا ہے، ایک دو نہیں روزانہ چھ چھ سبق، رمضان شریف کی وجہ سے یہ سلسلہ بند تھا، ورنہ شرکت کی سعادت ضرور حاصل کرتا، البتہ حضرت ممدوح کا جو عام رنگ ہے اس سے قیاس ہوتا ہے کہ آج کل کے دینی مدارس کی طرح خالی کتابوں کی تعلیم و تفہیم شروح و حواشی کی ردوقدح پر قناعت نہ فرمائی

جاتی ہوگی بلکہ دینی تعلیم کی عملی روح و باطنی پہلو قلب و قالب دونوں کی اصلاح اور خدا و آخرت سے تعلق پر بھی ساتھ ساتھ پورا زور دیا جاتا ہوگا، کہ اسی کمی نے نام نہاد دینی تعلیم پر بھی دنیوی رنگ چڑھا دیا ہے، کتابوں کی الماریاں مجلس میں سامنے رکھی ہیں، ذرا کوئی اہم بات ہوئی فوراً کتاب نکالتے نکلواتے اور سند و شہادت پیش ہو جاتی ہے، کثرت سے کتابوں میں نشانیاں رکھی ہوتی ہیں، مطلوب مقام بات کی بات میں نکالتے ہیں، مجلس میں بہت محققانہ و عارفانہ ہی نہیں بڑے بڑے پتہ کی باتیں ہاتھ آتی رہتی ہیں، خصوصاً طالبین و سالکین کے لیے اور کم و بیش سب کی تائید و توثیق اگلے پچھلے مسلم اکابر کی کتابوں اور سندوں سے فرماتے جاتے ہیں۔ ع

صلاح کار کجا و من خراب کجا

یہ سیہ کار و تباہ کار ظاہر اور اس سے کہیں بڑھ کر باطن کا کورا ہی کورا ہے، البتہ کچھ اللہ والوں ہی کی صحبت میں صالحین کی صحبت ضرور نصیب ہوگئی "أحب الصالحين و لست منهم" کا تھوڑا بہت غم بھی کھاتا رہتا ہوں، مگر اس سے نہ کوئی خاص تسلی نہ اس کی کوئی خاص قدر و نعمت کہ اپنی ناکامی و نارسائی کی حسرت بھی حق تعالیٰ کی بڑی قابل قدر نعمت ہی ہے۔ ع

بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے

ایک مجلس میں کچھ اس حسرت و درد کی راہ سے اہل طلب و سلوک کی تسلی فرمائیاں ہو رہی تھیں کہ مکتوبات رشیدیہ (حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ) نکال کر ایک مکتوب کا یہ وجد آفریں ٹکڑا سنانے لگے کہ ہمارے شیخ الشیوخ قطب عالم شیخ عبدالقدوس (گنگوہی) فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو بعد مجاہدہ ہزار سالہ حسرت و درد نایافت حاصل ہو جائے تو سب کچھ حاصل ہو گیا، ہائے افسوس کہ درد نایافت ..... نہیں ملتا کہ کام ہو جائے، اس مفلس کنگال کو تو جیسے بے شان و گمان کوئی بڑا خزانہ ہاتھ

آ گیا، گھنٹوں حضرت عطار کا ایک مصرعہ دعا والتجا بن کر بے ساختہ زبان پر جاری رہا کہ اے بار الہا کسی یافت کے لائق تو یہ سراپا نالائق کیا ہوگا، نایافت کے درد وغم ہی کے ایک ذرہ سے مرتے دم تک نواز دیتے ؎

ذرۂ دردے دل عطار را

خیر یہ تو اہل طلب کی مطلب کی ایک بڑی قیمتی بات اور قابل قدر نعمت یاد آ گئی ورنہ حضرت فتح پوری کی ذات بابرکات میں بعض باتیں تو ایسی جمع پائیں جو اپنے مرشد اعلیٰ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے نادر الوجود کمالات کا ہو بہو نقشہ آنکھوں کے سامنے کر دیتی ہیں۔

۱- سب سے بڑھ کر تو "لَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ" کا انبیائی ورثہ ہے، یعنی خدمت دین وخلق کے سلسلہ میں تعلق حق پر مبنی ایسا قلبی توکل وغنائے تام کہ مخلوق کے کسی جاہی ومالی دباؤ کا قلب پر اثر کیا شائبہ اثر بھی پورے ایک مہینہ کی خلوت وجلوت کی حاضریوں میں یہ چشم بد بیں ڈھونڈ کر بھی نہ پا سکی۔

۲- اسی کا دوسرا لازم احکام دین کی تعلیم وتبلیغ میں "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" (اے محمد! جو کچھ تم کو حکم دیا گیا ہے بے لاگ لپٹ کھل کر کہہ دو) کے وہ مظاہر وآثار تھے جن سے مشکل ہی سے کوئی مجلس خالی جاتی ہوگی، کسی طرح کی لاگ لپٹ یا مداہنت کیا معنی، معلوم ہی نہیں ہوتا کہ بڑوں چھوٹوں، علماء امراء خواص وعوام سیکڑوں آنے جانے والوں میں کسی کا قلب پر کوئی ہلکا سے ہلکا وزن بھی پڑتا ہے۔

۳- تیسری خصوصیت تعلیم وتربیت میں علم سے زیادہ عمل اور عمل میں بھی بہت زیادہ اعمال قلب پر زور ہے، قلبی اعمال کا بھی جوہری ست اخلاص نکال رکھا ہے، ظاہر ہے کہ دوسرے تمام قلبی وقالبی اعمال کی صحت وسلامتی کی ضمانت یہی جوہر ہے جس کی حقیقت ہر عمل وحرکت میں صرف خدا کی رضا وناراضی یا آخرت کی جزا اور

سزا پر نظر ہے، سچ پوچھئے تو اسی نظر کے فقدان یا کمی وخامی کی وجہ سے ریاونفاق وکبر وجاہ حرص وہوس دنیا پرستی وخودغرضی وغیرہ کے سارے اخلاقی وباطنی رذائل وامراض پیدا ہوتے اور پرورش پاتے ہیں، حضرت ممدوح کی تعلیم وتربیت میں سب سے زیادہ زور واصرار ان ہی رذائل خصوصاً ریاونفاق کے مرض ومعالجہ پر رہتا ہے۔

اخلاص کے بڑے جانی دشمن یہی دو ہیں جن سے نہ صرف نماز وروزہ حج و زکوٰۃ سے خالص دینی اعمال بے جان وبرباد ہوجاتے ہیں، بلکہ دیکھا جائے تو دنیا کے بھی اکثر انفرادی واجتماعی سیاسی وسماجی فتنوں فسادوں کی جڑ یہی ہیں، خاص کر آج کل کی سیاست وحکومت کا تو کہنا چاہئے کہ سارا تار وپود ہی ریاونفاق یا مکروفریب ہی سے تیار ہوتا ہے، پھر کیا تھا "کریلا نیم چڑھا" "الناس علی دین ملوکھم" حکومت کی یہ برکات رعایا اور شہریوں کے ہر ہر طبقہ اور ہر ہر گھر میں اس طرح گھر کر گئی ہیں کہ معاشرہ (سوسائٹی) میں ان کو اب کوئی عیب مشکل سے شمار کیا جاتا ہے، مزید برآں ریا ونفاق کے مناشی یہ جراثیم اکثر ہوتے ہیں ایسے دقیق وخفی اس طرح دبے پاؤں داخل ہوجاتے ہیں کہ بہتیرے صحابہؓ فاروق اعظمؓ سے اکابر صحابہؓ تک اپنے اندر اس کے اندیشہ سے ترساں ولرزاں رہتے تھے، حاذق سے حاذق روحانی اطباء وشیوخ اور ان کے تربیت یافتہ تک دھوکہ کھا جاتے ہیں، حکیم الامت سے بڑھ کر کون حاذق وقت معالج ومربی ہوگا، حضرت ہی کے ایک پانی پتی مرید کا واقعہ یاد آیا، خانقاہ اشرفیہ کے مدرسہ کے لیے انھوں نے کچھ رقم پیش کی، اچھے پرانے تربیت یافتہ مرید تھے، حضرت نے بے تکلف قبول فرمالی، بعد کو خیال آیا کہ ایسا ہی مدرسہ تو خود پانی پت میں موجود ہے جس کا حق زیادہ تھا، وہاں چھوڑ کر تھانہ بھون کے مدرسہ کے لیے کیوں لائے، کہیں خدا کے ساتھ پیر کی رضا جوئی تو مطلوب نہیں کہ یہاں دینے سے ثواب بھی ہوگا اور پیر بھی خوش ہوں گے، بلا کر پوچھا اور جرح فرمائی، حضرت کے جرح میں کون ٹھہر سکتا تھا،

دل کا چور پکڑا گیا، اور عطائے شما بہ لقائے شما کا معاملہ فرمادیا، غریب مرید تو مرید ہی ہے پیر بھی کتنے ایسے نکلیں گے جو مریدوں سے خود اپنی رضا و خوشامد کے طلبگار نہ رہتے ہوں، مریدوں کے بنانے کے لیے زیادہ تر بگاڑنے والے تو نام نہاد پیر ہی ہوتے ہیں، یہ تو تھانہ بھون کے بنائے ہوئے پیر فتح پور کے ہاں دیکھا کہ کسی معاملہ میں اس قسم کا شبہ ہوتے ہی لتاڑ پڑنے لگتی ہے کہ تم لوگ خدا سے زیادہ مجھ کو راضی کرنے کی فکر میں رہتے ہو، کھانے پینے تک کے کسی ہدیہ میں شبہ پیدا ہو جاتا ہے تو رد فرماتے ہیں۔

اس تھانوی مذاق و مسلک والے کے متعلق حکیم الامت کے مصنف (۱) سے بڑھ کر کون اندازہ کرسکتا ہے کہ فتح پوری خانقاہ مدرسہ وغیرہ کے مصارف کے لیے رائج الوقت قسم کے چندہ کا دور دور بھی کوئی پتہ نہ ہوگا، اس پر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں کہ ۲۶-۲۷ حجروں کمروں کی سلیپ و سیمنٹ کی دو منزلہ عمارت معلوم ہوا کہ صرف ۲۸ دن میں کھڑی ہوگئی، اور اب سنا کہ مدرسہ کی مستقل عمارت بھی اسی طرح جلد ہی کھڑی نظر آنے والی ہے، یا اس کے بالکل برعکس چھوٹے بڑے عام دینی مدرسوں اداروں کے اس حال سے کون واقف نہیں کہ دو چار کمروں یا دو چار ہزار کے کسی صرف کے اعلان و اشتہار دوا دوش میں کوئی کسر اٹھی نہیں رہتی، بمبئی اور کلکتہ تک دوڑ مچ جاتی ہے، خود مدرسہ کے مہتمم اور اساتذہ تک کاسۂ گدائی سنبھال کر نکل پڑتے ہیں۔

بات میں بات نکل آئی، عرض یہ کر رہا تھا کہ فتح پور کے مطب میں امراض قلب میں خصوصی توجہ ریا و نفاق کے مرض پر دیکھی، دوسروں کا حال کیا جانوں لیکن خود اپنے اعمال و افعال کو اس عینک سے دیکھا تو کیا کہوں کہ کیسی بھیانک شکل نظر آئی، مسلمانوں کی شان تو یہ ہے کہ دنیا کے دھندے بھی دین ہی کی کھیتی ہوں لیکن اپنا حال بد تو اس عینک نے یہ دکھایا کہ جو کام بظاہر خالص دین کے ہیں ان کے خلوص کی راہ میں بھی نفس شیطان کس

---

(۱) مکتوب الیہ حضرت دریابادی ہی ''حکیم الامت'' کے مصنف ہیں، کتاب کا پورا نام ''حکیم الامت نقوش تاثرات'' ہے، مکتوب نگار یعنی مضمون نگار کا ان ہی کی طرف اشارہ ہے۔ (م)

کس طرح چھپ چھپ کر مارتے رہتے ہیں، بس اللہ ہی ستار وغفار ہے۔

بہ زمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد
کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی

زندگی میں نفاق وریا کی ایمانی وعملی مہلک بیماری پر اتنا تنبہ کبھی نہیں ہوا تھا، جتنا مولانا فتح پوری (جزاہ اللہ) کی تنبیہات سے ہوا، آخر کوئی تو بات ہے جو بڑے سے بڑے صحابہ تک اپنے اوپر نفاق سے خائف تھے، ''بہ دیگراں چہ رسد'' وہ بھی ارذل الخلائق۔

۴- ایک بظاہر اَنمل لیکن بہت کچھ تھانوی رنگ ہی سے ملتی جلتی بات یعنی ایک طرف اخلاق واعمال کی خامیوں کوتاہیوں پر معمولی وسرسری روک ٹوک ہی نہیں خاصی لے دے ناراضی وناگواری بلکہ لہجہ کی حد تک درشتی وسختی لیکن دوسری طرف ''بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ'' والی شان رافت ومرحمت اور شفقت کا یہ عالم کہ بعض وقت بیقرار ہوجاتے دیکھا، نجی نجی پریشانیوں بیماریوں میں دعاو دوا دونوں کی فکر و تدبیر سے ایسی دستگیری کہ قریب سے قریب عزیز اور ہمدرد سے ہمدرد دوست ہی سے امید ہوسکتی ہے، خود اپنی معمولی نزلہ زکام کی بیماریوں سے لے کر بعض سخت پریشانیوں تک میں تو اس کا تجربہ ہوا ہی، ایک اچھے رئیس زادے وعالم دین اپنے پورے گھر بیوی بچوں والدہ بھائی سب کے ساتھ اصلاحی تعلق سے مقیم تھے، ماشاءاللہ بڑے سعید وصالح جوان کسی کسی وقت میرے پاس بھی خصوصیت سے آبیٹھتے، بیچارے کچھ دماغی خلل کے مریض ہیں، کبھی کبھی دورہ سخت پڑتا ہے، وطن پانچ چھ میل قریب ہی ایک قصبہ ہے، ایک دن دورہ جو پڑا تو روزہ رکھے لو دھوپ میں پیدل ہی سب گھر والوں کو چھوڑ چھاڑ بے تحاشہ گھر سے بھاگ نکلے، ماں بھائی بیوی کی پریشانی تو ظاہر ہی ہے، خود حضرت کو اتنا فکرمند اور متاثر دیکھا کہ جب تک ایک صاحب کو سائیکل پر بھیج کر ان

کو واپس بلا نہیں لیا یکسو نہیں ہوئے، اور پھر روزہ رکھنے سے حکماً روک دیا، دوا علاج کی فکر و تاکید فرمائی، دعا کا خاص اہتمام تو جہاں تک اندازہ ہوا، خاص معمولات میں داخل ہے، بعض علماء صلحاء نے خود احقر کو دوران قیام خط میں دعاء کی درخواست کے لیے تحریر فرمایا تو درخواست کا جواب ایسے الفاظ اور انداز میں ملا کہ جس سے معلوم ہوا کہ خاص وقت ہی میں نہیں، ''خاص اوقات'' میں اور بار بار ہوگی، اپنے پرائے دیکھے سنے متعدد تجربات سے شہادت ملی کہ ماشاء اللہ مستجاب الدعوات بھی بڑے ہیں، بعض واقعات تو نہایت حیرت ناک اور بالکل ہی کرامت کے، مگر کیا کیا عرض کیا جائے، صدق کی محدود گنجائش سے بات یونہی بہت بڑھ گئی، اصل ذکر تھانوی رنگ سے ملتی جلتی چوتھی بات کا تھا کہ وہاں بھی ایک طرف اخلاقی و عملی بلکہ بعض بظاہر چھوٹی بڑی معاشرتی کوتاہیوں پر بھی جیسا مواخذاہ اور ڈانٹ ڈپٹ ہو جاتی تھی اس سے میں آپ کیا دو ایک مجلسوں کی حاضری کی سعادت رکھنے والا بھی کون واقف نہ ہوگا، دوسری طرف آپ بیتی میں ایک مثال لیجئے، یادش بخیر ایک دماغ ہی کے مریض پرانے محترم دوست اور نئے عزیز کے سلسلہ میں اس نالائق کو کوئی مستقل نہیں محض عارضی و وقتی پریشانی کا سامنا ہو گیا تھا، دیکھئے کہ اس کے دور کرنے میں بھی حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کی رافت و شفقت کتنی دور تک گئی۔

یہ محترم دوست و عزیز خود حضرت اقدس علیہ الرحمہ کے مرید ہی نہیں مجاز ہیں، جب حضرت اپنے علاج کے لیے پہلی بار لکھنؤ تشریف لائے تو یہ اسی تعلق و سلسلہ سے غریب خانہ ہی کے ایک بغلی مکان میں مقیم تھے، یوں تو حضرت والا بلا کسی درخواست کے نہایت کرم و شفقت کی راہ سے غریب خانہ کو دن میں کئی بار خود ہی مشرف فرما چکے تھے، لیکن واپسی کے قریب خاکسار نے درخواست کی کہ ایک رات کے قیام کی سعادت بھی عطا ہو جائے، سوء اتفاق کہ جس دن اس درخواست کی پذیرائی

میں عصر کے وقت حضرت اپنے پورے اہل بیت کے ساتھ تشریف لائے اسی دن کچھ پہلے ہی ہمارے دوست کا دماغی دورہ شروع ہو چکا تھا، جس نے بڑھتے بڑھتے رات تک اتنی شدت اختیار کر لی کہ سارا گھر سر پر اٹھالیا، اندر سے باہر تک دوسروں پر تو جو کچھ گذری گذری، یہ نابکار حضرت کے سامنے شرم وندامت سے سر اٹھانے کے قابل اپنے کو نہیں پا رہا تھا، کہ بیماری سے اٹھتے ہی ایسی مہمانی ملی کہ رات بھر پلک نہ جھپکا سکے، ہائے اس لطف ولطافت کی یاد سے کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ صبح اول تو اس سراپا غرق انفعال کے احساس شرم وانفعال کو بلا خطاب خاص کیسے کیسے لطیف اور پر حکمت عنوانات سے زائل کرنے کی فکر فرمائی، ساتھ ہی محسوس فرما کر کہ سخت دماغی دورہ ہے خدا جانے کتنا طول کھینچے اور اس سے گھر بھر کو کیا کیا پریشانیاں پیش آجائیں، غضب یہ فرمایا کہ ان کو فوراً ہی چلے جانے کا حکم دیا، اس سے بڑھ کر یہ کہ خود ان کے دروازہ پر جا بیٹھے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جب اپنی سواری کی موٹر آئی تو پہلے اس پر ان کو جہاں وہ جانا چاہتے تھے روانہ فرمالیا پھر خود تشریف لے گئے، دیکھنے والے اس کو بڑی سخت گیری جان رہے تھے، میں بھی دم بخود تھا، مگر حضرت نے موٹر پر تشریف رکھتے رکھتے بس اتنا چپکے سے فرمایا کہ یہ گھر بھر کو بہت پریشان کرتے اور کسی کے ہٹائے ہٹتے بھی نہ، اب آپ سب بڑی پریشانیوں سے بچ گئے اور اس سے انشاء اللہ خود ان کو بھی سکون ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کیا اور دیکھا کہ حضرت کو اسٹیشن پر رخصت کرنے کے لیے اچھے خاصے حاضر ہیں، تب سمجھ میں آیا کہ یہ سختی ہی میں نرمی تھی۔ ع

صد درستی در شکست خضر بود

اور بھی حضرت علیہ الرحمہ کی ایسی ہی دستگیریوں کے کئی تجربات خود اپنی خانگی ودنیوی زندگی کے الجھاؤں اور دشواریوں میں ہوئے، اللہ تعالیٰ نے سبھی کو سلجھایا اور دور فرمایا، اس دنیادار کو نہ جانے کتنے مواقع پر اپنے دنیوی معاملات ہی میں تھانہ بھون

کی یاد رلا دیتی ہے، اب دس بارہ برس بعد جا کر فتح پور میں ان آنسوؤں کو پونچھنے والا بھی ایک ملا، ذہن یہاں عجیب تضاد و تقابل سے دوچار ہو جاتا ہے، بعضے اکابر شیوخ اور اچھے علماء صلحاء کو دیکھا جنھوں نے کہنا چاہئے پوری پوری زندگیاں اسلام اور مسلمانوں میں اجتماعی اور ملی خدمات کے لیے وقف کر فرما رکھی ہیں، انفرادی معاملات میں ان کا طرز عمل کچھ ایسا ہوتا ہے کہ گویا افراد اس امت وملت کے افراد ہی نہیں جس کی جماعتی اصلاح وفلاح کے لیے تن من دھن سب تج رکھا ہے، نہ ان کے حق میں معروف ومنکر کے امر ونہی کا خصوصی اہتمام نہ دینی واخلاقی نگرانی کا نہ ان میں اصلاح ذات البین کا نہ ان کے نجی و دنیوی معاملات ومشکلات میں دستگیری کا بلکہ بعضے تو اجتماعی مشاغل کے فرض کفایہ یا مستحبات کے انہماک میں اہل وعیال تک کے واجبات کو نظر انداز کر دیتے ہیں، غضب پر غضب یہ ہے کہ اصلاحی خدمات کے مخلص ترین اور اہل علم فاضلوں کے قلم سے یہاں تک غایت تحسین وآفریں کے جوش میں نکل جاتے دیکھا کہ فلاں شخص یا مجمع کو دین وملت کی خدمت میں گھر بار بال بچوں کا بھی ہوش نہیں، مجھ کو تو نام نہاد اجتماعی خدمات کا یہ افراد کش غلو بہت کچھ فرنگی یا مغربی غالبانہ اجتماعیت کا لایا ہوا ہیضہ معلوم ہوتا ہے، باقی افرادی یا انفرادی رذائل اخلاق اور قلبی و باطنی امراض کی اصلاح وازالہ پر جیسی توجہ وتاکید تھانوی اور اس کے بعد فتح پوری مطب میں دیکھی آج کل کی خالص دینی واصلاحی جماعتوں میں اور تحریکوں میں اس کا عشر عشیر بھی نظر نہ آئی بلکہ کبھی کبھی الٹے اس سے انتہائی غفلت کے تجربات بڑی بڑی اصلاح درسگاہوں اور مرکزوں کے افراد وابستگان میں ایسے ہوتے ہیں کہ فرنگی رنگ کی اجتماعی واصلاحی خدمات کا دین کے حق میں یہ راستہ ہی الٹا معلوم ہوتا ہے، دینی و عربی تعلیم کے کچھ طلبہ درس قرآن کا نام لگا کر اس کس مپرس کے پاس آجاتے ہیں، یہ نالائق وناکارہ اس بہانہ سے ان کو خود اپنے انفرادی ایمان وعمل ظاہر وباطن معاملات و

اخلاق کی اصلاح و درستی کی طرف بخطاب عام دوران درس میں اور بخطاب خاص نجی صحبت وخلوت میں متوجہ کرتا رہتا ہے، اس کے اثر سے بعضوں میں کچھ نہ کچھ چونک پیدا ہو جاتی ہے اور اپنے اخلاقی و باطنی امراض خلوت یا نجی تحریر میں پوست کندہ ظاہر کر دیتے ہیں، ان دن رات قرآن و حدیث پڑھنے والوں اور اصلاحی تحریکوں تقریروں میں شریک ہونے والوں میں کبر وحسد یا نفاق کی سی مہلک بیماریوں میں مبتلاء ایسے شدید و آخری درجات تک کے مریض ملتے ہیں کہ جہلاء وعوام میں بھی کم ہی ملیں گے، بڑی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ان دینی مدرسوں اور اصلاحی اداروں میں بھی اب روز بروز انفرادی و عملی سے زیادہ اجتماعی ونظری پہلوؤں پر زور رہتا ہے کہ لوگوں کا خود اپنی ظاہری و باطنی اصلاح کی طرف ذہن کما حقہ نہیں جاتا، قرآن کی تعلیم وتدریس میں بھی اگر تمام تر نہیں تو بہت زیادہ ایسی ہی باتوں پر توجہ دلائی جاتی ہے جن کو قرآنی معارف وحقائق یا فلسفہ قرآنی کہا جاتا ہے، وہی جس کی بڑی ہی پر معنی تعبیر عارف اللہ آبادی نے داد قرآن سے کی ہے، دور حاضر کا کیا چور پکڑا ہے کہ ؎

داد قرآن کی نہ دو بھائی عمل اس پہ کرو
پیش درگاہ خدا واہ کی حاجت کیا ہے

داد قرآن کی اس بے اعتدالی کا اثر یہ پڑتا ہے کہ جب تک یہ داد دیتا رہتا ہوں طالب علموں میں زیادہ انبساط پاتا ہوں اور جہاں عمل اس پر کرو، کی توجہ دلانا چاہتا ہوں چہرے مرجھانے لگتے ہیں، حالانکہ داد قرآن کی شکر کچھ نہ کچھ لپیٹتا ہی جاتا ہوں، تاہم بحمد اللہ ظاہر و باطن کی عملی اصلاح کی طرف دونوں کے اس سراپا تباہ کار کے توجہ دلانے سے بھی کچھ نہ کچھ توجہ ہو ہی جاتی ہے۔

عرض یہ کرنا ہے کہ دینی تعلیم واصلاح کا اصل مقصد اگر افراد امت دونوں میں دینی زندگی پیدا کرنا ہے تو اس کی راہ فقط ایک ہی ہے کہ دینی واسلامی تعلیمات کی

نظر میں فلسفیانہ یا انشائی وخطابتی ''داد'' سے زیادہ اور بہت زیادہ زور وتوجہ عملی اصلاح و انقلاب پر ہونا ضروری ہے، بالفاظ دیگر مدرسوں اور خانقاہوں کی تفریق مٹانا اور دونوں کے رنگ کو ملانا ناگزیر ہے، اگر ہر دینی مدرسہ وادارہ ساتھ ساتھ خانقاہ اور وہاں کا ہر بڑا کارپرداز اگر ساتھ ساتھ شیخ وسالک نہ ہو تو کم از کم ہر مدرسہ وادارہ میں ایک شیخ ومربی یا دین کے ظاہری وباطنی امراض کا نگراں ومعالج کا ہونا لابد ہے، اور اس کی مجالست وصحبت کا لزوم کتابی اسباق اور تقریری مجالس سے کم نہیں زیادہ ہو اور خاص کر بڑی دینی درسگاہوں کی طرف سے تکمیل وفراغت کی سند ہرگز نہ دیجائے جب تک علم کے ''قال'' کے ساتھ معتد بہ درجہ تک عمل کے ''حال'' کا اطمینان نہ ہو، امت کے حکیم و مجدد وقت کے نزدیک تو مولوی نام ہی عالم باعمل کا ہے، اس کے اطمینان کے بغیر کسی کو مولویت کی سند تھما دینا دراصل امت کے حق میں خیانت اور دھوکہ دینا ہے، ضرورت دراصل اس عالم باعمل بنانے والے جامع تعلیمی مدارس وادارات کی ہے، فتح پور کا مدرسہ وخانقاہ اس جامعیت اور سنگم کا ایک غیر اشتہاری چھوٹا سا نمونہ ہے، قرآن و حدیث کا جو سب سے بڑا معلم ومدرس ہے، وہی ایک بہت بڑا شیخ ومربی یا مزکی ہے، دوسرے اساتذہ وغیرہ بھی سب کے سب ماشاء اللہ سالک وطالب ہی ہیں، ایسی فضا میں ظاہری علوم دین بلکہ خالی علوم دنیا کے طلبہ کو بھی رکھدیا جائے تو وہ بھی کہاں تک غیر متاثر یا مسلمان ہو کر اپنے ظاہر وباطن ایمان وعمل سے بالکل غافل رہ سکتے ہیں، سب سے بڑے معلم کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سب سے بڑا وصف تعلیم کتاب و حکمت کے ساتھ ساتھ ہی بلکہ اس پر مقدم مزکی ہونا یا ایمانی وعملی قلبی قالبی تزکیہ فرمانا تھا۔ يُزَكِّيهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ.

ربنا اهدنا الصراط المستقيم، صراط الذين أنعمت عليهم
غير المغضوب عليهم ولا الضالين. آمين.

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے استفادہ ومراسلت

نومبر ۱۹۶۷ء کو مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب الٰہ آبادی نے رحلت فرمائی، مولانا عبدالباری ندوی جنھوں نے قائم مقام شیخ کی حیثیت سے ان کے ساتھ نیازمندانہ وخادمانہ معاملہ رکھا، اور اپنے ذاتی گھریلو اور دیگر معاملات میں ان سے مشوروں اور رہنمائی سے اپنے کاموں کو انجام دیتے رہے، وقتاً فوقتاً حاضری دے کر اور خط وکتابت کے ذریعہ تعلق کو کمزور نہیں ہونے دیا، اچانک اس عظیم سانحہ نے ان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اب انھیں پھر تلاش مرشد ہوئی، ہر طرف نظر دوڑائی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی ہستی میں انھوں نے حضرت تھانوی کو پایا، باوجود عمر میں زیادہ ہونے اور علم وفضل میں ان سے کہیں پہلے شہرت وعروج حاصل کر لینے کے، خورد بننا انھیں ذرا مشکل نہ لگا، اور کیوں کر لگتا کہ انھوں نے جس اخلاص اور طلب صادق اور نیازمندی سے اس راہ میں قدم رکھا تھا وہ چھوٹا بننا ہی سکھاتی ہے، اور جو اپنی نگاہوں میں چھوٹا ہو جاتا ہے وہ واقعی طور پر دوسروں کی نگاہوں میں بڑا بن کر رہتا ہے، اور یہ کیسے نہ ہو جبکہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا بھی مانگی تھی "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیراً وَ فِیْ أَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْراً." (اے اللہ مجھے اپنی نظر میں چھوٹا اور لوگوں کی نظر میں بڑا بنا دے)۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اپنے عہد کے مشاہیر وکبار مشائخ میں عمر کے اعتبار سے سب سے چھوٹے تھے، مگر بہت سی خصوصیات وامتیازات میں وہ ممتاز نظر آرہے تھے، حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی ایک مجلس کا حال اپنے تعلق سے یہ لکھتے ہیں کہ:

"ایک خاص بات اب کی یہ رہی کہ ایک مجلس میں مشائخ قابل
بیعت کا ذکر آ گیا، میں نے عرض کیا کہ حضرت کے خیال میں

اس وقت کون کون صاحب اس کے اہل ہیں، فرمایا کہ کسی وقت پرچہ پر لکھ کر دے دوں گا، چنانچہ اسی دن ایک چھوٹے پرزہ پر یہ نو نام اسی ترتیب سے لکھے ہوئے مرحمت ہوئے:

مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری، مولانا اللہ بخش صاحب بھاول نگر ریاست بھاول پور، مولانا محمد الیاس صاحب نظام الدین دہلی، مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث سہارنپور، حافظ فخر الدین اسٹیشن ماسٹر، مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھ کمبوہ دروازہ، مولانا انور شاہ صاحب ڈابھیل سورت، مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دیوبند، مولانا اصغر حسین صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند۔"(۱)

حضرت تھانوی نے جب معتمد مشائخ وقت کی یہ مختصر فہرست مولانا دریابادی کو دی تو یہ نومبر ۱۹۳۲ء تھا، اس وقت جبکہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی عمر ۳۵-۳۶ سال سے زیادہ نہ تھی، مگر مقام یہ پیدا کرلیا تھا کہ اس مختصر فہرست میں شمولیت اور وہ بھی اولین چار میں سے ایک، زہے نصیب! چنانچہ جیسے جیسے مشائخ اٹھتے گئے ان کی مرجعیت بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ۱۹۶۲ء میں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے بعد شیخ المشائخ کی حیثیت ان ہی کو حاصل ہوئی، انہیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے جو تعلق محبت عقیدت تھی اور ان کی صحبت نشینی کی تاثیر اور مجلس کی برکات کا جو علم تھا اس کا اس خط سے اندازہ لگانا آسان ہوگا جو انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو اس وقت لکھا ہے جب حضرت حکیم الامت تھانوی ۱۹۴۱ء میں بغرض علاج دوبارہ لکھنؤ تشریف لائے تھے، اور یہی وہ زمانہ ہے

---

(۱) حکیم الامتؒ نقوش وتاثرات ص/۲۵۰۔

جب حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے باضابطہ بیعت کا تعلق اس موقع پر قائم کیا تھا، مولانا عبدالماجد دریابادی نے صحبت شیخ کے عنوان سے ''صدق'' میں اپنی تعلیق کے ساتھ شائع کیا تھا، ان کی کتاب ''حکیم الامت نقوش وتاثرات'' سے نقل کیا جاتا ہے:

''حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ کا قیام پچھلے ستمبر اکتوبر میں بہ سلسلہ علالت لکھنؤ میں عرصہ تک رہا، کبھی کبھی اس نامہ سیاہ کو بھی توفیق دریاباد سے لکھنؤ کا سفر کر کے حاضری کی ملتی رہی، باہر کے ایک بزرگ نے کہ وہ اہل دل بھی ہیں اور صاحب علم وصاحب تصانیف بھی اور باوجود اس کے بھی کہنا چاہئے کہ گمنام ہی ہیں، مراد مولانا الحاج محمد زکریا صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے تھی، فرط شفقت سے اسے توجہ دلائی کہ حاضری کا اہتمام زیادہ رکھنا چاہئے جواب میں کچھ معذوریاں اور طویل قیام لکھنؤ کی خرابیاں عرض کی گئیں، اس جواب کے جواب میں ادھر سے جو کچھ ارشاد ہوا وہ اس قابل ہے کہ اس میں ناظرین ''صدق'' کو بھی شریک کرلیا جائے۔

''میرا مقصد یہ نہ تھا کہ آپ کے یہ مبارک اوقات بہترین مشغلہ میں نہ گذرتے ہوں گے، اس کا تو مجھے خود ہی خیال تھا، میرا مقصد یہ تھا کہ حضرت کے اس قرب سے انتفاع کی طرف آپ کی توجہ خاص طور پر مبذول کراؤں، اپنے خیال ناقص میں حضرت کا یہ سفر درحقیقت کسی اہم تربیت ہی کے لیے ہے، اس لیے بہ مقتضائے الطاف دل چاہا کہ جناب کی خدمت میں لکھنے کی جرأت کروں، اور ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا کہ لکھنؤ دریاباد سے

قریب ہونے کے باعث کسی خاص حرج یا دقت کا موجب نہ ہوگا، لیکن جناب نے جو وہاں کے قیام کے خصوصی موانع اور کثرت احباب واعزہ کی بناء حرج کا رتحریر فرمایا ہے تو یقیناً حرج کا رمقصود نہیں ہوسکتا، البتہ جناب کا یہ ارشاد کہ طویل ملفوظات جو چھپے ہوئے بھی دیکھے جاسکتے ہیں ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا، میرے نقطہ خیال سے مقصود تو زیارت اور ملفوظات دونوں نہیں بلکہ اصل مقصود صحبت ہے، اہل اللہ کی صحبت، اعمال کی پختگی، دین کی صلابت، ایمان کی حرارت وغیرہ میں ایک مستقل حیثیت اور اہمیت رکھتی ہے، جس کی نظیر صحابہ کرام کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہنا ہے مشبہ اور شبہ میں گو فرق زمین و آسمان سے بھی زائد کا ہو، لیکن نوع بہر حال ایک ہے، اس کے لیے اہمیت نہ ملفوظات کی ہے نہ خلوت کی، میں اصرار نہیں کرتا آپ خود ہی اپنے قلب سے استفتاء کرلیں "اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَلَوْ أَفْتَاكَ الْمُفْتُوْنَ" تفسیر بیان القرآن کے اوصاف جو آپ نے بیان فرمائے بالکل صحیح ہیں، مجھے بھی بسا اوقات اس کی زیارت کی نوبت آتی رہتی ہے، لیکن اس میں مشغول رہنا تو انتفاع مولانا کے علوم سے ہوا، مولانا کی ذات یا قرب سے نہ ہوا، قرب مجلسی میں آخر کوئی چیز تو ہے جس کی طرف "وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ" الخ. میں اشارہ ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اس آیت پر یہ ارشاد کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْ أُمَّتِیْ مَنْ أُمِرْتُ أَنْ أَصْبِرَ مَعَهُمْ" اور جب حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کا یہ عمل چھوٹوں اور امتیوں کے ساتھ ہو تو اس کے عکس کو خیال فرمالیں۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی اس پر نوٹ چڑھاتے ہیں:

"زمانہ کے شدید فتنوں میں سے ایک فتنہ صحبت صالحین سے بے نیازی کا ہے، کتابوں سے اس میں شبہ نہیں کہ معلومات بہت سے حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن زندہ شخصیت کی تاثیر ہی کچھ اور ہے، پیر پرستی کی منزل سے یقیناً بچنا چاہئے لیکن بزرگوں کی صحبت سے بے نیازی بھی کچھ کم مہلک نہیں، اور عجب ونخوت، خودرائی وخود پسندی کا بت تو بغیر اس کے ٹوٹتا ہی نہیں۔" (۱)

شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے جس بات کی طرف توجہ دلائی ہے اور مولانا دریابادی نے اس کی اہمیت کو اور بھی قوت کے ساتھ باور کرایا ہے، مولانا عبدالباری ندوی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے، چنانچہ انھوں نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی لکھنؤ کی مجالس میں نہ صرف اہتمام سے شرکت کی بلکہ اس سفر سے پیوستہ سفر میں حضرت تھانوی کی ان کے گھر تشریف آوری کی روداد جناب وصل بلگرامی اپنی کتاب میں تفصیل سے دے چکے ہیں، اور مولانا عبدالباری ندوی کے سفر و حضر میں ساتھ رہ کر استفادہ اور پوری قدردانی کا حال بیان کر چکے ہیں، اس سب کے باوجود انھوں نے اپنی عمر کے کسی مرحلہ میں بھی اپنے کو تنہا نہیں رکھا، اور کسی رہبر کے ساتھ ہی سفر جاری رکھا، بطور آخری رہبر کے یہی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم مہاجر مدنی ہوئے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی شخصیت میں مولانا عبدالباری

---

(۱) حکیم الامت نقوش وتاثرات، ص/۵۸۱-۵۸۲ منقول از صدق ۲۶/جنوری ۱۹۴۲ء

ندوی کو ایک طرف ان کے شیخ و مربی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی شخصیت اور دوسری طرف شیخ بیعت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی شخصیت چھپی نظر آئی، یہ بات راقم یوں ہی نہیں کہہ رہا ہے اس کے لیے خود مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے مجلسی تاثرات اور مکتوبات شاہد ہیں، یہی وجہ تھی کہ انھیں ان دونوں کی وفات کے بعد شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی شخصیت ایسی نظر آئی جو علم وفکر اور عشق ومحبت کی جامعیت لیے ہوئے تھی، اور وہ سوز وگداز رکھتی تھی، جس کی ان کو تلاش تھی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے نام ان کے مکتوبات میں سے نمونہ کے طور پر دو مکتوبات نقل کیے جاتے ہیں:

مکتوب نمبر (۱)

''سراپا شفقت حضرت مخدوم ومحترم بارک فی برکاتہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

احقر کے عریضہ کے جواب میں شفقت نامہ نے رات مشرف فرمایا، اب جو ذرا طویل نیم حاضری کی نیت تھی آج اس کی ابتداء کراتا ہوں، میرے والد علیہ الرحمہ حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کے مرید ومجاز تھے، پھر اپنے مرشد کے وصال کے بعد حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے مکاتبت کے ذریعہ تعلق فرمارکھا تھا، جو آخر عمر تک جاری رہا، اور احقر کا خیال ہے کہ انھیں کی خواہش اور دعاء نے اس کو تھانوی قدموں تک پہنچایا اور وہاں پہنچ کر وہ کچھ دیکھا اور پایا کہ یہ یقین رہا کہ اس ذات گرامی کا ثانی غالباً ساری دنیا میں نہ ہوگا، پھر اس خیال کی تصحیح ''خوان

خلیل'' نے فرمائی کہ ساری دنیا کا کیا ذکر ہے چند قدم ہی پر بالکل ثانی اثنین موجود ہے، بلکہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے مثنی ہیں، کیا عرض کروں حضرت مثنی کا لفظ بھی مجھے ذرا کم ہی معلوم ہوتا ہے ورنہ جس علوم معارف سے سالہا سال تھانہ بھون میں مانوس و فیضیاب رہا اس کم علم و کم نظر کو اس خوان خلیل میں بالکل ہو بہو وہی پایا، اور جب تک پڑھتا رہا یہی معلوم ہوتا رہا کہ تھانوی مجالس و ملفوظات ہی میں حاضر ہوں، اور پڑھ رہا ہوں، سچ یہ ہے کہ میرے لیے ان دونوں حضرات میں اب کوئی فرق و تمیز کرنا دشوار ہو گیا ہے، کاش خوان خلیل کے کچھ اور لقمے نصیب ہوتے رہتے تو مجالس و ملفوظات تھانوی سے محرومی کے احساس کی کچھ تلافی ہوتی رہتی، حضرت تھانوی کی مجالس و ملفوظات کے تو لوگوں نے ہزاروں صفحات جمع کر دیئے ہیں، کیا خوان خلیل کے لقموں کو بھی کہیں اور کسی نے جمع کر کے شائع فرمایا ہے کہ مزید استفادہ کے لیے ان کو حاصل کر لوں۔

الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ آج رات بڑے سکون و سبات کی نیند میسر ہوئی، اور فجر کی نماز بھی الحمد للہ اچھے وقت اور اطمینان کی نصیب ہوئی، آپ کی خادمہ احقر زادی نے والا نامہ میں سویا کا ذکر پڑھا تھا تو وہ بھی لا کر سرہانے رکھ دیا تھا، بہر حال ثم الحمد للہ کہ پوری رات بڑے سکون اور اطمینان سے سویا۔

حضرت کی شفقتوں کا کس منہ سے شکر ادا ہو، حق یہ ہے کہ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے بعد آں مخدوم کی شفقتوں نے اس تباہ کار

کے حق میں بڑے تریاق کا کام کیا ہے، أحسن الله جزاء کم وبارك الله فی برکاتکم. آں مخدوم کی دعاؤں اور توجہات کا بیش از بیش محتاج وملتجی تباہ کار۔"

احقر العباد

عبدالباری

آں مخدوم کی تفصیلی توجہات اور شفقتوں کے لیے لفافہ ملفوف ہے۔

مکتوب نمبر (۲)

"مولانا ومخدوم المکرّم حضرت شیخ مظاہر العلوم بارك الله فی برکاتکم.

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا افطاری تبرک پھر آں مخدوم کی طرف سے اور پھر حضرت مولانا نعمانی مدظلہم کے دست مبارک سے اس تباہ کار تک آتے آتے ماشاء اللہ اپنی برکاتی فضیلت میں سہ آتشہ ہوگیا اور سب سے بڑی دولت اس سلسلہ میں نامہ سیاہ کو حضرت والا کے قلب مبارک میں اتنی توجہ کی ملی جو انشاء اللہ سرمایہ آخرت ہوگی، أحسن اللّٰہ جزاء کم.

اس تبرک میں اپنی خودغرضی کا حصہ تو بے شک آدھو آدھ رہا ورنہ گھر بھر بلکہ دیوار بیچ تین گھروں کے پڑوسیوں نے بھی شرکت کی سعادت حاصل کی۔

اب مزید دعائی توجہ کی التجاء ہے، عشرہ مغفرت آج پورا ہو رہا ہے اور "عتق من النار" کا آخری عشرہ اپنی گوناگوں فضیلتوں کے ساتھ انشاء اللہ شروع ہو رہا ہے، سلامتی ایمان کے ساتھ مغفرت اور عتق

تام کی دعاء کا بہت زیادہ محتاج ہوں، کیونکہ "تحمل نار" برائے نام بقول حضرت اقدس حکیم الامت علیہ الرحمہ کے کہ بس جنتیوں کی جوتیوں میں جگہ عطا ہو جائے تو فرمایئے یہ نامہ سیاہ کیا سوچے؟

ایک خاص بات اور، جب سے یہ احقر مستقلاً لکھنؤ آ گیا، حضرت مولائی و مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے یہ مدنی افطاری ہر سال اور آخری شعبان میں اور پھر ماشاء اللہ اسم با مسمیٰ حضرت صاحبزادہ اسعد میاں (۱) کی طرف سے سعادت بخش ہوتی رہی۔ کوئی بیس سال میں اس مرتبہ پہلے سال غالباً کسی غیر معمولی سبب سے محرومی ہو رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے شکر خورے کی شکر کا انتظام آں مخدوم کی طرف سے فرما دیا، اس شکر کا شکر مکرر قبول ہو۔

والسلام مع الاکرام

مکرر دعاء جوو دعا گو۔

۲۴ر جنوری ۱۹۶۵ء

احقر العباد

عبدالباری غفرلہ

اب احقر خود خط لکھنے لکھانے سے دونوں سے قاصر ہو گیا ہے، اس لیے اس سعادت سے محروم رہا۔

شبستان قدم رسول

ہارڈنگ روڈ لکھنؤ

---

(۱) حضرت مولانا سید اسعد مدنی علیہ الرحمہ خلف اکبر شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب نور اللہ مرقدہ، افسوس کہ انھوں نے بھی ۷ر محرم الحرام ۱۴۲۶ھ کو نئی دہلی میں انتقال کیا، اور دیوبند میں قبرستان قاسمی میں اپنے والد حضرت مدنی علیہ الرحمہ کے پہلو میں مدفون ہوئے، مخدومی مولانا محمد طلحہ کاندھلوی صاحبزادہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

مسترشدین ومحبّین

حضرت مولانا عبدالباری صاحب کے مشائخ ومرشدین کے تذکرہ کے بعد ضروری ہے کہ ان کے ان مسترشدین اور ارادت مندوں کا بھی ذکر آجائے جنھوں نے ان سے کسب فیض کیا تھا، اور رابطہ واستفادہ کا وہ تعلق قائم کیا کہ اس کے بعد انھیں ان سے سند امتیاز واعتماد بھی ملی، ان میں ایک اہم نام مولانا ڈاکٹر غلام محمد حیدرآبادی (کراچی) کا ہے، جنھوں نے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ان سے تلمذ حاصل کیا، پھر حضرت مولانا سید سلیمان ندوی سے ارادت کا تعلق قائم کیا، اور ان کے مجاز وخلیفہ بھی ہوئے، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۵۳ء) کے بعد وہ اپنے استاد حضرت مولانا عبدالباری ندوی سے مستفید ہوتے رہے، اور ان کا ان سے یہ تعلق بڑا مضبوط اور گہرا قائم ہوگیا، اور ان کی جانب سے بھی اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے جس کا انھوں نے اپنے اس مضمون میں تذکرہ کیا ہے، جو ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ان کے فلسفیانہ اور صوفیانہ مقام وخدمات پر سپرد قلم کیا تھا، جو کہ ایک محققانہ ومبصرانہ مضمون ہے، جس کا اکثر حصہ اس کتاب میں ناظرین کی نظر سے گذرے گا۔

دوسرے کشمیر کے فاضلی صاحب (۱) ہیں، مولانا کے صاحبزادہ حافظ احمد الباری صاحب کا بیان ہے:

"راقم السطور کی نظر میں ایک صاحب ہیں کشمیر میں فاضلی صاحب

---

(۱) محترم افضل فاضلی صاحب (والد ماجد مولانا محمد معروف فاضلی ندوی مرحوم) مراد ہیں، جو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں زیر تعلیم اپنے بیٹے معروف فاضلی ندوی کی عیادت کے سلسلہ میں تشریف لائے، اور کچھ مدت قیام کیا، دوران قیام انھوں نے دو بڑے دینی فائدے اٹھائے، ایک یہ کہ حافظ حشمت اللہ صاحب مرحوم سے حرفاً حرفاً قرآن مجید کی تصحیح کی، دوسرے یہ کہ مولانا عبدالباری ندویؒ سے روحانی تعلق قائم کیا اور روحانی ترقی کی، اور اجازت وخلافت سے بھی سرفراز ہوئے، بڑے ہی خوش اوقات، ذاکر شاغل، وجیہہ وشکیل، نورانیت چہرے سے عیاں، مولانا جلال الدین رومی کی جو شبیہ پڑھی تھی اس سے بہت مشابہ، گامڑو ضلع بانڈی پورہ کشمیر کے رہنے والے ہیں، عمر سو سے متجاوز ہے، ان کو ایک بڑا صدمہ اپنے اکلوتے فرزند معروف فاضلی صاحب کی وفات کا اٹھانا پڑا، جنھوں نے لگ بھگ ۴۵ سال کی عمر میں داغ مفارقت دیا، معروف صاحب نے بھی اپنے والد صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مولانا عبدالباری ندوی سے استفادہ کا تعلق رکھا تھا، اور ان کی شفقتیں حاصل کی تھیں۔ (روایت مولانا سید غفران صاحب ندوی دام ظلہ)

جنھوں نے کسی بھی جگہ جانے سے انکار کیا اور مجبوراً ان کو بیعت کیا اور مجاز بھی فرمایا۔''

مولانا یوں تو لوگوں کو مستفید کرتے، اور طالبین وسالکین کی رہنمائی کرتے مگر باقاعدہ بیعت لینے اور سلسلہ میں داخل کرنے میں حد درجہ احتیاط کرتے تھے، کم ہی لوگ اس میں کامیاب ہوئے، حافظ احمد الباری صاحب لکھتے ہیں:

''اپنے آپ کو اس قدر کمتر خیال کرتے کہ باوجود مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کے اجل خلفاء میں ہونے کے کسی کو بیعت نہ فرماتے، پاکستان میں پاکستانیوں کو مولانا محمد حسن (امرتسری) لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف رجوع کرنے کا حکم فرماتے، اور ہندوستانیوں کو مولانا شاہ وصی اللہؒ جب تک حیات رہے ان کی طرف، اور شاہ صاحبؒ کے وصال کے بعد حضرت اقدس مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ابرار الحق حقی علیہ الرحمہ کی طرف رجوع کرنے کا حکم فرماتے۔''

ضابطہ سے بیعت واصلاح کا ربط رکھنے والے جو تھے وہ اپنی جگہ، ان کے علاوہ بھی پابندی سے خدمت میں حاضر ہونے والوں اور استفادہ، صحبت وخدمت کا ربط قائم رکھنے والوں میں حافظ محمد اقبال گونڈوی علیہ الرحمہ، استاذ گرامی مولانا برہان الدین سنبھلی واستاد گرامی مولانا مفتی محمد ظہور ندوی، مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم سابق ایڈیٹر ''تعمیر حیات''، لکھنؤ، مولانا محمد غزالی بھٹکلی ندوی (مرکز دعوت وتبلیغ نظام الدین نئی دہلی) اور مولانا محمد غفران ندوی (سابق انچارج مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ) کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

علمی کے ساتھ روحانی استفادہ کرنے والوں میں بھٹکل کے ڈاکٹر علی ملپا صاحب کا نام بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہے، جو انھیں کا اشارہ پاکر مولانا ابرار الحق

مولانا مبین ندوی بھی ان کے ان خواص مستفیدین میں ہیں جنھوں نے اپنے ندوہ کے زمانہ طالب علمی میں مولانا سے بھرپور استفادہ کیا، ان کے علاوہ اور بھی حضرات ہیں جنھوں نے ان کے بلند پایہ علمی ودینی مقام کی قدر کی اور کسب فیض کیا، ان میں ایک ممتاز نام مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (مکہ مکرمہ) سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء کا بھی ہے، ندوہ کی ایک دوسری علمی شخصیت مولانا اسحاق سندیلوی بھی وقتاً فوقتاً خدمت میں حاضر ہوتے، دعوت وتبلیغ کی مؤثر شخصیت مولانا عزیز عالم ندوی گورکھپوری (۱) اپنے ندوہ کے زمانہ طالب علمی میں اہتمام سے حاضر ہوتے تھے۔ (۲)

علمی استفادہ کرنے والوں میں مولانا اشتیاق احمد ظلی مرتب معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ، ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل بھی رہے ہیں، اور عثمانیہ یونیورسٹی کے زمانہ تدریس میں بنگلور کے میر مقصود علی خاں مرحوم مدیر ''سالار'' بنگلور نے بھی تلمذ کا شرف حاصل کیا تھا اور دینی استفادہ بھی کیا، ندوۃ العلماء کے معتمد مال اور نائب ناظم پروفیسر وصی احمد صدیقی صاحب اور سری نگر کشمیر کے پروفیسر عبدالصمد صاحب کا بھی خصوصی ربط وتعلق رہا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نے ان کی کتابوں کا ترجمہ کر کے خاطر خواہ استفادہ کیا اور ان کی دعائیں و توجہات حاصل کیں، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے ''تجدید تصوف وسلوک'' کا عربی میں ترجمہ کیا جو ''بین التصوف والحیاۃ'' کے نام سے عرب ممالک میں شائع ہوئی، اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نے ''مذہب وعقلیات'' کا عربی میں ترجمہ کیا جو ''الدین والعقل'' کے نام سے عرب ممالک میں شائع ہوئی، مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ فرزند حضرت مولانا ڈاکٹر سید العلی حسنیؒ پر ان کی بڑی شفقت تھی اور وہ تعلق تھا جو ایک شفیق باپ کا اپنے بیٹے کے ساتھ ہوتا ہے۔

---

(۱) مولانا عبیداللہ بلیاویؒ کے بھانجہ اور غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل تھے، ۴۱ سال کی عمر میں دہلی میں انتقال کیا۔

(۲) روایت مولانا رئیس الشاکری ندوی

باب پنجم

علالت و وفات

صحت میں اضمحلال

مولانا عبدالباری ندوی لکھنوی کو اللہ تعالیٰ نے اچھی عمر دی، تقریباً ۹۰ رسال کی عمر پائی، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو صحت کا بھی اچھا زمانہ پایا، صحت کی انھوں نے فکر بھی رکھی، کئی کلومیٹر پیدل چلنے کا ان کا روز کا معمول تھا، اپنے قدیم اور نہایت مخلص محبّ ومحبوب ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (ناظم ندوۃ العلماء) کے پاس جب تک صحت نے ساتھ دیا اکثر آتے تھے، جس کے لیے انھیں کئی کلومیٹر چلنا پڑتا تھا، دل ودماغ آخر تک حاضر رہا، علالت کا زمانہ بلکہ فریش ہونے کا زمانہ بھی مہینہ دو مہینہ کا نہیں رہا، سالوں کا رہا، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ۱۹۷۲ء میں لکھا تھا:

> ''گراں گوش تو ہمیشہ رہے، (ایک طبی سبب ممکن ہے کہ نیبو (لیموں) کا زیادہ استعمال ہو) اور اب کئی برس سے گراں گوشی بہت بڑھ گئی ہے اور اب کئی سال سے عام صحت بھی پھر خراب رہنے لگی ہے اور چلنے پھرنے کے تو جیسے ناقابل ہی ہو گئے ہیں۔''(۱)

لیکن جیسا کہ راقم نے عرض کیا کہ دل ودماغ صحتمند رہا، اس کی دلیل بھی مولانا دریابادی ہی دیتے ہیں:

> ''اس پر بھی لکھنے کا کام خوب کئے جاتے ہیں، افسوس ہے کہ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے زمانہ میں توجہ نہ کی، ورنہ وہ بڑی مدد فرماتے.....

---

(۱) معاصرین۔

حضرت تھانویؒ کو اس کی حسرت ہی رہ گئی، اب ان کی وفات کے بعد گویا بڑی حد تک تلافی مافات کر دکھائی، خدمت دین کے لیے اللہ ان کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائے۔'' (۱)

مرض الموت

مرض الموت میں ان کو یہ احساس بہت بڑھ گیا تھا کہ علم و دین کا جو حق ہے وہ ادا نہ ہوا، مولانا کی اس کیفیت کو ان ہی کے صاحبزادہ حافظ احمد الباری ایک واقعہ کی روشنی میں یوں بیان کرتے ہیں:

''اپنے اعمال کو ہمیشہ ناکافی اور ناکام سمجھتے رہے، اور دنیا میں کچھ نہ کرنے کا ہمیشہ احساس فرماتے رہے، راقم سطور نے مرض الموت میں عیادت کے لیے آنے والے حضرات سے دین کا کچھ کام نہ کر سکنے کے لیے بڑے افسوس کے ساتھ ذکر کرتے سنا، ایک مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی عیادت کے لیے تشریف لائے تو ان سے لپٹ کر بچوں کی طرح بلکتے ہوئے فرمایا: ''مولانا! زندگی رائیگاں گئی، وقت سفر آ گیا، زاد راہ کچھ نہیں، بڑی ضرورت ہے اس سیہ کار کے حق میں دعا فرمائیں، اللہ تعالیٰ اپنے اس حقیر بندہ پر رحم فرمائے، اللہ تعالیٰ مواخذہ نہ فرمائے۔'' مولانا محمد منظور نعمانی بھی دیر تک روتے رہے۔

وصال کے بعد مولانا محمد منظور نعمانی تعزیت کے لیے تشریف لائے تو فرمایا: ''کتابوں میں اکابر اہل اللہ کا جو حال پڑھا وہ حال حضرت مولانا عبدالباری ندوی نور اللہ مرقدہ کا آنکھوں سے دیکھا۔''

---

(۱) معاصرین۔

اسی طرح مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

''مولانا پر شدید بیماریوں کا حملہ توپے در پے ہوا، متعدد آپریشن بھی ہوئے، لیکن ۱۹۷۱ء سے مکمل طور سے صاحب فراش ہو گئے اور ان کی ذہنی صلاحیتیں اور جسم تعطل کا شکار ہو گیا، یہ طویل مدت سعادت مند فرزندوں اور تیمارداروں کے لیے صبر آزما اور ان کے لیے رفع درجات اور تکفیر سیئات کا ذریعہ بنی، یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس طویل عرصہ میں ان کے گھر کے لوگ ان کی بیماری یا معذوری سے کبھی نہیں اکتائے، وہ ہمیشہ انکی درازیٔ عمر کی دعا کرتے رہے، اور بڑی مستعدی اور فرض شناسی کے ساتھ خدمت کی، اس زمانہ میں بھی ان کا ذہن یاد الٰہی، فکر آخرت اور دینی احکام کے معلوم کرنے سے غافل نہ تھا، دارالعلوم کے اساتذہ بالخصوص مفتی محمد ظہور صاحب، مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی مدرسین دارالعلوم، اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی عیادت کو جاتے تو ان سے مسائل کی تحقیق فرماتے، حافظ محمد اقبال مدرس دارالعلوم سے بہت مانوس تھے، ان کے آنے سے خوش ہوتے اور دینی گفتگو کرتے۔''(۱)

وصیت

وصیت سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں ایک اہم سنت ہے، اللہ کے نیک بندے کیسے اس سے غافل رہ سکتے ہیں، دین وشریعت کے احکام پر عمل پیرا رہنے اور تمام اعمال میں صرف ایک مقصد (رضائے الٰہی) کو غالب

(۱) پرانے چراغ ۲/۱۲۹۔

رکھنے کی وصیت گھر کے افراد اور سبھی متعلقین کو کرتے ہی رہے اور اپنی کتابوں اور سبھی تحریروں کے ذریعہ اور زیادہ طاقتور و مؤثر طریقہ سے بھی فرمائی، تعلیم سے متعلق ایک اہم مکتوب بھی راقم کی نظر سے گذرا(۱) اپنی ذات سے متعلق بھی چند وصیتیں فرمائیں وہ درج کی جاتی ہیں:

حافظ احمد الباری صاحب لکھتے ہیں:

''والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن چند لوگوں سے بہت متأثر اور بہت خوش رہے، ان میں حافظ اقبال صاحب دام اقبالہ سرفہرست ہیں، حافظ صاحب مدظلہ العالی (۲) کو ان کے یہاں آنے اور ملنے کی ہر وقت اجازت تھی، اپنی وصیت میں انھوں نے انتقال کے بعد غسل دینے کی وصیت حافظ صاحب مدظلہ العالی اور مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب مدظلہ العالی کو اور نماز جنازہ حضرت مولانا علی میاںؒ کے لیے فرمائی تھی، وہ اللہ نے ان کی خواہش کے مطابق پوری فرمائی۔''

حادثۂ وفات

یوم جمعہ ۲۷ر محرم الحرام ۱۳۹۶ھ مطابق ۳۰ر جنوری ۱۹۷۶ء کی صبح لکھنؤ کی بزرگ ترین شخصیت اور عالم اسلام کی عبقری ہستی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لائق فخر فرزند، استاذ الاساتذہ مولانا شبلی نعمانی کے آخری شاگرد، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے محبوب خلیفہ اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے مسترشد صادق مولانا عبدالباری ندوی اپنی عمر کے ۸۹ سال اس عالم فانی میں گذارنے کے بعد

---

(۱) یہ نامۂ وصیت کتاب کے آخر میں ملاحظہ ہو کہ اس کا تعلق مولانا کے تعلیمی افکار و رجحانات اور نظریات سے ہے۔

(۲) افسوس کہ حافظ صاحب نے بھی ۲۷ر رجب ۱۴۲۹ھ کو گونڈہ میں انتقال کیا اور نماز جنازہ ان کی وصیت کے مطابق مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے پڑھائی، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

رحلت فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، ان کے سفر آخرت کی پہلی منزل احاطۂ دار العلوم ندوۃ العلماء تھی، ندوہ کی مسجد کے باہر نماز جنازہ طلبہ، اساتذہ اور شہر کے اہل تعلق کی بڑی تعداد کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے پڑھائی، اور سبھی نے بڑی عقیدت ومحبت کے ساتھ اپنے ان محبوب ومحترم بزرگ ہستی کو الوداع کیا، اور ڈالی گنج قبرستان میں خلد نشیں کیا۔(۱)

ان کے انتقال کے پر ''تعمیر حیات'' لکھنؤ میں مولانا اسحاق جلیس ندوی نے لکھا کہ مولانا عبدالباری ندویؒ اس نسل کے آخری نمائندہ تھے، جس کی دینداری، للّٰہیت، خلوص، علمی کمالات آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ انھیں اپنی آغوش رحمت میں جگہ عطا فرمائے، اور ہمیں اپنے فضل خاص سے ان کا بہتر بدل نصیب فرمائے۔

اور لکھا کہ:

> ''ہم تین یا چار طلباء سے آج سے بیس برس پہلے انھوں نے اپنا درس شروع کرنے سے پہلے دریافت کیا ''ندوہ میں پڑھنے کا کیا مقصد ہے؟'' سوال کوئی پیچیدہ نہیں تھا، مگر کسی کا جواب انھیں مطمئن نہ کرسکا، ایک نے جواب دیا کہ عربی زبان وادب میں ترقی مقصد ہے، دوسرے نے کہا کہ دین کی خدمت وغیرہ، مولانا نے فرمایا کہ مومن کا مقصد زندگی ''رضائے الٰہی'' ہونا چاہئے۔''(۲)

حضرت مولانا عبدالباری ندوی کی پاکیزہ زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ان کی زندگی کا محور ان کا یہی ایمانی جملہ نظر آئے گا، اس طرح انھیں نفس مطمئنہ حاصل تھا۔

---

(۱) مولانا عبدالباری ندوی کی ابدی آرام گاہ قبرستان کی مسجد سے متصل بڑے گیٹ (دروازہ) سے قریب ایک چہار دیواری کے اندر ہے، سادہ اور خام ہے۔

(۲) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰-۲۵ر فروری ۱۹۷۶ء

﴿یَاأَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۔ ارْجِعِیْ إِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۔
فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۔﴾

حلیہ

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی ان کا حلیہ یوں بیان کرتے ہیں:

''مولانا کو اللہ تعالیٰ نے علمی و روحانی درجات کے ساتھ جسمانی وجاہت بھی عطا کی تھی، کشیدہ قامت، کھلتا ہوا گندمی رنگ، باوجاہت، متناسب الاعضاء جسم و چہرہ، فراخ آنکھیں، نہایت جامہ زیب، لباس سادہ لیکن آراستہ، اودھ کے دیندار شرفاء و رؤساء کا انداز، شیروانی کے تمام بٹن لگے ہوئے، سلجھی ہوئی سفید شرعی داڑھی، چال میانہ، آواز نہ پست اور نہ بلند، میانہ روی ہر بات سے ظاہر ہوتی تھی۔''(۱)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنا مشاہدہ اس اضافہ کے ساتھ اسی کے مطابق بیان کرتے ہیں:

''اودھ کے دیندار شرفاء و رؤساء اور ندوہ کے خوش ذوق و نستعلیق فضلاء کا نمونہ۔''(۲)

معمولات

حافظ احمد الباری صاحب کہتے ہیں:

''تہجد کے وقت اٹھ جاتے، نماز تہجد سے فارغ ہوکر ذکر میں مشغول ہوجاتے، فجر کی نماز سے پہلے اذان ہوتے ہی مسجد چلے

---

(۱) سوانحی نقوش از مولانا عبداللہ عباس ندوی۔

(۲) پرانے چراغ ۲/۱۱۵۔

جاتے اور وہاں نماز پڑھ کر قرآن مجید کی تقریباً آدھا گھنٹہ تلاوت کرتے، اور گرمیوں کا زمانہ ہوتا تو وہیں سے اشراق پڑھ کر ٹہلنے نکل جاتے، ۷-۸ کلومیٹر روزانہ مشی کا معمول تھا، وہاں سے واپس لوٹ کر لکھنے پڑھنے کے لیے بیٹھ جاتے اور تصنیف وتالیف کا کام کرتے، ٹھیک دس بجے کھانا کھاتے، ناشتہ کا معمول تھا، چائے پیتے نہیں تھے، کھانے سے فارغ ہوکر آرام کرتے اور لیٹے لیٹے اخبار پڑھتے، پھر قیلولہ کرتے پھر ظہر کے وقت اُٹھ جاتے اور ظہر کی نماز سے فارغ ہوکر خطوط دیکھتے اور ان کے جوابات دیتے، عصر کی نماز تک معمول رہتا، بعد عصر لوگوں سے ملاقات کا وقت تھا، مقامی وبیرونی جو لوگ آتے ان سے اس وقت ملاقات کرتے اور وعظ وارشاد کی مجلس بھی رہتی، پھر مغرب کی نماز کا وقت ہوجاتا، مغرب کی نماز پڑھتے، مغرب کی نماز پڑھ کر ذکر واوّابین اور معمولات سے فارغ ہوکر فوراً کھانا کھا لیتے، اس کے بعد عشاء کی اذان تک چہل قدمی کرتے، عشاء کی نماز پڑھ کر تسبیح لے کر فوراً لیٹ جاتے، والدہ ان کے سر میں تیل لگاتی رہتیں اور وہ تسبیح پڑھتے پڑھتے سوجاتے، جاڑوں میں ٹہلنے کا وقت عصر بعد کا تھا۔"

اخلاف وپسماندگان

اہلیہ محترمہ، صاحبزادگان اور صاحبزادیاں اور احفاد واسباط سے معمور گھر اپنے پیچھے چھوڑا، مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ:

"حضرت مولانا عبدالباری ندوی علیہ الرحمہ کی دو صاحبزادیاں ہیں

جو ماشاء اللہ صاحب اولاد ہیں، اور چار صاحبزادے ہوئے، بڑے صاحبزادہ جناب شمس الباری صاحب نے پاکستان (لاہور) میں اقامت اختیار کی، دوسرے صاحبزادہ الحاج مولوی فضل الباری صاحب ہیں جو گھر بار کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں، حج کی سعادت سے بہرمند، اپنے والد نامدار کی سنت میں ایک خوبصورت مسجد اپنے خرچ سے تعمیر کرائی ہے جس میں ملحق ایک تحفیظ القرآن کا مدرسہ بھی قائم کیا ہے، جس کو اپنے ذاتی خرچ سے چلا رہے ہیں، اس کے علاوہ رفاہ عام کے کاموں میں حسب استطاعت حصہ لیتے ہیں، ندوہ سے ان کا ذاتی اور موروثی تعلق دونوں ہے، اس کی اہم خدمات میں حصہ لیتے ہیں چند سال پہلے اپنے زیر انتظام جانفشانی سے انھوں نے ایسا ٹیوب ویل اور واٹر ٹینک تیار کردیا جس سے ندوہ کی پوری بستی جو ڈھائی ہزار نفوس سے آباد ہے سیراب ہو رہی ہے، جزاہ اللہ، ان کے شریک کار اور معاون ان کے تیسرے بھائی الحاج احمد الباری صاحب ہیں جو متعدد بار حج اور بیشمار عمرے کر چکے ہیں، چوتھے بھائی عبید الباری صاحب ہیں جو آسام میں ایک اچھے عہدہ پر فائز ہیں۔"(۱)

اہلیہ محترمہ

مولانا نے اپنی وفات کے وقت صاحبزادگان کے علاوہ اہلیہ محترمہ کو بھی یادگار چھوڑا، عظمت النساء بنت حاجی عبد الغفار صاحب، اچھا گاؤں بارہ بنکی کی رہنے والی تھیں، اور ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئیں، عمر میں خاصا تفاوت تھا، ۲۵ سال مولانا سے

(۱) سوانحی نقوش از مولانا عبد اللہ عباس ندوی۔

چھوٹی تھیں، یہ دوسری اہلیہ تھیں، ان سے نکاح سے قبل کاکوری کے علوی خاندان کی خاتون سے نکاح ہوا تھا اور اولاد (دو بچے) بھی ہوئی، مگر نہ اہلیہ رہیں اور نہ ہی اولاد زندہ رہی، پھر دوسرے نکاح کی بات چلتی رہی، کانپور میں رشتہ طے ہوا، مگر وہاں سے مہر کا زبردست مطالبہ تھا، حتی کہ ان لوگوں نے یہ کہا کہ مہر میں کوٹھی لکھ دیجئے، مولانا نے اپنے شیخ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کو پوری بات لکھی اور نکاح پڑھانے کی بھی درخواست پیش کر رکھی تھی، حضرت مولانا نے فرمایا کہ میں مہر فاطمی کے سوا نکاح نہیں پڑھاتا، آخر مولانا نے کانپور یہ کہلا دیا کہ حضرت مدنیؒ نکاح نہیں پڑھائیں گے تو میں بھی نکاح نہیں کرتا، آخر وہ رشتہ نہیں ہوا، اور پھر بارہ بنکی میں عظمت النساء صاحبہ سے نکاح ہوا، یہی والدہ ہیں، شمس الباری صاحب، فضل الباری صاحب، حافظ احمد الباری صاحب، عبید الباری صاحب اور ان کی بہنوں کی۔

اللہ نے بی بی عظمت النساء کو اچھی عمر دی، اور گوناگوں صفات سے نوازا تھا، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتی تھیں، اور یہ تعلق رسمی نہیں تھا، ان کے تلقین کردہ وظائف کو پورا کرتیں، اور جب ان کا ان کے مکان پر قیام ہوا تھا تو ان کے مزاق ومزاج کا پاس رکھتے ہوئے راحت پہنچانے کی پوری کوشش کی تھی، اور تھانہ بھون بھی مولانا عبد الباری صاحب کے ساتھ کئی بار گئیں، اور کچھ کچھ دن رہ کر بہت کچھ سیکھا، نماز اول وقت پڑھتیں اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں رہتیں، جب نماز کا وقت آجاتا تو بیقرار ہو جاتیں، اور انتظار میں جانماز بچھائے بیٹھی رہتیں، حسن معاشرت رکھتی تھیں، اپنے اعزاء کا خیال، سسرالی اعزاء واقرباء کے ساتھ حسن سلوک، زبان وعمل سے ایذاء رسانی سے حد درجہ گریز، اولاد کی تربیت میں حضرت مولانا کی ہم مذاق تھیں، دینی معاملات میں پوری سختی کرتیں، بڑے صاحبزادے نے نوکر کو برا کہا تو انھوں نے سخت تادیب وتنبیہ کی، پسامرچا منھ میں بھر

دیا، حق شوہری کو بھی پورا ادا کیا، مولانا عبدالباری صاحب جب معذور اور علیل تھے تو بڑی خدمت کی اور چار سال کی مدت میں ہر جگہ آنا جانا بند کر دیا، ان کے پوتے حامد احمد صاحب کہتے ہیں کہ دادا اور دادی دونوں ہی بڑی شفقت فرماتے تھے، لیکن دین کا معاملہ آجاتا تو ان دونوں سے زیادہ سخت کوئی اور نہ ہوتا، پوتوں نواسوں کو ان کی شفقتیں خوب ملتیں، رحمدلی اس قدر تھی کہ کسی کی پریشانی دیکھ لیتیں تو بڑی متاثر ہوتیں اور اس کے دکھ درد میں کام آتیں، غیبت نہ کرتیں اور نہ ہی سنتیں، ۲۸ر جنوری ۱۹۹۹ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ نے نماز پڑھائی، انتقال کے بعد قرب وجوار کی عورتیں دیکھنے آئیں تو کہنے لگیں یہ کونسا عمل کرتی تھیں کہ اتنا نورانی چہرہ ہے، رحمها الله تعالیٰ رحمة واسعة وغفرلها مغفرة تامة.

اولاد

چار صاحبزادگان اور دو صاحبزادیاں ہوئیں، اور یہ سب دوسری اہلیہ سے ہیں، سب سے بڑی محترمہ صبیحہ الباری صاحبہ تھیں، یہ مولانا محمد ایوب ہاشمی پسر صوفی محمد افضل علی تھلواروی خلیفہ حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کو منسوب ہوئیں، اصلاح واستفادہ کا تعلق شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی سے قائم کیا، ان کے چار بیٹے ہیں، بڑے بیٹے محمد صالح ہاشمی، دوسرے ڈاکٹر معراج ہاشمی، تیسرے محمد افضال ہاشمی، چوتھے محمد حارث ہاشمی ہوئے جو ۱۹۸۶ء میں ایک حادثہ میں انتقال کر گئے۔

دوسری صاحبزادی محترمہ امۃ الباری عرف عائشہ الباری سید ریاض حسین صاحب کو منسوب ہوئیں، جو کہ نگرام (لکھنؤ) کے قریب میرک نگر کے رہنے والے تھے، محکمہ صحت میں افسر رہ کر لکھنؤ سے ریٹائر ہوئے، ان کے ایک صاحبزادہ سید حسن اور ایک صاحبزادی عظمیٰ ریاض زوجہ سید خالد رضوی (اناؤ) ہیں، یہ تھی مولانا عبدالباری ندوی کی دختری اولاد، ان کی اولاد نرینہ کی تفصیل اس طرح ہے:

۱-شمس الباری صاحب، ان کے دو صاحبزادے ہیں فواد شمس اور نوید شمس، تعلیم وتربیت ہردوئی میں مدرسہ اشرف المدارس میں رہ کر حضرت مولانا ابرار الحق حقیؒ کی نگرانی میں اور پھر دار العلوم ندوۃ العلماء میں بھی حاصل کی، مگر بعض اسباب کی بنا پر تکمیل نہ کر سکے، پاکستان منتقل ہو گئے تھے، اور کراچی میں مقیم رہ کر ۱۴/اپریل ۲۰۰۵ء میں انتقال فرمایا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ وغفرلہ مغفرۃ تامۃ۔

۲-فضل الباری صاحب غیر شادی شدہ ہیں، اپنے بڑے بھائی شمس الباری مرحوم کی طرح مدرسہ اشرف المدارس اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے رہے مگر بعض وجوہات کی وجہ سے یہ مرحلہ پورا نہ کر سکے مگر اس کی تلافی کے لیے دینی و تعلیمی کاموں کو تقویت پہنچانے کا کام برابر جاری رکھے ہوئے ہیں، دار العلوم ندوۃ العلماء کے سلسلہ میں ان کے تعاون کا ذکر پہلے گذر چکا ہے، اس کے علاوہ لکھنؤ میں انجمن اصلاح المسلمین اور ممتاز ڈگری کالج، ممتاز انٹر کالج، مولانا آزاد میوریل اکیڈمی لکھنؤ اور فخر الدین علی احمد اکیڈمی اتر پردیش کے رکن بھی ہیں۔

۳-احمد الباری صاحب، ان کی پانچ بیٹیاں حامدہ احمد الباری زوجہ محمد احمد انجینئر (لکھنؤ)، عاصمہ احمد الباری زوجہ احمد سعید قدوائی (جدہ)، فاطمہ احمد الباری زوجہ ڈاکٹر معراج ہاشمی (نواسہ مولانا عبد الباری ندوی)، عارفہ احمد الباری زوجہ صبور محتشم صاحب (مقیم جدہ)، رافعہ احمد الباری زوجہ حبیب نصار رفیع صاحب (جدہ) اور تین بیٹے حامد احمد الباری، محمود احمد الباری، اور حمید احمد الباری ہیں، حامد صاحب کو اپنے دادا صاحب اور دادی صاحبہ کی بڑی عنایتیں اور شفقتیں حاصل ہوئیں۔

۴-مولانا عبد الباری ندوی کے چوتھے صاحبزادہ عبید الباری صاحب کے تین بیٹے مطیع الباری، حماد الباری، سجاد الباری اور ایک بیٹی مومنہ غزالہ ہیں، الحاج عبید الباری صاحب آسام اور گجرات میں O.N.C. میں ملازم رہے، اور آسام سے

ریٹائر ہو کر لکھنؤ میں مقیم ہیں۔

سبھی صاحبزادگان نے ہردوئی کے مدرسہ اشرف المدارس میں اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی، مدرسہ اشرف المدارس میں تعلیم کا آغاز کیا، اور یہ زمانہ مدرسہ کے بھی آغاز کا زمانہ تھا، مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری کی خدمت میں ان کے وطن فتح پور تال نرجا کے مدرسہ میں بھی بعض رہے، البتہ ان میں حافظ احمد الباری ممتاز رہے، اور انھوں نے گونڈہ میں مدرسہ فرقانیہ میں بھی تعلیم حاصل کی تھی، مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی میں مولانا شاہ ابرارالحق حقیؒ اور مولانا قاری امیر حسن صاحب اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا معین اللہ ندویؒ، مولانا عبداللہ عباس ندویؒ سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی معتمد تعلیم ندوۃ العلماء سے اور مدرسہ فرقانیہ گونڈہ میں حافظ محمد اقبال گونڈویؒ سے تعلیم حاصل کی، اور متعدد خصوصیات کے حامل بنے، اپنے قوی تر دینی رجحانات کی وجہ سے بیت اللہ شریف کا سفر بار بار کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ دوسری سعادتوں سے بھی بہرور ہوتے رہے ہیں، پہلا حج ۱۹۷۶ء میں اپنے والد مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی وفات کے دس ماہ بعد کیا، اور اس طور پر کہ والدہ محترمہ کو لے کر گئے اور ان کو بھی حج کرایا، اس کے بعد سے ان کے لیے عمرہ وحج کا ایک تسلسل قائم ہوگیا، اور آج بھی رمضان کا مہینہ وہاں گذارنے کا معمول بنائے ہوئے ہیں، موصوف نے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے بھی تعلق رکھا، جس کا ایک تحریری ثبوت اس بات سے ملتا ہے جو مولانا عبدالباری ندوی نے اپنے ایک خط میں حضرت شیخ علیہ الرحمہ کو لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''احقر زادہ احمد الباری سلمہ کے ساتھ ان کی بڑی بہن صبیحہ سلمہا آں مخدوم کی خدمت میں بیعت کی غرض سے حاضر ہورہے

ہیں، امید ہے کہ حضرت والا اس کی اور احقر کی یہ درخواست بطیب خاطر قبول فرمائیں گے، نیز اس کے اور اس کے بال بچوں اور شوہر محمد ایوب ہاشمی سلمہم سب کی صلاح دین کے لیے دعا فرمائیں گے، احسن اللہ جزاءکم۔" (۱)

داماد

دامادوں میں مولانا محمد ایوب ہاشمی ندوی ایک نیک صالح اور دعوتی مزاج رکھنے والے شخص تھے، آخر میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے وابستہ ہوگئے اور کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انگریزی سیکشن کی نگرانی ان کے سپرد ہوئی، بروز جمعہ ۲۶/ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو انھوں نے وفات پائی، ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ نے ان کی وفات پر جو تعزیتی تجویز پاس کی وہ نقل کی جاتی ہے:

"مولانا محمد ایوب صاحب ہاشمی ندوی صوفی افضل علی مرحوم (۲) خلیفہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے صاحبزادہ تھے، تھلوارہ ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فضیلت کی

---

(۱) مکتوب مؤرخہ ۳/ ذی الحجہ ۸۷ھ/ ۳/ مارچ ۶۸ء

(۲) مولانا صوفی افضل علی صاحب بارہ بنکی کے رہنے والے اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے شروع کے وابستگان میں تھے، اور پھر خلیفہ ومجاز بیعت بھی ہوئے، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے پرانے چراغ ۱/ ۱۰۹، میں لکھا ہے: "والد ماجد (مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ) کے ایک عزیز شاگرد مولوی افضل علی صاحب تھلواروی جن کو ہم سب لوگ صوفی صاحب کے نام سے جانتے اور پکارتے تھے مولانا کے مرید اور مجاز بیعت تھے، انھوں نے مولانا سے اس وقت بیعت کی تھی، جب شاید چند ہی حضرات کو یہ شرف حاصل ہوا ہوگا، وہ مولانا کا تذکرہ برابر کرتے رہتے تھے۔"

حافظ احمد الباری صاحب نے بتایا کہ: "انتقال کے وقت عجیب کیفیات ظاہر ہوئیں، اہلیہ پاس بیٹھی تھیں، ان سے فرمانے لگے آپ ہٹ جایئے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں۔"

صوفی افضل علی صاحب نے ۸۷/ سال کی عمر میں ۳۱/ مارچ ۱۹۶۸ء کو وفات پائی۔ (تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو "حیات افضل" از محمد یٰسین ساحل مظاہری، ناشر فضل الباری صاحب باری ہاؤس لکھنؤ)

سند لینے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے بی.اے.ایم.اے.کیا،(۱) آسام کے ایک کالج میں عربی کے لکچرار ہوگئے، تیس سال کی خدمات کے بعد ۱۹۹۸ء میں وہاں سے سبکدوش (ریٹائرڈ) ہوئے تو دارالعلوم میں شبلی لائبریری میں انگریزی شعبہ کی ذمہ داری سنبھالی، طویل علالت کے بعد ۲۶/اکتوبر ۲۰۰۱ء کو اپنے مالک حقیقی سے جاملے، ناظم ندوۃ العلماء جناب مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب ندوی نے نماز جنازہ پڑھائی، دارالعلوم کے اساتذہ طلباء اور بڑی تعداد میں شہریوں نے نماز و تدفین میں شرکت کی۔''(۲)

مولانا ایوب ہاشمی کے چچا زاد بھائی جناب شارق علوی صاحب ایڈیٹر ''فریگرنس آف ایسٹ'' ندوۃ العلماء لکھنؤ لکھتے ہیں:

''بارہ بنکی کی تحصیل حیدرگڑھ میں موضع تھلوارہ سے ہم لوگوں کا تعلق ہے، ایوب بھائی میرے تایا (والد کے بڑے بھائی) مولانا صوفی افضل علیؒ کے پانچ صاحبزادوں میں سے تیسرے صاحبزادے تھے، ان سے بڑے دو بھائی چودھری احمد علی مرحوم کی تعلیم تو گھر کے مکتب سے آگے نہیں بڑھ پائی جبکہ ان سے چھوٹے بھائی چودھری محمد مسعود نے تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے فارغ ہوکر محکمۂ صحت میں ملازمت اختیار کرلی تھی، ایوب بھائی اوران کے چھوٹے بھائی محمد الیاس مرحوم کو ابتدائی عربی وفارسی کی تعلیم ان کے والد نے دی اور پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں

---

(۱) لکھنؤ یونیورسٹی سے P.H.D. کی ڈگری بھی حاصل کی۔

(۲) کارروائی جلسہ مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ الہند، صفر ۱۴۲۳ھ/اپریل ۲۰۰۲ء۔

باقاعدہ حصول علم کے لیے داخل کرادیا، الیاس مرحوم تو دو سال کے ہی مظاہر علوم سہارنپور گئے اور وہاں چند ماہ رہ کر گاؤں واپس آ گئے، جہاں کھیتی باڑی میں ان کی دلچسپی زیادہ رہی، ایوب بھائی کا شمار ندوہ کے ہونہار طلباء میں ہوتا تھا، جہاں وہ درسی نصاب کے علاوہ عام ادبی و علمی سرگرمیوں میں کافی دلچسپی لیتے تھے، انھوں نے اپنے ندوہ کے دوران قیام اس کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھایا اور مختلف موضوعات پر اپنی علمی معلومات میں اضافہ کیا۔

ندوہ سے فارغ ہوکر انھوں نے یوپی بورڈ سے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لے کر بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں، ایم اے میں نہ صرف یہ کہ وہ فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے بلکہ انھیں امتیازی حیثیت بھی حاصل ہوئی۔

ایوب بھائی کے اس زمانہ میں اردو کے مشہور اخبار ''مدینہ'' اور ''انصاف'' میں مضامین پابندی سے شائع ہوتے تھے، ان کے مضامین میں مولانا آزاد کا طرز تحریر صاف نمایاں تھا، زبان بھی تقریباً ویسی ہی ہوتی تھی، خطیبانہ رنگ لئے ہوئے مضامین ان کی مذہبی اور ادبی صلاحیت کی غمازی کرتے تھے۔

چھٹی دہائی میں آسام کے ایک کالج میں انھیں عربی کے لکچرر کے عہدے کی پیشکش کی گئی اور باوجود ہم لوگوں کے منع کرنے کے وہ چلے گئے اور تقریباً تیس سال آسام ان کی سرگرمیوں کا مرکز رہا، جہاں درس وتدریس کے علاوہ دعوتی مشغولیات میں ان کا زیادہ

وقت صرف ہوتا تھا، سیرت پاک پر تقریر کرنے کے لیے صوبہ آسام کے طول وعرض سے انھیں دعوت دی جاتی تھی، اور وہ ان کا احترام بھی کرتے تھے، گذشتہ چند سال سے وہ سیتاپور روڈ لکھنؤ پر واقع اپنے مکان سے متصل کھدرے کی مسجد میں جمعہ سے قبل پابندی سے مقتدیوں سے خطاب فرماتے تھے، اور قرآن وحدیث کی روشنی میں آخرت کی زندگی اور دنیاوی اعمال میں کوتاہیوں کی بازپرس پر بڑے ہی مؤثر انداز میں آگاہی دیتے۔

ایوب بھائی طبیعتاً خاموش اور نیک انسان تھے، خوش پوشاک، خوش اخلاق اور ہمیشہ چہرے پر مسکراہٹ انکی یاد بنائے رکھے گی۔'' (۱)

مولانا عبدالباری ندوی کی وفات سے ایک عہد کا خاتمہ

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ایک فکر انگیز وروح پرور تقریر (☆)

حاضرین!

حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی جن کو ہم مدظلہ، دامت برکاتہم کے الفاظ سے یاد کرتے تھے، اب ان کے لیے ہم مرحوم ومغفور اور رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ (۱۰ نومبر ۲۰۰۱ء)

(☆) حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے یہ تعزیتی تقریر فرمائی جو ''تعمیر حیات'' لکھنؤ کی اشاعت فروری ۱۹۷۶ء میں طبع ہوئی، اسی سے یہاں نقل کی گئی ہے۔

استعمال کررہے ہیں، یہ رحمت کے الفاظ ہیں اور جن دعائیہ الفاظ کے استعمال کے لوگ عادی ہیں، اللہ تعالیٰ کی میزان میں وزن کے اعتبار سے یہ الفاظ زیادہ وقیع ہیں، زندگی فانی ہے چاہے جتنی طویل ہو۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ انھوں نے بہت طویل زندگی پائی، اگرچہ قلبی تعلق اور جذبات کا فیصلہ اور تقاضہ یہ ہے کہ ایسی قابل احترام اور محبوب شخصیت کی زندگی کتنی ہی طویل ہو، طویل نہیں معلوم ہوتی، اور جب بھی اس کی آخری منزل آجائے تو افسوس ہی ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی اپنے عنفوان شباب میں اس دنیا سے رخصت ہوجائے تو غم زیادہ ہی ہوتا ہے، لیکن جو اپنی عمر طبعی پوری کرکے اس دنیا سے چلا جائے تو کسی قدر تسکین ہوتی ہے، جو الفاظ ہم ان کی زندگی میں استعمال کرتے تھے ان کا استعمال کرنا بھی ہمارا اخلاقی فرض اور اپنے تعلق کا اظہار تھا، لیکن ان الفاظ کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی میزان میں نتیجہ اور قدر و قیمت کے اعتبار سے وہ الفاظ زیادہ وزنی ہیں جن کی نسبت رحمت الٰہی سے ہو، اس لیے کہ یہ زندگی تو حقیقت میں باعث رحمت ہی ہے، ایک مومن کے نقطہ نظر سے بھی اور حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے بھی یہ زندگی تو زحمتوں کا مجموعہ ہے اس لیے رحمت بہرحال زحمت ہے، اور وہ چیز جو رحمت کا ذریعہ بن جائے اس چیز کے مقابلہ میں جو زحمتوں کو ساتھ لائے بہرحال قابل ترجیح ہے، اس لیے طبعی طور پر ہم کو کتنا ہی غم ہو، ان الفاظ کے استعمال کرنے پر ہم کو تسکین ہونی چاہئے کہ خدا کے فضل و کرم سے اپنے عقیدے اور ایمان اور آثار و قرائن کے اعتبار سے بھی ہم ان کو اللہ کی رحمت کا مستحق سمجھتے ہیں اور ہم اپنے اوپر حق سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے لیے یہ الفاظ استعمال کریں۔

میرا ان سے ایک طرح کا خاندانی اور ذاتی تعلق تھا اور خاص طور پر میرے برادر محترم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ سے ان کا ایسا گہرا تعلق تھا جیسے حقیقی بھائیوں کا سا تعلق ہوتا ہے، اور اس شہر لکھنؤ میں شاید ان سے زیادہ عزیز دوست و رفیق ان کا کوئی نہ

تھا، آخر عمر تک وہ ان کو یاد کرتے رہے، اور پھر مجھ کو ان سے استفادہ کا بھی موقع ملا، اور ان کی شفقت کی نظر مجھ پر ہمیشہ رہی، اس بناء پر میں ان کے احساسات اور نظریات سے واقف رہا ہوں، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ وہ جلسہ تعزیت کے حق میں نہیں تھے، اور وہ ان تمام رسمی جلسوں اور تقریبات کو ناپسند کرتے تھے جن کا ثبوت قرن اول اور صحابہ کرامؓ کی زندگی میں نہ ملے، اور ان کا شرعی ثبوت مشکل ہو جائے، اس لحاظ سے مجھے بہت تردد ہوا کہ یہ جلسہ کیا جائے یا نہ کیا جائے، لیکن اس کے بعد ایسے مفید پہلو سامنے آئے جن کی بناء پر ہم نے اس کو مفید سمجھا اور انہیں پہلوؤں کی طرف آپ لوگوں کو متوجہ کرنا ہے۔

پہلے تو ان کا مختصر سا تعارف کرادوں کہ ہمارے نوعمر طلباء کو انکی تصانیف اور ان کے علوم سے استفادہ کا موقع نہیں ملا اور تقریباً سات سال سے صاحب فراش تھے، اور کچھ فاصلہ کی وجہ سے جانا بھی نہ ہوتا ہوگا، اور ہمارے بہت سے بھائیوں کو ان کی زیارت بھی نہ ہوئی ہوگی، اس لیے میں ان کا تعارف کرادوں، پھر ان پہلوؤں کی طرف متوجہ کروں گا جو ہمارے لیے بہت ہی سبق آموز بلکہ پیغام ہیں، ان کی زندگی کے یہ پہلو اتنے درخشاں ہیں، بہت کم ان کے معاصرین کی زندگی میں درخشاں ہوں گے۔

مختصر تعارف تو یہ ہے کہ گدیہ ضلع بارہ بنکی کے ایک انصاری اور بہت شریف خاندان کے وہ فرد تھے، ان کے والد صاحب حکیم عبدالخالق حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلیؒ سے جو حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے بعد بزرگان سلف کی یادگار اور علوم شریعت کے جامع اور اس کے آخری نمونہ تھے، ارادت کا تعلق رکھتے تھے، مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ نے خود سنایا کہ جب میں پیدا ہوا تو میرے والد صاحب مجھے لے کر مولانا محمد نعیمؒ کے پاس گئے اور کہا حضرت اس کا نام رکھئے تو مولانا نے فرمایا خالق باری تمام کردو نا، ''خالق باری'' کتاب کا نام تھا تو ان کا نام عبدالخالق

تھا اور ان کے بیٹے کا نام عبدالباری، اس لیے خالق باری تمام کردو، تو عبدالباری نام رکھا، مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ نے ابتدائی تعلیم اس زمانہ کے شرفاء کے دستور کے مطابق گھر پر پائی، اس کے بعد ندوۃ العلماء میں جس کا قیام ابھی چند سال پہلے ہوا تھا داخلہ لیا، مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کی ولادت ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۹۰ء کی ہے، تو گویا جب وہ پڑھنے کے لائق ہوئے ہونگے تو ندوہ کے قیام کے سات آٹھ سال ہوئے ہوں گے، تو ندوہ میں درجہ سوم میں ان کا داخلہ ہوا، اور انھوں نے ساری تعلیم یہاں مکمل کی، اس تعلیم کے دوران میں ایک آدھ سال بعض مضامین میں کمزوری کی وجہ سے ان کے والد حکیم عبدالخالق صاحب نے ان کو نگرام مولانا محمد ادریس صاحبؒ کی خدمت میں بھیج دیا، جو ہمارے شیخ التفسیر مولانا محمد اویس صاحب ندوی کے دادا تھے، وہ ہمیشہ شکر گذاری کے ساتھ کہتے تھے کہ وہاں جانے سے مجھے بڑا فائدہ ہوا، دینی فائدہ بھی اور علمی وروحانی فائدہ بھی، اور استعداد میں قوت، استحکام پیدا ہوا، اس کے بعد پھر ندوہ آئے، اس زمانہ میں یہاں علامہ شبلیؒ کا دور تھا، شروع ہی سے ان کی پیشانی پر ذہانت کے نمایاں آثار تھے، اس لیے مولانا شبلیؒ کی نظر جن ہونہار طالب علموں پر پڑی ان میں سے مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ بھی تھے، یہاں انھوں نے تعلیم کی تکمیل کی، اور تعلیم کے دوران میں علامہ شبلیؒ اور ان کا ربط خاص رہا، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندویؒ کے بعد ان کو علامہ شبلیؒ کی مجلس میں اختصاص حاصل تھا، اور مولانا شبلیؒ کی دور بین نگاہ نے پہچان لیا تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہونہار اور آگے چل کر طبقہ علماء کا نام روشن کرنے والا ہوگا۔

مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کی خصوصیت یہ تھی کہ ذہانت کے ساتھ انھوں نے ادبی ذوق بھی پایا تھا اور یہی چیز مولانا شبلیؒ کی بارگاہ میں تقرب کا ذریعہ بنی، اور خاص طور سے فلسفہ اور علوم عقلیہ سے مولانا کو مناسبت تھی، اور اس وقت یہاں پر

بہت ہی جید اساتذہ مسند درس پر متمکن تھے، مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی، مولانا شیر علی صاحبؒ وغیرہ ہندوستان کے صاحب درس اساتذہ یہاں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے تھے، مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ نے یہاں سے باقاعدہ فراغت حاصل کی اور سند لی، ان کو فلسفہ کا خاص ذوق تھا، جب فلسفہ جدید کے حملے ہو رہے تھے علم کلام پر اور عقائد پر، اور عقائد میں تزلزل آرہا تھا، اور علامہ شبلیؒ اس ہراول دستہ کے بھی قائد تھے، جو اس طوفان کے مقابلہ کے لیے سینہ سپر تھا تو مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ نے بھی اسی مضمون کا انتخاب کیا کہ اس راہ سے دین کی بھی خدمت ہوسکتی ہے اور علم کی بھی خدمت ہوسکتی ہے۔

پھر انھوں نے فلسفہ جدید کا گہرا مطالعہ کیا، انگریزی تعلیم جو یہاں ندوہ میں حاصل کی تھی، اس سے بھی فائدہ اٹھایا، مگر وہ کافی نہیں تھی، اس لیے انھوں نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سے جو عمر میں دو تین سال چھوٹے تھے (اللہ ان کی عمر میں برکت دے، کل وہ جنازہ کی نماز میں بھی شریک تھے یہ حسن اتفاق ہی تھا) تو ان سے انھوں نے اپنی انگریزی کو ترقی دینے کی کوشش کی، اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے ان سے عربی میں مدد لی اور اس طرح یہ دونوں متبادل استاد ہیں، اور ہر ایک دوسرے کا شاگرد ہے، پھر انھوں نے اپنے والد صاحب سے خواہش ظاہر کی وہ اپنی انگریزی کو ترقی دینا چاہتے ہیں اور علی گڑھ جانا چاہتے ہیں تو والد صاحب نے جو سراپا دیندار ہی تھے اور حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کے تربیت یافتہ تھے، اس زمانہ کے بزرگ اگر انگریزی پڑھنا جائز بھی سمجھتے ہوں تو کوئی نیک عمل نہیں سمجھتے تھے، تو مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ نے مجھ سے کئی بار کہا کہ میرے والد صاحب نے کہا کہ میں اس کار خیر میں مدد نہیں کرسکتا اور انھوں نے ہاتھ اٹھالیا، تو مولانا شبلیؒ نے علی گڑھ غالباً اس وقت نواب وقار الملک کا دور تھا، ان کو ایک خط لکھ دیا کہ یہ بہت ہونہار نوجوان

ہیں اوران کوفلسفہ سے خاص شغف ہے، آپ ان کواجازت دیں تو وہاں پر کلاسز کواٹینڈ کرسکیں اور فلسفہ کے مضمون میں شریک ہوں تو بعض انتظامی دقتوں کی وجہ سے یہ نہیں ہوسکا، تو پھر مولانا شبلیؒ نے ان کو کشمیر مقبول احمد صاحب قدوائی جو وہاں کمشنر مالیات یا ریلوے منسٹر تھے، بھیجا تو انھوں نے وہاں طویل قیام کر کے اپنی انگریزی کو بڑھایا، ان کی انگریزی ایسی ہوگئی تھی کہ جب وہ پونا کے دکن کالج میں فارسی میں پروفیسر مقرر ہوئے تو انھوں نے خود فرمایا کہ میں انگریزی میں حافظ کا کلام پڑھانے لگا، پھر انھوں نے فلسفہ کا مطالعہ بھی بہت بڑھالیا اور انگریزی بھی ترقی پاتی رہی، یہاں تک کہ فلسفہ کے ایک اچھے صاحب فکر عالم کی حیثیت سے ان کا تعارف ہوا، اس زمانہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی، غالباً احمد آباد میں، اس وقت وہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کہلاتی تھی، تو اس کے جلسہ میں انھوں نے اپنا ایک معرکۃ الآراء اور تاریخی مقالہ پڑھا، جو ''مذہب وعقلیات'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اور جو بقول حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ''اسلام کے دفاع کا ایک آہنی قلعہ ہے'' اور بقول نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے کہ اس رسالہ کو پڑھ کر انھوں نے کہا کہ ''اس شخص کے ہاتھ پر فلسفہ مسلمان ہوگیا ہے، لوگوں کے ہاتھ پر فلسفی مسلمان ہوتے ہیں لیکن اس شخص کے ہاتھ پر تو فلسفہ نے کلمہ پڑھا ہے۔''

جب وہ کئی سال تک پونا کے دکن کالج میں فارسی کے استاد رہے اور ان کی قابلیت کا سکہ قائم ہوگیا تو جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کو ایک فلسفہ کے استاد کی ضرورت تھی تو غالباً مولانا صدر یار جنگ کی خواہش سے وہ وہاں بلا لئے گئے، یہ وہ زمانہ تھا جب کسی یونیورسٹی میں کوئی کسی اعلیٰ ڈگری کے بغیر وہاں اسٹاف میں نہیں آسکتا تھا، گویا ان کا تقرر ایک ناممکن سی بات تھی۔

لیکن مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ اپنے علم کے زور اور اپنی قابلیت کے اثر

سے وہاں کے استاذ مقرر ہوئے، اور تھوڑے ہی دنوں میں وہاں ان کے علم کی دھاک بیٹھ گئی، اور دارالترجمہ سے ان کا تعلق قائم ہوا اور انھوں نے وہاں بڑے مفید کام انجام دیئے اور ان کی ایک معرکۃ الآراء کتاب ''فہم انسانی'' کے نام سے شائع ہوئی اور برکلے کا ترجمہ کیا، یہ سب فلسفہ کی کتابوں کے کامیاب ترین تراجم کا نمونہ ہیں، ایک طرف تو تحریر کی شگفتگی اور قلم کی روانی جو انکو مولانا شبلیؒ سے ورثہ میں ملی تھی، اور ندوہ کی دین تھی، پھر اودھ کا شگفتہ ادبی ذوق اور ذہانت اور اس کے ساتھ علم کی سنجیدگی اور مطالعہ کی گہرائی، ان سب نے مل کر ان کے تراجم کو نمونہ کی حیثیت دیدی، اور وہ وہاں مقبول ہوئے اور اس شعبہ کے صدر بھی ہوگئے، اور اس وقت کے لائق ترین فلسفہ کے طالب علم بہت چمکے اور کامیاب ہوئے، جیسے ڈاکٹر میر ولی الدین جن کا ابھی حال میں ہی انتقال ہوا، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر رضی الدین یہ سب ان کے شاگرد ہیں، ہوسکتا ہے کہ میرے حافظہ نے غلطی کی ہو لیکن بہرحال انھیں کے دور کے لوگ ہیں۔

اس وقت جامعہ عثمانیہ میں دو استادوں کا جو خالص عالم تھے سکہ بیٹھا ہوا تھا، گویا طوطی بولتا تھا، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ، یہ دونوں صحیح معنوں میں یارغار کہے جاسکتے ہیں، دونوں نے وہاں ایک مسجد میں حجرہ بنایا تھا اس لیے یارغار کہنا صحیح ہوگا، دونوں کی زندگی ایک دوسرے میں پیوست ہوگئی تھی، ایک طرح سے سوچنا، ایک ساتھ کھانا، ایک ساتھ ہوا خوری کے لیے نکلنا، مشترک عادات، مشترک خیالات، مشترک مقاصد اور ایسا اتحاد خیال جیسا مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کا تھا کسی مدرسہ میں کم دیکھا گیا ہے۔

مجھے وہ دور یاد ہے جب وہ چھٹیوں میں آیا کرتے تھے تو ہمارے یہاں پابندی سے آتے، جمعہ کی نماز ہماری مسجد میں پڑھنے کا اہتمام کرتے تھے اور دوپہر کا کھانا بھی یہیں کھاتے تھے، مولانا مناظر احسن گیلانی بھی مولانا عبدالباری صاحب

ندویؒ اور بھائی صاحبؒ بھی۔(۱)

حیدرآباد میں بڑی عزت اور وقار کے ساتھ انھوں نے اپنی ملازمت کے دن پورے کئے اور دونوں بڑے عزت ووقار کے ساتھ اپنے اپنے وقت پر پہلے مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ پھر مولانا مناظر احسن صاحب وظیفہ یاب ہوئے۔

یہ دونوں بزرگ عربی مدرسوں کے سند یافتہ تھے، مولانا گیلانیؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ آپ کی اسی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل۔

یونیورسٹیوں میں جامعہ عثمانیہ کا معیار سب سے بلند تھا، اس کے حلقہ تدریس میں ایسے قابل اساتذہ جمع ہوگئے تھے کہ اس کی مثال ہندوستان کی کسی دوسری یونیورسٹی میں نہیں تھی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر الیاس برنی، پروفیسر ہارون خاں شیروانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر حمیداللہ، ڈاکٹر میر ولی الدین جیسے لوگ۔

اس عثمانیہ یونیورسٹی میں خالص عربی مدرسہ کا فاضل جس کے پاس کسی بھی یونیورسٹی کی سند نہیں، صرف اپنی قابلیت کے بل بوتے پر تمام یونیورسٹی پر چھایا رہا، مجال نہیں تھی کہ کوئی شخص وہاں یہ کہہ دے کہ کوئی تحقیقاتی کمیشن بیٹھے اور دیکھے کہ کس کے پاس کونسی ڈگری ہے، کوئی بولتا تو مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کے بولنے سے پہلے وائس چانسلر اس کا منھ بند کردیتا، اور کہتا کہ ہمیں فخر ہے مولانا عبدالباری پر اور مولانا گیلانی پر۔

اے میرے عزیزو! انھوں نے عربی مدرسہ کی سند لی تھی، یہ نہیں کہ سندوں کا ڈھیر اور پی.ایچ.ڈی. کرنا ضروری ہو، انھوں نے کبھی یہ سوچا تک نہیں، حالانکہ وہ بہت آسانی کے ساتھ وہاں ڈاکٹر بن سکتے تھے، نہ معلوم کتنوں کو انھوں نے ڈاکٹر

---

(۱) مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ مراد ہیں۔

بنایا ہوگا۔(۱)

ایک بات ان سے یہ سیکھنے کی ہے عزیزو! کہ اصل چیز آدمی کی قابلیت ہے، کسی بھی فن میں امتیاز پیدا کرلو، وہ جو فارسی کا مصرعہ ہے کہ ؎

کسب کمال کن کہ عزیزے جہاں شوی

تم نحو میں کمال پیدا کرلو، مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ نے ایک رسالہ لکھا ہے ''مذہب وعقلیات'' ساٹھ ستر صفحے کا بھی مشکل سے وہ رسالہ ہوگا، اس کی علمی دنیا میں ایک دھاک بیٹھ گئی، آج بھی اس کو پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص کتنی گہری نظر رکھتا ہے۔

حضرت تھانویؒ نے ایک مرتبہ یہ رسالہ پڑھا تو کسی سے کہا کہ ''یہ شخص عارف معلوم ہوتا ہے'' یہ سند اس شخص کی ہے جو عارف باللہ تھا، اور اپنے زمانہ کا سرخیل مشائخ۔

یہ بات لکھ لو کہ یہ سب خیالی طلسم ہیں کہ جب تک ہمارے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہ ہو اس وقت تک ہم کچھ نہیں کرسکتے، دو مثالیں ہمارے سامنے ہیں اور دونوں اسی درسگاہ سے تعلق رکھتی ہیں، ایک مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ جن کے پاس صرف ندوہ کی سند تھی اور وہ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ فلسفہ کی سب سے اونچی کرسی سے وظیفہ یاب ہوئے، اور دوسری مثال ہے ہمارے محبوب استاد شیخ خلیل عرب ندوی جن کی عربیت کا سکہ ایک زمانہ میں ہندوستان میں رواں تھا، ہم سب انھیں کے رہین منت ہیں اور میں تو ان کا پروردۂ احسان ہوں، جیسے کوئی بچہ الف، باء سے شروع کرتا ہے اسی طرح میں نے عربی زبان اور عربی ادب نثر ونظم سب انھیں سے پڑھا، وہ ندوہ

---

(۱) اور ایک تیسری مثال فرزندان ندوۃ العلماء میں ہی پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی کی سامنے آئی کہ انھوں نے بھی P.H.D. کی ڈگری حاصل نہیں کی، اور ایک ایسے دور میں جب کہ اعلیٰ تعلیمی ترقی کے لیے اس ڈگری کا حصول ضروری ہوگیا ہے وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں اعلیٰ تعلیمی منصب پر فائز ہوئے، اور ڈین آف فیکلٹی آف آرٹ ہوئے، غفر اللہ لہ ورحمہ رحمۃ واسعۃ۔(م)

کے فارغ تھے، ان کے پاس صرف ندوہ کی سند تھی، اچھے اچھے باخبر ندویوں کو یہ معلوم نہیں کہ وہ بھی ندوہ کے باقاعدہ فارغ التحصیل فاضل تھے، وہ کلکتہ میں، ڈھاکہ میں، پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں خدمت انجام دیتے رہے، اور ان کے علمی رعب کا یہ عالم تھا کہ انگریز وائس چانسلر اور شعبوں کے سربراہ تک ان کے سامنے شاگردوں کی طرح بیٹھتے تھے، ایک بات مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کی زندگی سے یہ سیکھنے کی ہے کہ اصل چیز آدمی کی قابلیت، مطالعہ اور محنت ہے، وہ اس پر کبھی شرمندہ نہیں ہوئے اور کہا ہو کہ کاش میں ڈگری یافتہ ہوتا۔

میں نے دونام ہمیشہ ایک ساتھ پڑھے تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندویؒ، میں ان دونوں کو بی.اے. سمجھتا تھا، اس لیے کہ ایک زمانہ میں مولانا عبدالماجد صاحب اپنے نام کے ساتھ بی.اے. لکھا کرتے تھے، ایک مرتبہ اس سلسلہ میں ایک صاحب سے میری بڑی بحث ہوئی وہ کہہ رہے تھے کہ مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ بی.اے. ہیں اور میں کہہ رہا تھا کہ ان کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے۔

بھائیو! دوسرا پہلو جو ہمارے لیے قابل استفادہ ہے اور ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے وہ یہ ہے کہ اتنا بڑا فلسفی، اتنا بڑا رمزداں رمزشناس، ایسا متکلم، اتنا بڑا ذہین، شبلیؒ کا مایہ ناز شاگرد، ندوہ کا ایک روشن خیال فاضل..... لیکن اسکے بعد جو چیز ان کی زندگی میں دیکھنے کی ہے وہ یہ کہ انھوں نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ اپنی اصلاح کریں بلکہ اپنے کو مبتدی نہیں بلکہ ایک انجان آدمی تصور کر کے معالج کے حوالہ کردیں اور اس کا طفل مکتب بن جائیں، اس کے سامنے زانوئے تلمذ طے کریں۔

یہ توفیق تو ہمارے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے دو آدمیوں کو دی ہے، ایک علامہ سید سلیمان ندویؒ دوسرے مولانا عبدالباری ندویؒ اور وہ دونوں اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے تھے، امام غزالیؒ کی طرح، امام غزالی تو حجۃ الاسلام تھے وہ لقب ان کے لیے مخصوص و

مستقل ہے، ان کی زندگی کا ایک نمونہ تھا کہ وہ نقطۂ عروج پر پہنچنے کے بعد مؤرخین نے لکھا ہے کہ دربار خلافت سے انکی مجلسیں آنکھیں ملاتی تھیں، اور صرف طلباء نہیں بلکہ فارغ التحصیل فضلاء ان کے درس میں بیٹھتے تھے، اور "قال أبو حامد و یقول أبو حامد" کا ہر طرف چرچا تھا، اس وقت انھوں نے اپنی یہ کمزوری محسوس کی کہ حسیات و بدیہیات پر میرا جس درجہ کا یقین ہے، غیبیات پر اس درجہ کا یقین نہیں، جب تک غیبیات پر اس درجہ کا یقین نہ ہو، میرا ایمان مکمل نہیں، تاریخ دعوت وعزیمت میں مفصل لکھا گیا ہے "المنقذ من الضلال" میں تفصیل سے ہے، میرا مشورہ ہے کہ ہر طالب عالم اسے پڑھے، امام غزالیؒ کو پڑھانا کیا بلکہ بولنا بھی مشکل ہوگیا، ہاضمہ متاثر ہوا، ان پر سخت بے چینی طاری ہوئی، تو لوگوں نے کہا کہ اسلام کو نظر لگ گئی کہ ایک ایسا نادر روزگار، فاضل یگانہ کی درس سے طبیعت اچاٹ ہوگئی ہے، اور کسی فکر یا طلب میں مبتلاء ہوگیا ہے۔

طبیبوں نے دیکھ کر کہا کہ ایسی چیزیں ان پر مستولی ہوگئی ہیں کہ جنھوں نے پورے نظام جسم کو متاثر کر دیا ہے، اس لئے کسی کام کے نہیں رہے، انھوں نے صحراء نوردی کی، برسوں تک خاک چھانتے رہے پھر اس کے بعد جامع اموی دمشق میں بیٹھ کر حقیقت کی تلاش میں مراقبے کرتے رہے، بہت مجاہدے کئے، آخر میں جب حقیقت کا سرا ان کو مل گیا تو وہاں سے واپس آئے اور پھر ملاحدہ اور باطنیہ کی تردید میں کتابیں لکھیں، پہلے درس دینا اور لکھنا کچھ اور تھا، اب کچھ اور ہے۔

ہمارے اس دور مادّیت والحاد میں امام غزالیؒ کی اس علوئے ہمت اور حسن طلب کی دو مثالیں ہمارے حلقہ میں ہمارے سامنے گذری ہیں، ایک مولانا سید سلیمان ندویؒ اور دوسرے مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کی، مجھے خوب یاد ہے کہ ایک صاحب نے جو ہائی کورٹ کے جج رہ چکے تھے، انھوں نے تعجب سے کہا کہ مولانا

سید سلیمان صاحب ندویؒ علامہ شبلیؒ کے شاگرد ہو کر مولانا تھانویؒ کے مرید ہو گئے؟

مولانا تھانویؒ کو ان کا مرید ہونا چاہئے تھا اور ندوی حلقہ میں بھی اس پر ''چہ می گوئیاں'' رہیں، لوگوں نے سید صاحب کو خطوط لکھے، خود سید صاحب نے ہمارے سامنے کہا عجیب بات ہے کہ لوگ مجھے بڑا بھی مانتے ہیں اور احمق بھی سمجھتے ہیں، اور مجھے مشورہ بھی دیتے ہیں کہ آپ کو تھانہ بھون نہیں جانا چاہئے تھا، آپ نے ندوہ کی توہین کی اور علامہ شبلیؒ کے نام کو بٹہ لگایا، ان کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد اور بے شمار محققانہ کتابوں کی تصنیف و تالیف کے بعد آپ دیوبند کے ایک عالم کے پاس گئے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کہا کہ آپ ایسے شخص کے درس میں بیٹھتے ہیں جو آپ کے درس میں بھی شریک ہونے کے قابل نہیں، تو انھوں نے جواب دیا "یابنی إنما یجلس الإنسان حیث یجد صلاحه" آدمی وہاں بیٹھتا ہے جہاں دل کا فائدہ نظر آتا ہے۔

کیا ہمیں دل کے علاج کی ضرورت نہیں؟ ہمیں اپنے دل کو حرارت سے بھرنے اور نور یقین سے بھرنے کی ضرورت نہیں؟ یہ مثالیں ہمارے سامنے کی ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ جو ہمارے عہد کے عظیم ترین مصنف تھے، یہ میں مسجد میں بیٹھ کر کہہ رہا ہوں، ان کی تصانیف مقدار کی حیثیت سے بھی کچھ کم نہیں اور تنوع کی حیثیت سے بھی کچھ کم نہیں، اور پھر قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی کچھ کم نہیں، وہ اور مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ دونوں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے پاس پہنچے، کوئی مدرسی اور گروہی عصبیت حائل نہیں ہوئی، کوئی شہرت کا جو بہت بڑا فتنہ ہے، جن کی شہرت سے مستشرقین بھی مرعوب تھے، اور اپنے سوالات کے جوابات ان سے مانگتے تھے، عربوں نے بھی ان کا لوہا مان لیا، وہ تھانہ بھون گئے اور پھر اس طرح اپنے کو ڈال دیا کہ حضرت تھانویؒ کو یہ کہنا پڑا

از سلیماں گیر اخلاص عمل
داں تو ندوی را منزہ از دغل

مجھے کم معلوم ہے کہ کسی شیخ نے اپنے ایک مسترشد کی ایسی مدح کی ہو جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کی ہے، اور ان کو اتنی جلدی خلافت دی کہ ان کے پرانے اصحاب کو تعجب ہوا اور بعض کو ملال بھی ہوا ہوگا، حضرت تھانویؒ کا جب وصال ہوا، اس وقت حضرت مولانا الیاسؒ اور سید صاحبؒ یہیں مقیم تھے، سید صاحبؒ کو اس کا اتنا رنج و ملال ہوا کہ بچوں کی طرح روتے تھے کہ گویا سایۂ پدری اٹھ گیا۔

اسی طرح مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ ہمارے لیے قابل تقلید مثال ہیں، مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادی دونوں گئے تو حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ آپ حضرات کو زیادہ مناسبت مولانا حسین احمد مدنی سے ہے، آپ ان سے بیعت ہو جائیں، ویسے خدمت کو میں حاضر ہوں۔

جہاں تک مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کا تعلق ہے مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ حضرت تھانویؒ سے ان کا تعلق ایسا ہی تھا جیسے ایک ادنیٰ مرید کا ہوتا ہے، اور وہ ان کو اپنا حقیقی شیخ مانتے تھے، پھر مولانا تھانویؒ نے کچھ عرصہ کے بعد اطاعت و انقیاد کا مادہ دیکھ کر ان کو اجازت دے دی۔

بھائیو! یہ دو سبق ہیں، یہ دو پہلو نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہیں۔ مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کی زندگی سے یہ دو سبق لیں کہ ایک تو کمال کا پیدا کرنا، رہے ڈگری والے تو وہ بے ہتھیار کے سپاہی اپنے کو محسوس کرتے ہیں چاہے وہ کسی یونیورسٹی میں صدر شعبہ ہو جائیں یا وائس چانسلر بن جائیں۔

دوسرا سبق یہ لینے کا ہے بھائی سب کچھ کر لیجئے مگر جیسے کسی نے کہا ہے ؎

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

اور ع

قال را بگذار مرد حال شو

یہ حقیقت ہے، یہ آج سمجھ لو جب بھی خوش قسمت ہو، دو برس بعد سمجھ لو جب بھی خوش قسمت ہو، اور مرنے سے پہلے سے اس وقت سمجھو گے تب بھی اچھا ہے لیکن کرنے کا وقت نکل چکا ہوگا، نہ محنت کرسکو گے نہ کہیں آجاسکو گے۔

بھائیو! جیسے پہلے ہمارے عربی مدارس کا رواج تھا، مجھے خوب تاریخ معلوم ہے، عربی مدارس کی کہ مولانا لطف اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا حلقہ درس اس وقت وہ مرکز بنا ہوا تھا، یہاں سے لے کر ایران، ترکستان تک، کہ ذہین وجید الاستعداد طالب علموں کا، حضرت مولانا لطف اللہ کے یہاں جو طالب علم پڑھتا تھا وہ گنج مرادآباد جاکر مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ سے روحانی تعلیم حاصل کرتا تھا، یہاں دماغ کو روشن کرتا تھا تو وہاں دل کو روشن کرتا تھا، دیوبند میں جو طالب علم پڑھتا تھا تو وہ سیدھے گنگوہ چلا جاتا تھا، وہاں جاکر وہ تکمیل کرتا تھا، اب ان کا دور ختم ہوا تو وہ رائے پور جاتا تھا یا پھر تھانہ بھون جاتا تھا۔

مولانا عبدالحیؒ کے درس میں جو لوگ شریک ہوتے تھے وہ سیدھے گنج مرادآباد چلے جاتے تھے، یہ عام بات تھی، میں دعوت پیری مریدی کی نہیں دے رہا ہوں، حالانکہ پیری مریدی عیب نہیں ہے، صاف کہتا ہوں، ہرگز میرے نزدیک عیب نہیں ہے، اگر عیب ہوتا تو مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ الحمدللہ سب روشن خیالوں میں سب سے زیادہ روشن خیال ہیں، میں خود روشن خیال ہوں، روشن خیالوں نے جتنی دنیا دیکھی ہے ان سے زیادہ میں نے دنیا دیکھی ہے، میں اس کے بعد بھی پیری مریدی کا قائل ہوں، اور عامل بھی ہوں، میں شرماتا نہیں ہوں

اور اپنے لیے ضروری سمجھتا ہوں، اس کے باوجود بھی میں آپ کو پیری مریدی کی دعوت نہیں دے رہا ہوں، آپ یہ نہ سمجھیں کہ دلالی کر رہا ہوں، میں کہتا ہوں کہ اپنی روحانی پیاس بجھانے کے فکر کرو، اپنے ایمان ویقین کو ناقص سمجھو اور اپنے کو کامل نہ سمجھو، اگر یہ خلا رہا تو سب سے بڑا خلا رہا..... "قال أبو مليكة أدركت ثلاثين من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم ما منهم أحد إلا كلهم يخاف النفاق على نفسه" امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیقات میں ہے، اس کی خوبی یہ تھی کہ جس نے ان کو چھپایا اور ان کی کتابوں کو مقبولیت بخشی اور اللہ کے نزدیک جو ان کے درجے ہیں وہ اللہ ہی جانتا ہے، انھوں نے اس خلا کو محسوس کیا، اور دونوں اپنے اپنے وقت پر گئے اور انھوں نے بالکل اس کی پرواہ نہیں کی، یہ علامہ سید سلیمان ندویؒ ہیں، اگر یہ کسی یونیورسٹی میں پہنچ جائیں تو اس کے لیے فخر کی بات، وہاں کے وائس چانسلر اور پروفیسر ملنے کے لیے آئیں، اگر یورپ جائیں تو وہاں کے مستشرقین آئیں استفادہ کے لیے، مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ اگر سوچتے کہ میں فلسفہ کے دریا میں تیرا ہوا ہوں اور میں مولوی اشرف علی تھانویؒ بہشتی زیور کے مصنف کے پاس جاؤں یہ نہیں ہوسکتا، یہ سب فروعی باتیں ہیں کہ یہ کون ہے؟ یہ کون ہے؟ اس کی کتنی کتابیں ہیں؟ کتنے درجے کی کتابیں ہیں؟ ہمیں اس سے کچھ مطلب نہیں، ہمیں صرف مطلب ہے ہمارا کام نکلے، اور ہم اس خطرہ سے بچ جائیں جو درپیش ہے، لاکھوں کروڑوں برس کی زندگی وہاں صاف طور پر کہہ دیا گیا "إلا من أتى الله بقلب سليم" وہاں صرف سوغات چاہیے جو قلب سلیم لے کر آئے، قلب سلیم کی تلاش میں وہاں یہ لوگ گئے۔

بس میرے بھائیو میں ختم کرتا ہوں، یہ دو چیزیں میں کوئی تعین نہیں کرتا، میں پیری مریدی کی رہنمائی نہیں کرتا، میں کسی چیز کی تبلیغ نہیں کرتا، میں اس اجمالی بنیادی ضرورت کا احساس دلاتا ہوں کہ ہم کو آپ سب کو زندگی کے ہر دور میں اپنی

تکمیل کی ضرورت ہے، اور روحانیت کی ضرورت ہے، وہ روحانیت ہمارے اندر پیدا ہو، بجائے اس کے ہم تحقیر کریں ایک ملا کے پاس چلے گئے اور ان کے مرید ہوئے، عالم بن جانے کے بعد، کلمہ پڑھنے کے بعد، کیا قرآن وحدیث میں کوئی چیز کم ہے، اور کیا قرآن وحدیث میں اصلاح نفس کے لیے کچھ کم ہدایات ہیں، آپ ان باتوں اور شبہوں میں نہ پڑیں، آپ یہاں جس طرح بھی اپنی اصلاح وتربیت کا جو بھی انتظام ہو جب بھی ہو سکے فراغت کے بعد اس کی طرف توجہ کریں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق دے، حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کے درجات بلند فرمائے، بحیثیت عالم کے بھی اور اس درسگاہ کے فاضل کی حیثیت سے بھی اس پر ہم سالہا سال فخر کریں گے اور بحیثیت مسلمان کے بھی اس کا ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے لیے دعائے مغفرت کریں اور ایصال ثواب کریں، اپنے اپنے طور پر ایک مرتبہ سورہ یٰسین ہی پڑھ کر ایصال ثواب کریں، جب یہ تحفہ ان کے پاس پہنچے گا کہ یہ ہماری درسگاہ کے طالب علموں کی طرف سے ہے، بہرحال ان کو خوشی ہوگی، ان چیزوں کی وہاں پر کچھ قدر ہوگی یا نہیں کیا پتہ بہرحال ان کو خوشی ہوگی، یہ سعادت کی بات ہے اور تعلق کی بات ہے۔

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اور اس ہفتہ میں جانے والے سب مرحومین کی، اور اس مہینہ میں جانے والے سب مرحومین کی اور اس سال میں اور اس صدی میں جانے والے سب مرحومین کی اور سابقین واولین سب کی مغفرت فرمائے، ان سب کے درجے بلند فرمائے، ان کی سیئات سے درگذر فرمائے، اللہ تعالیٰ تمام مؤمنین و مؤمنات کی مغفرت فرمائے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالإِيْمَانِ،
وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ.

☆☆☆☆☆

باب ششم

قرآن فہمی

قرآن مجید سے شغف

قرآن مجید کا قلب وذہن پر کھلنا مومن کے لیے معراج سے کم نہیں، اس کے لیے رضائے الٰہی کا طالب صادق مطالعہ کی سخت ترین گھاٹیوں سے گذرتا ہے، عربی میں کمال پیدا کرتا ہے، اور اس کا ذوق وذائقہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، قرآن مجید کے مفاہیم ومطالب کو سمجھنے کے لیے مطالعہ کا تنوع، توسع حاصل کرتا ہے، اور پھر اس میں تعمق پیدا کرتا ہے، مولانا عبدالباری ندویؒ عربیت میں کمال پیدا کرنے کے ساتھ حکمت وفلسفہ کے مطالعہ میں بھی ڈوبے، اور پھر قرآن مجید کے لیے ایسے یکسو ہوئے کہ کچھ اور لکھنا پڑھنا بھی بند کردیا، معالعہ اسی کے سلسلہ میں کرتے، گفتگو اسی کے تعلق سے کرتے، درس اسی کا دیتے، لکھنؤ میں اپنی قیام گاہ کے قریب کی مسجد میں دیتے، علماء وفضلاء اور دانشور آتے، طلبہ بھی شرکت کرتے، اسی زمانہ کے استفادہ کرنے والوں میں ایک نمایاں نام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمہ کا بھی ہے، انھوں نے آپ کے درس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''مولانا کے درس میں ایسے حکیمانہ اشارے ملتے جن کی شرح میں صفحہ کے صفحہ بلکہ رسالے لکھے جاسکتے ہیں، اس درس کے کچھ معین مضامین وفوائد تو یاد نہیں رہے لیکن اس سے اصولی طور پر بہت فائدہ پہنچا اور قرآن مجید کی عظمت اور اس کے اعجاز کے

یقین میں اضافہ ہوا۔'' (۱)

جب مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ''الندوہ'' کے لیے جس کے وہ ایڈیٹروں میں تھے ''میری محسن کتابیں'' کا عنوان قائم کر کے علمائے عصر کو دعوت دی کہ وہ اس پر لکھیں تو اس وقت چوٹی کے اہل قلم میں ایک مولانا عبدالباری ندوی بھی تھے، بعد میں یہ مجموعۂ مضامین ''مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں'' کے نام سے مولانا محمد عمران خاں ندوی نے مرتب کر کے شائع کیا، جس میں مولانا عبدالباری ندوی کے مضمون سے وہ اقتباس نقل کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے قرآن مجید کے اپنی ذات پر احسانات کو خوب کھول کر بیان کیا ہے، وہیں ان مسلمانوں پر بھی برسے ہیں جو اس سے بے توجہی برت رہے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> ''حال یہ ہے کہ "ذٰلِكَ الْكِتَابُ" کے سوا کوئی کتاب ہی نہیں معلوم ہوتی، دعا فرمایئے کہ جو کچھ بھی زندگی رہ گئی ہے، اسی زندہ کتاب اور اس کے زندہ (حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ) مصنف کے آستانہ پر ختم ہو جائے۔''

آگے کی تفصیل بھی ان ہی کی زبانی سنئے!

''چونکہ یہ عریضہ (۲) آپ (۳) کے لیے ہے، اس لیے اس عجیب کتاب کے بھی عجیب تجربات اس خیال سے آپ کی خدمت میں عرض کر دینے کا جی چاہتا ہے کہ اگر کسی کی توثیق ہو گئی تو میری مزید تشفی کا باعث ہوگی۔

ابتداء میں سب سے زیادہ موحش اس کتاب کا بظاہر بے ربط اسلوب بیان

---

(۱) پرانے چراغ ۲/۱۲۱۔

(۲) مضمون کے بجائے مکتوب لکھا تھا اس لیے عریضہ کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ (م)

(۳) مراد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ہیں، جن کے سوالنامہ کے جواب میں یہ مضمون ہے۔ (م)

رہا، لیکن اب تلاوت کرتا ہوں تو چیز اس کے لفظ لفظ اور حرف حرف کو "کلام اللہ" ثابت کرتی ہے وہ سب سے زیادہ عین یہی اسلوب بیان (اسٹائل) ہے، کسی طرح یہ بات تصور میں نہیں آتی کہ کوئی انسان بھی انسانی دل و دماغ اور بشری نفسیات کے ساتھ اس طرح بہ تکلف دو چار آیات بھی بول سکتا ہے، جس طرح یہ کتاب ابتدا سے انتہا تک بے تکلف ایک فوق البشری انداز بیان میں ناطق ہے، حد یہ ہے کہ لفظی غیر لفظی کوئی ترجمہ خود اسی کتاب کا، جب کسی دوسری زبان میں پڑھتا ہوں تو صاف امتیاز ہونے لگتا ہے کہ ترجمہ کے اندر پھر انسان شریک ہو گیا، تفسیر وغیرہ کا ذکر ہی کیا۔

اپنا حال تو یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ خود کسی طرح میرے ہاتھ میں ایک کتاب رکھ دیتے اور فرماتے کہ یہ "بین الدفتین" جو کچھ ہے لفظ لفظ، حرف حرف میرا کلام ہے، تو بھی میرا شکی اور احتمال آفریں ذہن اس کے کلام اللہ ہونے پر شاید ہی اتنا یقین کر سکتا جتنا اس عجیب و غریب اسلوب بیان کی بنا پر حاصل ہے، مجھ کو تو اس انداز کلام کا نام ہی بجز "کلام اللہ" کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

جو لوگ اس کتاب پر ایمان نہیں رکھتے، کاش ایمان اور عدم ایمان دونوں سے اپنے ذہن کو ایک مرتبہ خالی کر کے، بلا ترجمہ و تفسیر ممکن بے تعصبی کے ساتھ خود اس کتاب کا مطالعہ، کچھ دن جاری رکھ سکیں تو انشاء اللہ ان کی سب بحثیں اور اعتراضات از خود ہی ختم ہو جائیں گے، اگر آدمی اتنی عربی جانتا ہو کہ عربیت کے تحت صحیح معنی سمجھ لیتا ہو تو پھر ایک ہی ترجمہ و تفسیر کی ضرورت رہ جاتی ہے، کہ انسانی فطرت اور انسانی زندگی کے تحت پیش آنے والے واقعات و تجربات اور ان کی مشکلات و مہمات میں اس کی تفسیر تلاش کرے، تو مومن تو مومن غیر مومن کو بھی یہ اذعان حاصل ہو کر رہے گا کہ انسانیت جہاں کہیں اور جس حال میں بھی پائی جاتی ہو اس کی سیدھی راہ وہی راہ

ہے، جس کی طرف یہ کتاب رہنمائی کرتی ہے، ﴿إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾.

غم وغصہ دونوں زیادہ مسلمانوں کے حال پر آتا ہے جو اس زندہ کتاب پر ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں اور پھر زندگی کا راستہ دوسروں سے پوچھتے ہیں، اور ادھر ادھر ڈھونڈتے پھرتے ہیں، ان کو تو صرف اس کی ضرورت تھی کہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں بس اسی کتاب کو بطور ایک زندہ کتاب کے استعمال کرتے۔

کہنے کی بات نہیں لیکن آپ سے کہہ دینے کا جی چاہتا ہے کہ میرا تو یہ حال ہو گیا ہے کہ لغت اور زبان کے اعتبار سے معانی سمجھ لینے کے بعد یا اگر کوئی واقعہ طلب شے ہو تو واقعہ کو سمجھ لینے کے بعد جہاں اور جس مقدار میں اس ''کلام اللہ'' کے ساتھ تفسیر وغیرہ کی صورت میں ''کلام الناس'' کو شریک کیا اسی قدر ہمیشہ نہیں، لیکن زیادہ تر ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ جو روشنی ملی تھی اس کی جگہ پھر تاریکی چھانے لگی، بس ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ﴾ میں اپنا یا پرایا جتنا ہوائی علم مل جاتا ہے شاید اتنا ہی خالص وحی کے علم کا حجاب بن کر اس کے فیضان کو روک دیتا ہے اس لیے میرے نزدیک تو مفسر کے علم وتقویٰ کو معلوم کئے بغیر ہر تفسیر کو پڑھنے لگنا، بہت خطرناک ہے، الا یہ کہ کسی کا علم وتقویٰ کافی محافظ ہو اور آج کل تو ہر شخص مفسر ہے، اور ہر اخبار ورسالہ اس کی تفسیر شائع کرنے کے لیے کھلا ہوا ہے۔''

قرآن مجید کے مطالعہ کے دوران ان پر جو باتیں منکشف ہوئیں ان میں وہ مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی سے متعلق توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے کہ لوگ پورا قرآن سمجھنے سمجھانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں، یقیناً سارا قرآن ساری انسانیت کی ہدایت کے لیے ہے، لیکن ہر انسان کے لیے سارا قرآن اسی

طرح نہیں جس طرح کرۂ ارض کا سارا رزق ساری انسانیت کے لیے ہے، اگر ہر آدمی ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ کے تحت سارے آدمیوں کا کیا دو چار کا حصہ بھی ہوس میں آکر کھا جائے تو اکثر صورتوں میں بدہضمی اور بعض میں ہلاکت یقینی ہے۔ ع

قسمت حق است روزی خواہ نے
ہر یکے را سوئے دیگر راہ نے

جس طرح ہر جسمانی غذا کا ہر مزاج و ماحول کے انسان کے لیے موافق آنا ضروری نہیں وہی حال روحانی غذا کا بھی ہے، بلکہ ارواح کے الوان واقتضاءات، اجسام سے بہت زیادہ کثیر ومتفاوت معلوم ہوتے ہیں، ایک شخص دوسرے شخص کا حصہ کیسے پاسکتا ہے؟

ایک موٹی مثال عرض کرتا ہوں: ﴿إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ﴾ سے لے کر سورہ تغابن کی آخری آیات تک کا ترجمہ تو ہر شخص ہی سمجھ سکتا ہے، لیکن جو شخص ازدواجی زندگی کے تجربات سے سرے سے نہیں گذرا یا جس کو "عَدُوًّا لَّكُمْ" سے سابقہ نہیں پڑا، وہ "فَاحْذَرُوهُمْ" کے پرہیز یا "وَإِنْ تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا" کے علاج کی کیا قدر جان سکتا ہے؟ اسی طرح ﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ کا تحقیق فہم اس شخص کو کیسے نصیب ہوسکتا ہے جو اس فتنۂ اموال واولاد میں پڑا ہی نہ ہو؟

ذہانت یا دوسروں کے تجربہ سے تفسیر بیان کر دینا اور بات ہے، لیکن ذاتی تحقیق تو بہر حال ذاتی تجربہ ہی کا ثمرہ ہوسکتا ہے، اس یافت و تحقیق کی قائم مقامی نہ ذہانت کی کوئی مقدار کر سکتی ہے اور نہ معلومات کا کوئی وسیع سے وسیع سرمایہ۔"

آگے وہ رقم طراز ہیں:

"حاصل معروضات یہ ہے کہ مسلمہ عقائد و اعمال کی جس مقدار کی تکلیف ہے اس حد تک تو سب کو تبلیغ و تفہیم مساوی ہونے کی بھی تکلیف ہے، باقی قرآن کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف الوان و احوال یا مختلف "سبل" اور راہوں کے لوگ اپنی اپنی خاص راہ سے اس زندہ کتاب کے ذریعہ اپنے زندہ رب سے اپنی زندگی کے سارے کاروبار میں زندہ اور شخصی ربط و تعلق پیدا کریں، بغیر اس زندہ ایمان کے نہ عبد و رب میں عبودیت و ربوبیت کا تعلق قائم ہوتا ہے نہ ایمان کی حلاوت ملتی ہے، نہ اس کے اعلیٰ ثمرات پیدا ہوتے ہیں، واللہ أعلم بالحق والصواب۔"(۱)

قرآنی خدمات

مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب حیدرآبادی (کراچی) جو کہ مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے محبوب شاگرد اور مسترشد مجاز بھی ہیں، اپنے ایک مضمون میں مولانا کی قرآن فہمی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص/۴۷-۵۱، مرتبہ مولانا محمد عمران خاں ندوی، ناشر ادارہ احیاء علم و دعوت لکھنؤ

''فلسفہ کے بعد مولانا کو سب سے زیادہ شغف قرآن پاک سے تھا، اور بصیرت قرآنی سے انھیں حظ وافر ملا تھا، جس کا اندازہ مولانا کے ان ارشادات سے ہوگا، وہ فرماتے تھے کہ مجھے ان تفاسیر سے زیادہ دلچسپی نہیں جو لکھنے والوں نے پورے قرآن پاک کی لکھی ہیں، میں زیادہ شوق اور غور سے وہ جزوی تفاسیری رسائل دیکھتا ہوں جن میں بعضی بعضی آیات کی تفسیر لکھی ہو، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر غور فکر کرنے والے پر قرآن کو کوئی مقام ہی کھلتا ہے اور وہی اس کی یافت کا حاصل ہوتا ہے۔''

کراچی کے دوران قیام جب میرا غریب خانہ ہی مولانا کا فرودگاہ تھا، صبح کی چہل قدمی میں مجھ سے فرمانے لگے، دیکھئے! یہ مادی کائنات کتنی محدود ہے، اور انسان اس کے خزائن کی تلاش میں صدیوں سے لگا ہوا ہے، مگر آج بھی اس کی دریافت نئی نئی چیزیں نکال ہی رہی ہے، اور یہ دریافت نامختتم ہی معلوم ہوتی ہے، تو قرآن پاک تو ''معنوی کائنات'' ہے، اس کے غوامض اور اس کے رموز واسرار کا احاطہ انسانی دسترس میں کیسے آسکتا ہے؟ یہ تو ایک بے پایاں سمندر ہے جس کی غوطہ زنی سے کسی کو کوئی گوہر ہاتھ آجائے تو وہی اس کی زیست کا حاصل ہے۔

جو حمائل شریف مولانا کی روزانہ تلاوت میں رہتی تھی، اس پر مولانا نے جابجا اپنے قلم سے اشارات لکھے تھے، خیال تھا کہ فرصت پاکر ان کی تشریح لکھیں گے، مگر بیماری کا سلسلہ اس قدر طول کھینچ گیا اور نقاہت اتنی بڑھی کہ لکھنے کی تاب باقی نہ رہی، مجھے لکھا کہ دو ماہ کی فرصت نکال کر لکھنؤ پہنچوں اور مولانا کا مہمان بن کر اور مولانا کے منشاء ومدعا کو سمجھ کر ان قرآنی نکات کی تشریح اپنے قلم سے لکھوں، مگر افسوس

صد افسوس! کہ میں اس مبارک سفر سے عاجز رہا، پھر مولانا نے ارادہ فرمایا کہ وہ حمائل شریف میرے پاس بھیج دیں گے مگر مجھے اس کا انتظار ہی رہا، جب میں نے اس کی یاددہانی کا عریضہ لکھا تو جواب آیا:

''جس حمائل شریف کا آپ نے ہمارے مولانا دریابادی کے واسطہ سے ذکر کیا ہے وہ سردست جب تک ''کلامیات قرآن'' حق تعالیٰ پورا نہیں فرمادیتے ہیں خود مجھ کو کبھی کبھی اس کو دیکھنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے، ورنہ وہ کیا، میں تو اور بھی خدا جانے کتنی چیزیں جو ناقص و ناتمام پڑی ہیں سب ہی آپ کے حوالے کر دیتا کہ میرے علم و تعلق میں آپ سے بہتر کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جو ماشاء اللہ آپ کی طرح جواں ہمت و جواں قلم ہو، سب تو نہیں شاید بعض چیزیں آپ کے مذاق کی نکل آتیں اور آپ ان سے جو چاہتے کام لے سکتے تھے۔''(۱)

بہر کیف پھر وہ حمائل شریف راقم الحروف تک نہ پہنچ سکی، اللہ کرے محفوظ ہو۔

مولانا کے ہاتھوں دو قرآنی خدمات پھر بھی انجام پا گئیں جن میں سے ایک چھپ کر خوب مقبول ہوئی اور دوسری چھپ نہ سکی، ان کی تفصیل یہ ہے:

۱- نظام صلاح و اصلاح

اس کا پورا عنوان ہے: ''قرآن کا دو آیاتی نظام صلاح و اصلاح۔''(۲)

---

(۱) مکتوب مؤرخہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۶۸ء

(۲) یہ دراصل مولانا کا ایک مسلسل قسط وار شائع شدہ مضمون ہے، راقم الحروف کو بہت پسند آیا تو مولانا کی تحریک کے بغیر میں نے اس کو مرتب کر کے اس کے عنوان اور کہیں کہیں حواشی لکھ کر مولانا کی خدمت میں بھیج دیا تھا کہ پسند خاطر ہو تو یہ کتابی صورت میں مجلس علمی (کراچی) سے چھپ جائے، مولانا نے اس خدمت کو بیحد سراہا اور دعائیں دیں جو میرے لیے ذریعہ آخرت ہیں۔ (غلام محمدؒ)

یہ دراصل سورۂ ''والعصر'' کی تفسیر ہے اور پورے بسط کے ساتھ اس کے مضامین کی تشریح بھی، یہ تذکیر بھی ہے، اور اس میں ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے اجزاء سے ایک مکمل نظام صلاح واصلاح مرتب کر دیا گیا ہے تاکہ مسلمان اس سے عملی فائدہ اٹھا سکیں، یہ مولانا کی قرآنی بصیرت ان کی اصلاح ملت کے سوز و درد اور ان کی حکیمانہ نظر کا جامع مرقع ہے، اس کے متعلق مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ نے صحیح فرمایا کہ مولانا نے اپنی اس گرانقدر پیشکش سے ''تمام علماء اور خادمانِ دین کو عبرت آموز سبق دیا۔'' نیز لکھا کہ ''مولانا قرآنی حقائق کے ذوق میں بے مثل تھے۔''(۱)

یہ کتاب مجلس علمی (کراچی) سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی اور عام کتابی سائز کے ۲۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲- کلامیاتِ قرآن

تجدید کلامیات کی طرح کلامیات قرآن بھی مولانا کی بڑی گرانقدر تصنیف ہوتی، بلکہ اس کا درجہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا، کیا بہ اعتبار اہمیت کے اور کیا بہ اعتبار افادیت کے، مگر قضا وقدر کا فیصلہ نہیں تھا کہ یہ تصنیف مولانا کے ہاتھوں مکمل ہوتی، ناتمام رہ گئی، اس کا ایک سبب غالباً ''مذہب وسائنس'' کی تکمیل کا انہماک رہا، ۶ راگست ۱۹۶۹ء کے کرم نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''ان کی (یعنی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ کی) رائے یہ ہے کہ اس حصہ یعنی ''مذہب وسائنس'' کو ''کلامیاتِ قرآن'' کی تکمیل تک روکا نہ جائے۔''

---

(۱) ماہنامہ ''بینات'' کراچی (اپریل ۱۹۶۴ء)

اب یہ بھی معلوم نہیں کہ ''کلامیاتِ قرآن'' کے عنوان سے کتنے صفحات تحریر فرمائے گئے اور وہ کہیں محفوظ بھی ہیں یا نہیں۔'' (۱)

درس قرآن کا انداز

مولانا محمد مبین ندوی کوپاگنجی شیخ الحدیث مدرسہ مصباح العلوم کوپاگنج (مئو) جو کہ مولانا عبدالباری ندوی کے شاگردوں میں اور خصوصی مستفیدین میں رہے ہیں، مولانا کی قرآن فہمی اور اس سلسلہ میں ان کے رسوخ وتعمق سے متعلق اپنے تاثرات ان کے درس کے حوالہ سے یوں بیان کرتے ہیں (۲):

''حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی نوراللہ مرقدہ (سابق صدر شعبہ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) کو ہندوپاک کے علمی اور دینی حلقوں میں فلسفی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، بلاشبہ مولانا کا مضمون فلسفہ تھا، اس میں انھوں نے اپنی انفرادیت اور عظمت کا نقش قائم کر رکھا تھا، مولانا مرحوم اپنی فطری ذہانت اور ذکاوت اور خداداد صلاحیت اور دینی بصیرت سے فلسفہ کی حقیقت کو پاگئے اور اس کی روح کو سمجھنے میں کامیاب ہوگئے کہ فلسفہ اور اسلام میں کوئی ٹکراؤ نہیں، جو لوگ ٹکراؤ کے قائل ہیں وہ گویا اس بات کے قائل ہیں کہ پانی کے جہاز اور ریل گاڑی میں ٹکر ہوگئی۔

مولانا نے فلسفہ کے ذریعہ دین کی بہت سی خدمات انجام دی ہیں جن کا اقرار حضرت مولانا تھانویؒ نے بھی کیا ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے کھل کر داد دی ہے اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جو ریاست حیدرآباد میں امور شریعہ کے صدر تھے یہ کہہ کر کے کہ ''فلسفہ مولانا کے ہاتھ پر ایمان لایا'' حقیقت شناسی اور ظرف نگاری کا ثبوت دیا ہے، مگر مولانا میں ایک خوبی ایسی تھی جو فلسفہ کے نیچے دب گئی وہ یہ کہ مولانا

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ (۲۵ جولائی ۱۹۸۹ء) مضمون ''مولانا عبدالباری ندوی ایک عظیم فلسفی'' از ڈاکٹر غلام محمد صاحبؒ

(۲) بہ شکریہ برادر محترم مولانا جمال احمد ندوی کوپاگنجی استاذ حدیث مدرسہ مصباح العلوم کوپاگنج۔

کو قرآن سے عشق تھا اور ان کا قرآن کے تعلق سے مطالعہ بڑا گہرا تھا، وہ قرآن کی تفسیر القرآن بالقرآن کے قائل تھے، اس کا علم انھیں لوگوں کو زیادہ ہوسکا جن کو مولانا سے قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنے کا موقع ملا۔

مولانا اپنی مجلس میں زیادہ تر بات حضرت مولانا تھانویؒ کی کرتے، مگر جب قرآن کی کسی آیت کی تفسیر فرماتے بچے تلے الفاظ کے ساتھ، تو روح ایمانی جھوم جھوم اٹھتی، مولانا کا جو تعلق قرآن سے تھا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یونیورسٹی میں نصاب تعلیم کی ترتیب دینے کا فیصلہ ہوا تو سوال پیدا ہوا کہ فلسفۂ اسلام میں کونسی کتاب رکھی جائے، مولانا نے کہا کہ اس سلسلہ میں ہندوستان کے بڑے بڑے اداروں میں جانے کا اتفاق ہوا اور گفتگو ہوئی کہ فلسفہ اسلام میں کونسی کتاب رکھی جائے تو مولانا نے ہنستے ہوئے کہا کہ کسی نے شمس بازغہ کہا اور کسی نے صدرا کہا، بالآخر فلسفہ اسلام کے لیے قرآن کو تجویز کیا گیا، اور مولانا مرحوم کی مجلس میں پہلے بھی بتایا جاچکا ہے کہ زیادہ تر باتیں مولانا تھانویؒ کی ہوتی تھیں، اور کہتے تھے کہ بچو! اگر میں کسی مریض کو دیکھوں اور اچھے ڈاکٹر کا پتہ نہ بتاؤں تو یہ میری بخیلی ہوگی کہ نہیں؟ لوگ میرے بارے میں کہتے ہیں کہ تھانوی کی باتوں کے علاوہ تو یہ کچھ جانتے ہی نہیں، مگر جب مولانا قرآن اور قرآن کی کسی آیت کے متعلق گفتگو فرماتے تو سننے والے جھوم اٹھتے، اور مولانا نے ایک دفعہ بڑے اعتماد کے لہجے میں کہا کہ سورۂ فاتحہ کا ترجمہ مجھ سے پڑھ لو، اللہ تعالیٰ نے خاص طریقہ سے مجھ کو سورۂ فاتحہ کا علم دیا ہے، ہمارے ساتھیوں نے بیک زبان کہا کہ ہم لوگ پڑھیں گے، وقت مقررہ پر جب حاضر ہوئے اور مولانا کے اردگرد بیٹھ گئے، تھوڑی دیر خاموشی کے بعد مولانا نے کہا کہ بتاؤ ''الٰہ'' کے کیا معنی ہیں؟ ساتھیوں میں سے کسی ایک نے کہا کہ جو ایک ہو، مولانا نے کہا کہ عبدالباری بھی تو ایک ہی ہے، کسی نے کہا کہ جس کی پوجا کی جائے، مولانا نے کہا کہ بت کی بھی تو پوجا کی جاتی ہے، پھر

ہم لوگوں نے کہا کہ حضرت آپ ہی بتائیں تو مولانا نے فرمایا کہ جو نفع وضرر کا مالک ہو وہ الٰہ ہے، مولانا کی یہ بات سنتے ہی دل میں قرآن کی محبت پیدا ہوگئی، اس کے بعد قرأت شروع ہوئی، پڑھنے والے نے پڑھا: أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم. اس کے بعد تھوڑی دیر تک مجلس میں خاموشی رہی، مولانا نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہر جائز کام کے ''بسم اللہ'' سے شروع کرنے کی بیشمار فضیلتیں احادیث میں وارد ہوئیں ہیں، مگر قرآن عظیم کی تلاوت کرنے کے وقت صرف ''بسم اللہ'' پر اکتفا نہیں کیا جائے گا بلکہ باتفاق امت ''بسم اللہ'' سے پہلے تعوذ پڑھنا سنت ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ.﴾ (جب تم قرآن کی تلاوت کرو تو اللہ کی پناہ ڈھونڈو شیطان مردود کے شر سے) اب غور وفکر کا مقام ہے کہ قرآن حکیم کی تلاوت کرتے وقت بسم اللہ سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا باتفاق امت مسنون ہے، ایسا کیو؟ اس میں کیا راز اور کونسی حکمت پوشیدہ ہے؟ اگر تھوڑی دیر تلاوت کرنے والا اس پر غور وتدبر سے کام لے تو بلاشبہ اس کے سامنے انسانی فطرت کے حقائق ومعارف اور رموز وحکمت کا کھلا ہوا ایک دفتر ہوگا، جس کے ذریعہ ایک ہی جست میں اس ناسوتی دنیا کو پار کر کے عالم لاہوت میں پہنچ جائے گا، جہاں بڑے بڑے فلاسفروں، سائنس دانوں اور دانشوروں کا طائر فکر مدت العمر پرواز نہ کرسکا، بلاشبہ اعوذ باللہ اور بسم اللہ میں ایسے گہرے حقائق چھپے ہوئے ہیں جن پر غور وفکر کرنے والا جب مطلع ہوتا ہے تو اس کی فطرت چونک پڑتی ہے اور صحیح کام کرنے لگتی ہے، پھر زمین وآسمان کی تخلیق سے خلاق عالم اور مصنوعات سے صانع اور آثار سے مؤثر کی طرف دفعتہً سیر ہوجاتی ہے، ہر انسان کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس کا سابقہ پڑتا رہتا ہے، جب اس کو کوئی اہم اور عظیم الشان کام درپیش ہوتا ہے، ایسے موقع پر انسان کی فطرت خارجی مؤثرات سے

آزاد رہتی ہے تو بلا اختیار خالق فطرت کی طرف رجوع کرتی ہے، جیسا کہ قرآن نے اس کا نقشہ کھینچا ہے: ﴿حَتّٰىٓ إِذَا كُنتُمْ فِى الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَآءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوٓا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ.﴾ (۱) (چنانچہ جب تم کشتی پر سوار ہوتے ہو اور وہ کشتیاں لوگوں کو ہوائے موافق کے ذریعہ لے کر چلتی ہیں اور وہ لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں، ناگہاں ایک تھپیڑا ہوا کا آتا ہے اور ان کے اوپر ہر طرف سے موجیں اٹھتی چلی آتی ہیں اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ بس ہم گھر گئے تو اس وقت اللہ کو اس کے ساتھ اعتقاد کو بالکل خالص کر کے پکارتے ہیں)، ایسے نازک موقعوں پر اسباب سے قطع نظر کر کے ساری توجہ مسبب الاسباب کی طرف کر دینا عین فطرت انسانی کا مقتضا ہے، منقول ہے کہ کسی نے حضرت جعفر صادق کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ پروردگار عالم کی بابت کچھ ارشاد فرمایئے، آپ نے کہا کہ تم کیا کرتے ہو، اس نے کہا کہ بحری تجارت میرا پیشہ ہے، آپ نے فرمایا اچھا اس کا تم کچھ حال بیان کرو، اس نے کہا کہ ایک بار میری کشتی عین دریا میں ٹوٹ گئی اور میں ایک تختہ پر بہا جا رہا تھا، آپ نے فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ اس وقت تمہارے دل میں خشوع و شکستگی کی کیفیت پیدا ہوئی تھی؟ اس نے کہا کہ بیشک آپ نے فرمایا کہ جس کی طرف تمہارے تضرع اور شکستگی نے رخ کیا تھا، بس وہی تو پروردگار عالم ہے۔

ایک بار پھر اس بات کو ذہن نشین کر لیں کہ بسم اللہ سے پہلے تعوذ باتفاق امت کیوں مسنون ہے؟ اس میں کیا حکمت اور راز ہے؟ اگر فلسفہ سے پوچھا جائے تو صاف جواب دے گا کہ یہ فطرتِ سلیم کا عین مقتضا ہے، کیونکہ انسان فطرتاً جلب خیر سے پہلے دفع مضرت کی خواہش کرتا ہے، نفع سے پہلے اس کے دل کی گہرائی سے یہ

---

(۱) سورۂ یونس/۲۲

آواز نکلتی ہے کہ خدایا کوئی نقصان نہ ہو، پھر اسی سے متصل یہ آواز نکلتی ہے کہ اے خدا دوا کا یہ جام میرے لیے صحت وعافیت کا ذریعہ بن جائے، اسی طریقہ سے جب کسی مریض کو آپریشن روم میں لے جایا جاتا ہے تو اس کے دل کی گہرائی سے جو سب سے پہلے آواز نکلتی ہے وہ یہی ہوتی ہے کہ خدایا کوئی تکلیف نہ ہو، بعدہٗ اس کے دل کی گہرائی سے دوسری بات نکلتی ہے: اے خدایا اپنی رحمت سے تو اس آپریشن کو کامیاب بنادے۔ ایک سپہ سالار اپنی جانباز فوج کو پورے کیل کانٹے سے لیس کر کے میدان میں اتارتا ہے تو سب سے پہلے اس کی فطرت سلیم سے جو آواز نکلتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ خدایا میری شکست نہ ہو، دشمن ہم پر غلبہ نہ پائے، اور پھر اسی کے ساتھ دوسری آواز نکلتی ہے کہ خدایا ہم کو تو ایسی طاقت اور قوت عطا فرما جس سے ہم اپنے دشمن کو زیر کر دیں۔

مذکور الصدر سطور سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ انسان کے سامنے جب کوئی عظیم الشان کام ہوتا ہے یا وہ کسی مصیبت میں گھر جاتا ہے ایسے وقت میں انسان کی فطرت سلیم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتی ہے، خطرات ومصیبت کے وقت فطرت سلیم سے جو آواز نکلتی ہے، اللہ رب العزت نے ''اعوذ باللہ'' اور ''بسم اللہ'' میں سمو دیا ہے، بلکہ صحیح معنی میں انسان کے دل کی انھیں دونوں دھڑکنوں کا ترجمہ اعوذ باللہ اور بسم اللہ کی شکل میں قرآن حکیم میں موجود ہے، جس کی نظیر سے کتب سماویہ یکسر خالی ہیں، جب بھی انسان اس پر غور کرے گا اور اپنی فطرت کی صدا کو سمجھنے کی کوشش کرے گا تو بالیقین خدا تک پہنچ جائے گا، اس کو کسی خارجی دلیل کی ضرورت قطعاً نہ ہوگی، اکبر الہ آبادی نے کتنی صحیح ترجمانی کی ہے ؎

دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان لیا میں نے تیری پہچان یہی ہے

☆☆☆☆☆

باب ہفتم

حکمت وفلسفہ

حکمت وفلسفہ یہ وہ عنوان ہے جو مولانا عبدالباری ندوی کی شہرت وناموری کا سب سے اہم ابتدائی ذریعہ تھا، ان کی قدیم وجدید فلسفہ پر جو گہری نظر تھی اور جدید فلسفہ کے نظریات کو انھوں نے جس طرح سمجھا اور پرکھا تھا اور اس سلسلہ میں ان کی اصل مراجع تک جو بلاواسطہ رسائی ہوئی تھی، اس نے ان کی حقیقت کو سمجھانے میں بڑا تعاون دیا اور اس کے کھوکھلے پن کو ان پر ظاہر کیا، اور یہی نہیں بلکہ قرآن حکیم کے معانی ومطالب اور مفاہیم وحقائق کو سمجھنے میں انھوں نے اس سے پوری مدد لی، اور اس کا اظہار انھوں نے اپنے اسلوب میں اس طرح کیا ہے کہ:

> ''ایک شخص کا دماغ خالق ومخلوق کے ربط کو سمجھنے کے لیے سالہاسال عقلی آوارہ گردی میں گرفتار رہا، فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کی راہوں کی خاک چھانتا پھرا، پھر اس کے بعد اس کو ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ سے اگر کچھ سمجھ میں آتا ہے، اور اس کی پیاس بجھتی ہے اور ''بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ'' کے ایک اشارے سے خالق کی اولیت وآخریت، ظاہریت وباطنیت اور مخلوقات کے ساتھ اس کے ربط وتعلق کی گرہ کھل جاتی ہے تو جس دماغ میں یہ سوال ہی نہیں، اس کو کیا جواب ملے گا، یا اس کی کیا قدر ہوگی؟ کیا اس کی کوئی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک فلسفی دماغ کی ہدایت کے لیے قرآن میں

کوئی راہ نہ ہو؟!'' (۱)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو اپنے ایک مکتوب میں جدید فلسفہ کے اپنے مطالعہ اور اس کے اثرات سے متعلق لکھتے ہیں:

''حافظہ کی زیادہ تلاشی لینے سے صرف ایک چھوٹی سی کتاب یاد آئی جو کوئی چوتھائی صدی قبل پڑھی تھی، برکلے کی ''پرنسپلس آف ہیومن نالج'' جس کا نام لینا بھی غالباً آپ پسند نہ فرمائیں، اسی زمانہ میں ''مبادی علم انسانی'' کے نام سے اس کا ترجمہ بھی کیا تھا، اس کا اولین اثر تو میری روایتی ارتیابیت کی توثیق تھی، مگر پھر اسی نے حقیقت علم کے سوال کی طرف متوجہ کر کے حقیقی علم و یقین ایمان کا راستہ صاف کیا، بلکہ اور آگے چل کر اسی کتاب کے نظریات و دلائل نے علم و یقین کے اصل سرچشمہ قرآن کے بعض حقائق و غوامض کی فہم و یافت میں مدد دی۔'' (۲)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے ایک خطاب میں ان کے علم و فہم اور قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے برملا کہا کہ:

''ان کے علم کی دھاک بیٹھ گئی، انھوں نے بڑے مفید کام انجام دیئے، اور ان کی ایک معرکۃ الآراء کتاب ''فہم انسانی'' کے نام سے شائع ہوئی، اور برکلے کا ترجمہ کیا، یہ سب فلسفہ کی کتابوں کے کامیاب ترین تراجم کا نمونہ ہیں، ایک طرف تحریر کی شگفتگی اور قلم کی روانی جوان کو مولانا شبلی سے ورثہ میں ملی تھی، اور ندوہ کی دَین تھی، پھر اودھ کا شگفتہ ادبی ذوق اور ذہانت اور اس کے

---

(۱) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص/۵۱، مرتبہ مولانا محمد عمران خاں ندوی، ناشر ادارہ احیاء علم و دعوت لکھنؤ

(۲) ایضاً ص/۴۷تا۵۱

ساتھ علم کی سنجیدگی اور مطالعہ کی گہرائی، ان سب نے مل کر ان کے تراجم کو نمونہ کی حیثیت دیدی۔''(۱)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ان کے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں دور تدریس کے چند باکمال طلباء کا یوں ذکر کرتے ہیں:

''وہ وہاں (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں) مقبول ہوئے، اور اس شعبہ (فلسفہ) کے صدر بھی ہوگئے، اور اس وقت کے لائق ترین فلسفہ کے طالب علم بہت چمکے اور کامیاب ہوئے، جیسے ڈاکٹر میر ولی الدین جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر رضی الدین۔''(۲)

مولانا محمد منصور نعمانی ندوی بھوپالی(۳) لکھتے ہیں:

''یہ وہ عبقری شخصیت تھی جس کے قلم سے نصف صدی سے زائد علوم عقلیہ وفلسفہ وسائنس فیضیاب ہوتے رہے، اور انھوں نے سائنس دانوں وفلسفوں کو ''سجدۂ سہو'' کرا کے ہی دم لیا۔''(۴)

نسلِ نو پر احسانِ عظیم

حکمت وفلسفہ کو موضوع بنا کر مولانا عبدالباری ندوی نے نئی نسل پر جو عظیم احسان کیا، اس میں وہ یگانۂ روزگار نظر آتے ہیں، الحاد، دہریت اور ارتداد کے راستہ پر پڑ رہی نسل کا دین وایمان پر اعتماد جس طرح انھوں نے بحال کرایا یہ وہ غیر معمولی کارنامہ ہے جو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، خود ایک موقع پر انھوں نے فرمایا کہ:

''فلسفہ کے طلباء ایمانیات تک سے دور جا پڑے تھے، مگر الحمد للہ

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ (۱۰ر فروری ۱۹۷۶ء)

(۲) ایضاً

(۳) فرزند مولانا محمد نعمان خاں بھوپالی۔

(۴) تعمیر حیات لکھنؤ (۱۰ر فروری ۱۹۷۶ء)

جب میں نے کلاس لینی شروع کی تو نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم طلباء میں بھی اسلام کے بنیادی اصولوں پر گہرا یقین پیدا ہو گیا تھا۔" (۱)

فلسفۂ جدیدہ کے بڑے نقاد اور فلسفہ اسلامی کے عظیم ترجمان ڈاکٹر محمد اقبال کا انہیں جو اعتماد حاصل ہوا وہ ایک بڑی سند سے کم نہیں، مولانا اسحاق جلیس ندوی اپنے اداریہ میں لکھتے ہیں:

"دوسرا واقعہ یہ بتایا کہ "میں نے فلسفہ جدیدہ کو قرآن مجید کی روشنی میں پڑھانے کا جب اپنا ارادہ ظاہر کیا تو اس وقت کے جامعہ عثمانیہ کے چانسلر سر اکبر حیدری نے (جو ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم تھے) اس شرط پر منظور کیا کہ میں اس سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال کو مطمئن کر کے ان کا تصدیقی خط لاؤں، یونیورسٹی نے اپنے مصارف پر خاص اس مقصد کے لیے ڈاکٹر اقبالؒ کی خدمت میں لاہور بھیجا، میں نے جب اقبال مرحوم کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا تو وہ بہت متاثر اور مطمئن ہوئے، اور انھوں نے اپنے تصدیقی خط میں لکھا کہ "یہ شخص قرآن مجید کی روشنی میں فلسفہ جدید کی تعلیم بخوبی دے سکتا ہے۔" (۲)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا یہ تاثر بڑی اہمیت کا حامل ہے جو انھوں نے اپنی محسن کتابوں کے تعلق سے ظاہر کیا ہے:

"مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب "مذہب و عقلیات" پر نظر پڑی جس کو ذوق

---

(۱) روایت مولانا اسحاق جلیس ندویؒ (مدیر تعمیر حیات، لکھنؤ متوفی ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء)

(۲) تعمیر حیات لکھنؤ (۱۰ فروری ۱۹۷۶ء)

وذہن نے پورے طور پر اپنا لیا، اس رسالہ سے عقل ونقل کے حدود اور تجربہ وعلم انسانی کی ناری وناپائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا جو مطالعہ میں بہت کام آیا، اس کے بعد قدیم وجدید فلسفہ اور اس کی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا پڑھا، مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا، بلکہ جس قدر پڑھا، ﴿إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾ اور ﴿كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ﴾ کی تفسیر وتوضیح ہوتی رہی۔'' (۱)

مولانا عبدالباری ندویؒ سابق پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے متعلق ان کے مشہور معاصر فلسفی وماہر نفسیات مولانا عبدالماجد دریابادیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''مشترک موضوع ہمارے ان کے مغربی فلسفہ اور عقلی علوم تھے، نوجوانی کے جوش میں زبان پر اور قلم سے ہر وقت یہی بحثیں جاری رہتی تھیں، ایک مردم شناس مبصر نے اسی وقت یہ فقرہ کہہ ڈالا تھا کہ ''ماجد صاحب کا مطالعہ جتنا بھی ہو اور فلسفہ کی کتابیں جتنی بھی انھوں نے پڑھ ڈالی ہوں لیکن فلسفی کہلانے کے مستحق باری صاحب ہی ہیں۔''

یہ بات میرے دل میں اتر گئی اور میں تو ''چار پائے برو کتابے چند'' عمر بھر بدستور بنا رہا، البتہ وہ فلسفی سے ترقی کر کے متکلم اور صوفی بن گئے، لیکن عقلیت جیسے ان کی سرشت میں تھی، باوجود اپنے تقشف وتصلب کے وہ محض تسبیح وسجادہ کے صوفی ہو کر نہیں رہے بلکہ بقدر ضرورت برابر مغربی فلسفہ اور اس سے بھی بڑھ کر

(۱) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص/۱۸۱، مرتبہ مولانا محمد عمران خاں ندوی، ناشر ادارہ احیاء علم ودعوت لکھنؤ

ماڈرن سائنس خصوصاً طبیعیات سے ربط اور مطالعہ قائم رکھا۔" (۱)

اور بقول مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب کراچویؒ:

اس سے پہلے خود ندویوں کے سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بھی سیرۃ النبیؐ جلد سوم مشتمل بر دلائل و معجزات کی تصنیف میں "دلائل و معجزات اور فلسفہ جدید" کا باب مولانا عبدالباری ندویؒ سے لکھوا کر شامل فرمایا تھا اور مولانا کے متعلق یہ تحریر فرمایا کہ:

"ہمارے زمرۂ علماء میں فلسفہ جدید کا واقف کار مولانا عبدالباری سے بڑھ کر کوئی نہیں۔" (۲)

اور اسی مضمون کو پڑھ کر مشہور نقاد مولانا ماہر القادری مدیر ماہنامہ "فاران" کراچی نے اپنا تأثر بیان کیا ہے جسے ان کی وفات کے بعد اپنے رسالہ "فاران" میں سپرد قلم کیا کہ "سیرۃ النبیؐ" کی تیسری جلد میں "فلسفۂ جدیدہ اور معجزات" کے عنوان پر سو صفحے مولانا عبدالباری ندوی کے لکھے ہوئے ہیں، سیرۃ النبیؐ کے اس حصے کے ذریعہ راقم الحروف ان سے متعارف ہوا، اور فلسفہ کے ساتھ ان کی دینی وابستگی کا اچھا نقش میرے لوح دل و دماغ پر ثبت ہو گیا۔" (۳)

عظیم فلسفی

ڈاکٹر غلام محمد صاحب (کراچی) تلمیذ ارشد مولانا عبدالباری ندوی و خلیفہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ و مصنف "تذکرہ سلیمان" اپنے مضمون (۴)

---

(۱) مختصر تعارف "مذہب اور سائنس" مصنفہ مولانا عبدالباری ندویؒ۔

(۲) سیرۃ النبیؐ جلد سوم پہلا ایڈیشن۔

(۳) یادِ رفتگاں ۱۶/۲۔

(۴) یہ وقیع و گرانقدر اور فاضلانہ و محققانہ مضمون ندوۃ العلماء کے ترجمان "تعمیر حیات" (اشاعت ۲۵ رمئی تا ۱۵ رجولائی ۱۹۸۹ء) میں چار قسطوں میں شائع ہوا تھا۔

''مولانا عبدالباری ندوی ایک عظیم فلسفی''، میں تحریر فرماتے ہیں:

مشہور عالم ومحدث مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے مولانا عبدالباری کی رحلت پر جوش وہوش کی متلاطم کیفیت میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''جدید فلسفہ اور جدید الٰہیات پر ان کی نظر اور ہمہ گیری حیرت انگیز تھی، ان کے افکار کو جس جستجو اور عرق ریزی سے یکجا کر کے ان سے استنباط کرتے تھے، ان ہی کا حصہ تھا، سائنس اور مذہب جیسی نافع وعظیم تصنیف سے تمام فلاسفہ اور ملاحدہ کے سر پر جوتے لگائے اور حجت پوری کردی۔''(۱)

مولانا پیدا ہی فلسفی ہوئے تھے، انھیں طالب علمی کے دوران خصوصی دلچسپی فلسفہ وکلام ہی سے رہی اور خوش قسمتی سے علامہ شبلیؒ جیسا ماہر معقولات استاذ انھیں میسر آیا جو خود بھی جوہر قابل کی تلاش میں رہتا، اور جوہر کی تراش اور جلا بخشی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا، مولانا عبدالباریؒ اپنی سرگذشت میں تحریر فرماتے ہیں:

''علامہ ہی کے زمانہ سے مصر کے رسائل واخبار آنے لگے تھے، ان میں ایک رسالہ ''المقتطف'' نام کا ہوتا جو کسی عیسائی کے زیر ادارت تھا، اس میں جدید فلسفہ اور سائنس کی چیزیں زیادہ ہوتیں، مجھ کو یوں بھی منقولات سے بجائے معقولات سے زیادہ مناسبت تھی، ساتھ ہی قدیم معقولات کی شروح در شروح، حواشی در حواشی کے قیل وقال سے الجھن بھی بہت ہوتی تھی، خدا بھلا کرے علامہ

(۱) بصائر وعبر، ماہنامہ بینات (کراچی) بابتہ اپریل ۱۹۷۶ء۔

ممدوح کا کہ انھوں نے اپنے زمانہ میں نصاب میں جو تبدیلیاں کیں ان میں سے بعض ایسی تھیں جنھوں نے میری دلچسپی قدیم معقولات سے بھی کچھ بڑھادی مثلاً شرح حکمۃ العین، شرح حکمۃ الاشراق جیسی کتابوں نے بالخصوص شرح حکمۃ الاشراق پڑھانے والے استاذ مولانا شیر علی حیدرآبادی تھے جنھوں نے اپنے خاص طرز تعلیم سے میری رغبت اور بڑھادی۔'' (۱)

اپنے مضمون ''سیرۃ السید'' (۲) میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''ندوہ میں نہ صرف (علامہ سید سلیمان ندوی سے) طالب علمانہ معیت و رفاقت رہی بلکہ جب استاد مقرر ہوئے تو شاگردی کی دولت بھی ملی، استاذ مرحوم و مغفور علامہ نعمانیؒ کی مجالس میں سالہا سال ان کے پیچھے صف نعال میں شریک رہا، مگر سید صاحب کے علم و فضل کا اتنا قائل تھا کہ اپنے شکوک و شبہات ان ہی کے سامنے زیادہ پیش کرتا، ایک مرتبہ جبر و قدر کے متعلق اچھی طرح یاد ہے کہ ان ہی کی تفہیم و توجیہ سے خوب تشفی ہوگئی۔'' (۳)

ان عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا کی دلچسپی معقولات ہی سے تھی البتہ طالب علمی ہی کے زمانہ میں ان میں یہ تڑپ بھی پیدا ہوئی کہ انگریزی زبان سیکھ کر جدید فلسفہ، نفسیات اور کلام کا راست مطالعہ کر کے اس میں دستگاہ حاصل کی جائے، ان کے اسی جذبہ کی پوری ہمت افزائی علامہ شبلیؒ نے کی اور وہ اپنے

---

(۱) مذہب اور سائنس، ص/۱۰۔

(۲) سلیمان نمبر ماہنامہ معارف بابتہ مئی ۱۹۵۵ء

(۳) ایضاً۔

خداداد شاکلہ اور اس کے ساتھ سعی ومحنت کے ذریعہ فلسفۂ اسلام اور فلسفۂ غرب کے تقابلی ماہر اور کامیاب استاذ بن گئے، اور جامعہ عثمانیہ کے شعبہ فلسفہ میں انھیں خاص مقام حاصل رہا۔

میرے ہم زلف جناب حمید اللہ خاں ایم.اے. (فلسفہ) جامعہ عثمانیہ (مقیم لندن) مولانا عبدالباری ندویؒ کے شاگرد رہے ہیں وہ اپنے ایک محبت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''فلسفہ کے چھ پرچوں میں ایک پرچہ اسلامی فلسفہ بھی تھا جس کے استاذ پروفیسر عبدالباری ندویؒ تھے، مولانا کے نام سے پہلے سے شناسائی تو تھی لیکن پہلی مرتبہ انھیں اسلامی فلسفہ کے کلاس ہی میں دیکھا، مولانا کی شان وجاہت یہ تھی کہ سرخ وسفید رنگ، کتابی چہرہ، موزوں قامت، چھریرا لیکن نہایت متوازن جامہ زیب بدن، اس پر لباس میں شیروانی اور تنگ مہری کا پائجامہ، شیروانی نہایت نفیس کھادی کی، اور اس پر کپڑے کی کشتی نما ٹوپی استعمال فرماتے تھے۔

اسلامی فلسفہ کے کلاس میں پہلے دن مولانا نے ہر طالب علم سے یکے بعد دیگرے سوال کیا کہ اس نے فلسفہ کو بطور اختیاری مضمون کیوں منتخب کیا؟ جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ ''میں نے کسی رسالہ میں ایک مضمون ''شعور ولاشعور'' پر پڑھا تھا، بنابریں مجھے فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہوئی، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مولانا میرے جواب سے مطمئن ہوئے کیونکہ میرے ساتھیوں میں سے کوئی جواب نہ دے سکا تھا۔

فلسفہ اسلام میں مولانا کا طرز تعلیم انفرادی حیثیت رکھتا تھا، کلاس میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے طلبہ کی حاضری لیتے اور رجسٹر حاضری بند کرنے کے بعد متعلقہ موضوع پر تقریر شروع فرماتے، انداز بہت سادہ سلیس لیکن بے حد رواں ہوتا، موضوع کے ہر ہر جزو کی اس طرح وضاحت فرماتے کہ ہم ہمہ تن گوش بنے رہتے، اور لیکچر اس طرح توجہ اور دلچسپی سے سنتے تھے کہ دوران لیکچر نوٹس لینا ممکن نہ ہوتا، لیکن مولانا ہماری تشنگی اور طلب کو محسوس فرما کر لیکچر ختم ہونے کے بعد گھنٹہ ختم ہونے سے پہلے کچھ نوٹس لکھوا دیتے، لیکن یہ نوٹس ان کے تفصیلی لیکچر کا مخلص ہوتے، تو ان نوٹس سے پوری تشفی نہ ہوتی تاہم امتحانی نقطہ نظر سے یہ نوٹس بہت اہم ہوتے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مولانا اپنے مضمون فلسفہ اسلام پر مہارت تامہ رکھتے تھے، لیکن ان کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہ صرف اپنے مضمون میں استنادی حیثیت رکھتے تھے بلکہ مغربی فلسفہ پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان دونوں فلسفوں کا موازنہ و محاکمہ جس طرح مولانا فرماتے، یہ بات کہیں اور نظر نہ آتی، اسلامی فلسفہ کے کلاس میں مولانا بیک وقت ہمارے سامنے دونوں (فلسفوں) کی خوبیوں اور کوتاہیوں کو نمایاں کر کے دکھاتے۔

برکلے کی ردّ مادیت پر تصانیف کو مولانا نے بکمال خوبی اردو میں منتقل کیا تھا، لیکن مولانا کی ژرف بینی اور حقیقت شناسی ان کے

معرکۃ الآراء مقالہ ''مذہب اور عقلیات'' میں ظاہر ہوتی ہے، یہ مقالہ مولانا کے تحلیلی انداز نظر کا شاہکار ہے، جس میں آپ نے مذہب اور فلسفہ کے حدود کی صحیح صحیح نشاندہی کی ہے، یعنی عقل محض چراغ راہ ہے، منزل نہیں، وہ راستہ کی صرف رہنمائی کرسکتی ہے، منزل رسی کے لیے مذہب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔''

آفتاب آمد دلیل آفتاب

مولانا کے پاس کوئی ڈگری نہ تھی مگر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدر الصدور مملکت آصفیہ کی کوشش سے انھیں ستمبر ۱۹۲۲ء میں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ فلسفہ میں نہ صرف پروفیسر کی حیثیت سے لیا گیا بلکہ صدر شعبہ فلسفہ چونکہ تعلیمی رخصت پر بیرون ملک گئے ہوئے تھے اس لیے ان کی قائم مقامی بھی مولانا کے سپرد کردی گئی، اور اس طرح دو سال گذر گئے، اب مسئلہ مولانا کے استقلال کا آیا، اصولاً مولانا مستقل پروفیسر نہیں بنائے جاسکتے تھے کیونکہ ان کے پاس فلسفہ کی کوئی سند نہ تھی مگر مولانا کے معاملہ کو استثنائی حیثیت دیتے ہوئے اعلیٰ حضرت سلطان العلوم میر عثمان علی خاں مرحوم کی خدمت میں خصوصی عرضداشت پیش کی گئی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے لکھا کہ:

''ان کی سند یہ ہے کہ فلسفہ نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے، جس کا اندازہ سرکار خود رسالہ ''مذہب وعقلیات'' کی چند سطروں کے ملاحظہ سے فرما سکتے ہیں۔''(۱)

---

(۱) مذہب اور سائنس، زیر عنوان ''سرگذشت''، ص/۲۳۔

چنانچہ گوہر شناس شاہ نے اسی ''مذہب وعقلیات'' کی بناء پر مولانا کے بحیثیت پروفیسر مستقل کئے جانے کی منظوری عطا فرمادی، یہ مولانا کے فلسفیانہ کمال کی شہادت نفسی تھی کہ ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب
گرد لیلش باز خواہی رو متاب

چنانچہ جب ترقی کا مسئلہ آیا اور اس میں یوروپی ڈگری کی شرط تھی تو اس وقت بھی مولانا کے فلسفیانہ تراجم کو ڈگری کا بدل تسلیم کرلیا گیا۔

تراجم اور ان کا امتیاز

مولانا نے فلسفہ، نفسیات اور اخلاق کی بعض اہم انگریزی تصانیف کے جو تراجم کئے، فلسفے کے ڈاکٹروں میں بھی اس کام کی نظیر شاید ہی ملے، ذیل میں ان تراجم کی فہرست ملاحظہ ہو:

کتاب کا اصل نام	مصنف	ترجمہ کا نام
Manual of Ethics	Markenzis J. S.	علم الاخلاق
Principles of Human Knowledge	Barcly	مبادی علم انسانی
Pragmatism	James Williom	فلسفہ نتائج
Human Under Standing	Nume David	فہم انسانی
An Introduction to Methophyosics	Bergson Newre	مقدمہ مابعد الطبیعیات
Discourses on Methodsand	Decarte Rene	طریق اور تفکرات
Metaphybical Meditation Ethics	Deho J.B.Jh. Tafts	اخلاقیات
Manual of Psychology	Stoot	حدیقہ نفسیات

یوں تو جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ سے مختلف علوم وفنون کی ۵۳۰ کتابوں (۱) کے ترجمے شائع ہوئے اور ان سے اردو ادب میں قیمتی اضافہ ہوا، اور اس کا علمی وزن بھی بڑھا مگر مولانا عبدالباری ندویؒ کے تراجم کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان پر ترجمہ کا گمان ہی نہیں ہوتا۔

مولانا بڑے سے بڑے فلسفی اور ماہر نفسیات کے خزانہ خیال اور طرز ادا پر اس طرح قبضہ جمالیتے ہیں اور انگریزی محاورات کو اردو محاورات میں اس خوبی سے منتقل فرمالیتے ہیں کہ ان کے تراجم مصنفین کی اصل (Original) تصنیفات ہی محسوس ہوتے ہیں، ایک مرتبہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے راقم الحروف سے فرمایا کہ ''آپ کے ہاں کا کوئی ترجمہ ہمارے مولانا عبدالباری کے تراجم کی ٹکر کا نہیں، ترجمہ کی خوبی تو یہی ہے کہ وہ ترجمہ محسوس نہ ہو۔

فلسفیانہ محاکمات

تراجم کے علاوہ مولانا کے فلسفیانہ محاکمات ان کے تبحر فن کی بڑی شہادت ہیں، جو ان کے مقالات: ''دلائل ومعجزات اور عقلیات جدیدہ''، ''مذہب وعقلیات'' اور تصنیف ''مذہب اور سائنس'' میں اور تحریر کردہ مقدمات میں جابجا ملتی ہیں، اس کی ایک مثال

---

(۱) پچھلے سال (یعنی اکتوبر ۱۹۸۰ء) کل ہند مجلس تعمیر ملت حیدرآباد دکن کی دعوت پر راقم الحروف کا جانا حیدرآباد دکن ہوا تو جامعہ عثمانیہ کی لائبریری سے مولانا عبدالباری کے تراجم کی یہ فہرست محب مکرم احمد علی صاحب کے ذریعہ حاصل کی گئی تھی۔

''فہم انسانی'' (ہیومن انڈراسٹینڈنگ، از: ڈیوڈ ہیوم) کے مقدمہ سے یہاں پیش کی جاتی ہے۔

مقدمہ کے مباحث کو سمیٹتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''آخر میں اصل نتیجہ پر پھر ایک نگاہ ڈال لوں، جدید فلسفہ پہلے ہی قدم پر جس ''سوچ'' میں پڑ گیا تھا کہ میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں، اس کے بعد عقل اور فلسفہ، منطق اور استدلال کی طاقت سے یہ بالکل باہر ہو گیا کہ وہ پھر اس سوچ سے ایک قدم بھی باہر نکال سکے، لاک نے بہت زور لگایا کہ کم از کم ''صفات اولیہ'' کو باہر لا سکے مگر تم نے دیکھا کہ خود لاک ہی کی دلیل سے برکلے نے ان کو پھر ''صفات ثانیہ'' کی طرح اندر ہی پہنچا دیا، اور آگے چل کر ساری تاریخ فلسفہ میں ایک ''گردش پرکار'' ہو کر رہ گئی، ہر قدم ہر پھر کر اسی سوچ کے دائرہ میں پڑتا رہا۔

برکلے کی بے پناہ منطق نے اسی دائرہ کے اندر بند کر کے مادہ کا نام لینے تک کی گنجائش نہ چھوڑی اور ہیوم نے بعینہٖ اسی منطق سے جو دوسرا نتیجہ نکل سکتا تھا نکال دیا، کہ اگر مادہ نہیں تو روح بھی نہیں، اس کے بعد رہ کیا گیا؟ وہی خالی سوچ یا مجرد احساسات و خیالات جو نہ کسی باہر کے مادی جوہر کے آفریدہ ہیں اور نہ کسی اندر کے روحانی جوہر میں قائم، گویا یوں ہی آپ ہی آپ ٹنگے ہیں، ''سوچتا ہوں'' کا ''میں'' بھی غائب اور نرا سوچ ہی سوچ فلسفہ کے ہاتھ میں رہ گیا۔

نیز اس سوچ کے مختلف احساسات خیالات اور ارادات وغیرہ

میں باہم جو ایک ربط اور وابستگی نظر آتی تھی، جس کو علت و معلول کہا جاتا تھا یعنی ایک دوسرے پر لازماً موقوف اور اس کا محتاج ہونا، ہیوم کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس علیت و معلولیت، لزوم و احتیاج کے واقعہ کو بھی ایک طرح کے ''سوچ'' یعنی ذہنی عادت ہی میں تبدیل کر دیا۔

اس طرح ڈیکارٹ سے صرف ہیوم تک ہی آتے آتے فلسفیانہ علم و یقین کے پاس نہ مادہ رہا نہ روح، نہ جسم نہ نفس، نہ میں نہ تو، نہ انا نہ غیری، نہ علت نہ معلول، نہ خاصیت نہ لزوم نہ وجوب، نہ اندر نہ باہر، لے دے کر صرف شعور یا احوال شعور، خیالات اور محض خیالات جو نہ کسی شے کے ہیں اور نہ کسی شخص کے، یعنی وہی نرا سوچ اب اس سے بڑھ کر انسانی عقل کی کمزوری اور کور چشمی کا تماشا کیا دیکھتے کہ دیکھنے کے لیے جتنا زیادہ زور لگاتے ہیں اتنا ہی زیادہ اندھے ہوتے جاتے ہیں۔

شاید اسی طرح کی عقل آزمائی کے بعد کچھ ہشیار ''دیوانے'' بن جاتے ہیں۔(۱)

آزمودم عقل دور اندیش را
بعد ازاں دیوانہ کردم خویش را

صوفیانہ پہلو

مولانا عبدالباری ندوی نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو ان کے گھر میں تصوف کی تجلیات تھیں، مولانا کے والد مولانا عبدالخالقؒ

(۱) فہم انسانی، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ص/۳۳-۳۴۔

مولانا محمد نعیم فرنگی محلی نوراللہ مرقدہٗ کے مرید وخلیفہ تھے، جنھوں نے مولانا کی دینی تعلیم کے ساتھ ان کے اخلاقی وروحانی پہلو پر توجہ رکھی، مولانا کو ابتداء ہی سے عقلیات وفلسفہ سے زیادہ لگاؤ رہا، مگر طبعی مزاج دنیا سے بے رغبتی ہی کا تھا، جو آخرت طلبی اور زہدوورع کی بنیاد ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے تعلق سے جب مولانا کا قیام حیدرآباد میں ہوا تو مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی رفاقت میں مولانا کو مولانا محمد حسین چشتی نوراللہ مرقدہٗ کی روحانی صحبتیں میسر آئیں، اور حضرت شیخ سے فیضیاب رہے، اپنے مضمون ''اسباق زندگی'' میں حضرت شیخ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''(مولانا محمد حسین) کی وجودی توحید کی تعبیر وتفہیم ایک طرف عقلیت وفلسفیت کے مارے ہوؤں کے حق میں ان کو لاالہ الا اللہ تک پہنچانے کے لیے بڑا کامیاب راستہ تھا، دوسری طرف وحدۃ الوجود کی تمام تعلیمات سے حلول واتحاد یا خالق ومخلوق کی نسبت کے جو نتائج وخطرات پیدا ہوتے ہیں، ان کی بڑی شدومد سے نفی فرماتے اور خالق ومخلوق کی غیریت پر پورا زور دیتے تھے، خالص کمال یہ تھا کہ اپنی اس وجودیت کی توجیہ وتائید میں آیات واحادیث سے بہت کام لیتے تھے، تاہم تھا یہ دراصل ایک فلسفہ ہی مگر مولانا کا یہ سراپا حال بلکہ مقام بن گیا تھا..... نشہ کی تیزی و سرشاری تھی جس کے فیض سے کوئی بڑا محروم ہی اتنا محروم ہوتا ہوگا جو کچھ نہ کچھ ایمان کے ذوق وحلاوت کا اثر لے کر مولانا کی

مجلس سے نہ اٹھتا ہو، ورنہ مولانا کے نظری فلسفہ کی حد تک بقول مولانا گیلانی کے مستثنیات کے سوا باقی ''بزاخفش'' ہی رہتے، راقم کا شمار گو مستثنیات ہی میں تھا، تاہم مولانا کے قدموں میں مجھ کو بھی سب سے بڑی دولت یہی ملی، پہلے پہل لا الہ الا اللہ کی ایمانی حقیقت کا انکشاف ہوا، اور اس کی ایمانی حلاوت سے بقدر ظرف لذت شناس ہوا، أعلیٰ اللّٰہ مقامہ۔''

اس اعتراف کے باوجود مولانا کی روحانی تشنگی باقی تھی، اور چونکہ خود بحر فلسفہ کے شناور تھے، اس لیے فلسفیانہ تصوف، قلب کو تسکین سے لبریز نہ کرسکا، چنانچہ اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''وجودیت کا تصوف کے نام سے نظری فلسفہ ''لا الہ الا اللہ'' کے روپ میں بھی فلسفہ ہی نظر آتا رہا، بلکہ عقل وفکر کی راہ میں، جس راہ کی نشاندہی کرتی رہی وہ خالص ایمانی تصدیق یا ''صدیقیت'' ہی کی تھی، اور خوب تحقیق ہوگیا کہ عالم شہادت میں رہتے ہوئے عالم غیب کے متعلق جب خود رسول کو ''آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ'' سے چارہ نہیں تو مابعد الطبیعیات غیوب یا حقائق کے باب میں فلسفیانہ یا عقلی گدوں کی حقیقت لال بھجکڑوں کے تفلسف سے زیادہ ہو ہی کیا سکتی ہے، اس لیے سچ یہ ہے کہ مجھ کو تو عقل و فلسفہ کی بیچارگی ہی نے یہ بتایا کہ ''محمد رسول اللہ'' کی یافت کے بغیر ''لا الہ الا اللہ'' کی صحیح ومعتبر یافت بھی ناممکن ہے، اللہ پر ایمان صرف وہی معتبر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے

ہو، کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا تک رسول اللہ کے رسول اللہ ہونے اور جاننے پر موقوف ہے۔''

اس کے بعد خالص اتباع سنت والی نگاہ نے جو تلاش شیخ شروع کی تو وہ ہستیاں یعنی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نگاہ میں سما گئیں، چنانچہ اول الذکر بزرگ کی وساطت سے ثانی الذکر بزرگ کی بارگاہ تک رسائی میسر آئی، یہ جون ۱۹۲۸ء کی بات ہے(۱) شاہ تھانویؒ کو پا کر کامل علمی روحانی اور ذوقی مناسبت ملی، مولانا نے خود کو اشرفی دَر کی ''خاک'' بنا دیا، اور پھر ''درجات'' بھی بہت بلند ہوئے۔ ع

''خاک او گشتم و چندیں درجاتم داوند''

اہل نظر نے تصدیق کی کہ:

''وہ عالم تھے، عارف تھے، صوفی باصفا تھے، سراپا اخلاص تھے، ورع وتقویٰ کا پیکر تھے، عصر حاضر کے علمائے ربانیین کے ممتاز فرد تھے۔''(۲)

ربوبیت کا فیضان

حکیم الامت شاہ تھانویؒ کی تربیت، توجہ اور کیمیا اثر نگاہ نے مولانا کو ایک زاہد، عابد، قانع، متوکل اور فانی کامل سالک مجذوب تو بنایا ہی مگر یہ اشرفی خوان فیض کی عطائے عام تھی، مولانا کی انفرادیت ایک اور جہت سے قائم ہوئی، ان پر ذات

---

(۱) اس کی دلچسپ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، حکیم الامت نقوش وتاثرات، از مولانا عبدالماجد دریابادی، ص/ ۲۱۔

(۲) مولانا محمد یوسف بنوری، ماہنامہ بینات کراچی بابتہ اپریل ۱۹۷۶ء۔

حق کا خاص فضل یہ ہوا کہ اسمائے الٰہیہ میں سے اسم ''رب'' کی تجلی کے وہ مورد بن گئے، ''ربوبیت'' مولانا پر منکشف ہوگئی، میں نے اپنے اس احساس کو مولانا کی خدمت میں پیش کیا تو وہ مسرور نظر آئے، اس لیے یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے، اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ وہ سالکین طریق کو ہر مرحلہ حیات میں باری تعالیٰ کی ربوبیت ہی پر نظر رکھنے کی تاکید فرماتے تھے، اور اسی کو حیات کے ہر زہر کا تریاق بتلاتے تھے، تنہا راقم احقر کے نام بیسوں مکتوبات میں مولانا نے اس بات کو دہرایا ہے حتی کہ جو سند خلافت عطا فرمائی (جو ان کا استثنائی معاملہ تھا) اس میں بھی آخری جملے یہ تحریر فرمائے ہیں:

''سالک کے لیے اس سے زیادہ آسان راستہ نہ تجربہ میں آیا نہ سمجھ میں کہ دنیا اور دین کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں ربوبیت کی کارفرمائی کا مشاہدہ کرتا رہے۔''(۱)

معاشیات

مولانا گو ماہر معاشیات نہیں لیکن ایک ماہر فلسفی ہونے کی وجہ سے ان کی نگاہ نے یہاں بھی ایسے نکتے پیدا کیے ہیں کہ اہل فن ان کو پڑھ کر وجد میں آجائیں، مثلاً ''مال کے بجائے مآل'' کی بغلی سرخی لگا کر مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''خلاصہ یہ کہ معاشیات جس ''علم المال'' کا نام ہے، آپ نے دیکھا کہ اس مال کی طلب و تحصیل کی ترغیب و تحسین کے بجائے

(۱) مضمون ''مولانا عبدالباری ندوی ایک عظیم فلسفی'' از ڈاکٹر غلام محمد صاحب مطبوعہ تعمیر حیات ۲۵ رجون ۱۹۸۹ء

اسلام کی کتاب کا اصل زور اس کے مفاسد اور خرابیوں کی اصلاح پر، اور ترغیب و تحسین مال کے مقابلہ میں کم وبیش ہر جگہ مآل یا آخرت کی طلب و تحصیل پر ہے، اس کے بالکل برعکس عہد حاضر کی معاشی تعلیمات اور دعوتوں کا ماحصل انسان کو خدا اور آخرت سے توڑ کر تمام تر بندۂ شکم بنانا ہے۔" (۱)

اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"علم المال کی دو بڑی بحثوں ۱- مال کا کسب وحصول اور ۲- اس کا استعمال وانفاق، اس میں "جدید معاشیات" کا سارا زور کسب پر ہے جبکہ "اسلامی معاشیات" کہنا چاہئے کہ تمام تر انفاقی معیشت کا نام ہے۔" (۲)

"کسبی معیشت" اور "انفاقی معیشت" کے مفہوم ومنشا کو پھر خوب واضح فرمایا اور بتلایا ہے کہ "انفاقی معیشت" ہی فلاح دارین کی ضامن ہے، اس ضمن میں حضرت تھانویؒ کی تلقینات سے خوب شہادتیں پیش کی ہیں۔" (۳)

تعلیم وتبلیغ

اس میں خود مولانا کے عجیب نکات ملتے ہیں، مثلاً:

"تعلیم جدید کا رقاص (پنڈلم) اپنے بے آغاز و بے انجام تصور

---

(۱) تجدید معاشیات ص/۹۶

(۲) ایضاً ص/۱۰۷

(۳) بحوالہ سابق مضمون "مولانا عبدالباری ندوی ایک عظیم فلسفی" از ڈاکٹر غلام محمد صاحب مطبوعہ "تعمیر حیات" لکھنؤ (۲۵ر جون تا ۱۰ر جولائی ۱۹۸۹ء)

کی رو سے قدرتاً صرف نفسانی، حیوانی زندگی کی لذت ومسرت اور جاہ ومال کے مابین ہی رقص کرنے پر مجبور ہے۔''(۱)

اسی کی حماقت سامانی کو آگے اس طرح واضح فرمایا ہے:

''انسان کی الٰہی یا روحانی فطرت خیر مطلق، بقائے دوام اور نامحدودیت کی طالب ہے.....لیکن کائنات کی ساخت ایسی واقع ہوئی ہے کہ یہاں کی ہر شے محدود وفانی، اور ہر چیز کے ساتھ شر توأم ہے جو خود اس بات کی فطری دلیل ہے کہ انسان کی یہ زندگی کسی اور زندگی کی طالب ہے جہاں.....جو یہ چاہے وہ ہو۔''(۲)

''جب مطلوب قلیل ومحدود اور طلب کثیر ونامحدود ہو تو اہل طلب میں رقابت ومخاصمت ناگزیر ہے.....اس راستہ پر چل کر بالآخر اگر ساری زمین قومی، بین الاقوامی کارزار کا میدان بن گئی تو تأسف جتنا بھی ہو لیکن تعجب کی کیا بات ہے۔''(۳)

☆☆☆☆☆

(۱) تجدید تعلیم وتبلیغ ص/۶

(۲) ایضا ص/۱۰

(۳) ملاحظہ ہو تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر جولائی ۱۹۸۹ء

باب ہشتم

اوصاف وخصوصیات

تواضع وللّٰہیت

یہ صفت درحقیقت مولانا عبدالباری ندویؒ پر اسی وقت یہ چیز آشکارا ہوگئی تھی جب وہ نگرام میں ایک عارف معلم مولانا ادریس نگرامی کی خدمت میں تعلیم وتربیت کے لیے کچھ وقت کے لیے بھیج دیئے گئے تھے، خود ان کے والد حکیم عبدالخالق صاحب حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کے خلفاء میں تھے جن کی توجہات باطنیہ اور اخلاص الگ کام کررہا تھا، پھر ندوہ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ اور حیدرآباد کے قیام میں مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ جیسے علم ومعرفت کے حامل رفقاء ملے، حیدرآباد میں ایک قوی النسبت شیخ مولانا محمد حسین صاحب کی توجہات الگ حاصل کیں، بیعت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ہوئی جن کی شفقتیں ان کو حاصل ہوئیں، تربیت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے لی، اور رنگ بھی ان ہی کا چڑھا، ان کے ہی مجاز بیعت وارشاد ہوئے، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ کی صحبت میں بھی کچھ وقت گذارا، اور دعوتی وتبلیغی سفر بھی ساتھ کیا، ان سامعات بابرکات کا ان پر گہرا اثر مرتب ہوا، اور وہ اخلاص واخلاق کے پیکر بن گئے، جس کا اعتراف ان کے بڑوں نے بھی کیا، برابر والوں نے کیا اور چھوٹوں نے ان کی عظمت جانی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ان کا رسالہ ''مذہب وعقلیات'' دیکھ کر ہی کہہ دیا تھا کہ ''یہ شخص عارف معلوم ہوتا ہے'' (۱) اور بعد میں ان کو اپنی تربیت میں رکھ کر اور ان کا ایمانی واخلاقی کردار دیکھ کر خلافت سے بھی سرفراز کردیا تھا۔

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ (۱۰ر فروری ۱۹۷۶ء) ص/۵۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ جو صرف ایک بڑے عالم محقق مصنف ہی نہیں ایک صاحب حال بزرگ اور صاحب نسبت شیخ بھی تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالباری صاحب کی حالت دن بہ دن بہت زیادہ قابل رشک بنتی جارہی ہے، میں تو ان میں ہر دن ارتقاء کی کیفیت پارہا ہوں، وہ بڑی روح اور بڑے نفس کے آدمی ہیں۔''

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کہتے ہیں:

''ہمارے اس دور مادیت والحاد میں امام غزالیؒ کی علوئے ہمت اور حسن طلب کی دو مثالیں ہمارے حلقہ میں ہمارے سامنے گذری ہیں، ایک مولانا سید سلیمان ندویؒ اور دوسرے مولانا عبدالباری ندویؒ۔''(۱)

مدیر ''تعمیر حیات'' لکھنؤ مولانا اسحاق جلیس ندویؒ لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالباری ندویؒ کے بلند علمی مقام کے بعد ان کی زندگی کا نظم وضبط، اصول پسندی، معاملات کی صفائی اور دینداری ایسی مثالی چیزیں تھیں جن کی نظیر کم ملتی ہے،.....اپنے علمی کمال، روشن دماغی اور خوشحالی کے باوجود خلوص وللّٰہیت کی دولت اور محبت و معرفت الٰہی کی نعمت کے حصول کے لیے تمام عمر کوشاں رہے، ان کے اس جذبہ نے انھیں حضرت تھانویؒ تک طالبعلمانہ انداز میں پہنچایا۔''(۲)

مولانا ماہر القادری مدیر ''فاران'' کراچی لکھتے ہیں:

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ (۱۰ر فروری ۱۹۷۶ء) ص/۵۔

(۲) ایضاً۔

''مولانا مرحوم نے فلسفہ سے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اسلام کی صداقت ثابت کرنے کے لیے جو سعی کی ہے اس کا اجر انھیں آخرت میں ملے گا! ان کی علمی شخصیت بلند پایہ تھی، اور سیرت وکردار صالحیت کی روشن مثال!''

آگے لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کے چہرہ سے، آنکھوں سے، اور جبین ورخسار کی سلوٹوں سے ایسا لگتا تھا کہ شب بیدار ہیں، اور وظائف واوراد سے خاص شغف رکھتے ہیں! دینداری ان کی گھٹی میں پڑی تھی، فلسفہ کے ساتھ خانقاہی ذوق، آب وآتش کا اجتماع تھا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات اور تعلیمات کو حرز جاں بنائے ہوئے تھے۔''(۱)

مولانا منصور نعمانی ندویؒ ان کی مجموعۂ کمالات و جامع صفات شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالباری ندوی کا خاص موضوع فلسفہ وعلوم عقلیہ تھا، انھوں نے اس موضوع پر اس انداز سے لکھا ہے کہ فلسفہ جیسے خشک موضوع کو باغ وبہار بنادیا ہے، ان کا اسلوب منفرد، ان کا شعور تربیت یافتہ ان کا دماغ متجسس، ان کا ذہن پاکیزہ، شگفتہ ادبی ذوق، وسیع علم ومشاہدہ، سادگی وجوش نے ان کی تحریر میں غیر معمولی کشش جاذبیت قوت تاثیر پیدا کردی ہے، فلاسفہ کی خشک مزاجی، علماء کی تمکنت، صوفیاء کی خموشی مشہور ہے، مولانا عبدالباری ان تینوں خوبیوں سے مالامال تھے، ان میں فلسفی کا

---

(۱) ''فاران'' کراچی (مئی ۱۹۷۶ء)

وقار، عالم کا جلال اور صوفی کا سکوت تھا، لیکن حد کے اندر، گفتگو کیجئے تو یہ نامور فلسفی شگفتہ مزاج، بذلہ سنج نظر آتا ہے، گفتگو میں شوخی کی چاشنی، طنز لطیف کی جھلکی، ادبی چٹخارہ، تصوف کے نکات بیساختہ بیان کر جاتے ؎

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

کے مصداق لیکن اس ناموری وشہرت کے بعد بھی سادگی، خاکساری وفروتنی کا مجسمہ تھے، سچ پوچھئے تو ان کی سادگی میں ایک جلال تھا، خاکساری میں ایک وقار، فروتنی میں ایک دبدبہ تھا۔"(۱)

ادبی ذوق

مولانا عبدالباری ندویؒ اعلیٰ درجہ کا ادبی ذوق رکھتے تھے، یہ ذوق انہیں اپنے استاد علامہ شبلی نعمانیؒ سے ملا تھا، انھوں نے ان پر محنت کی اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے وسائل فراہم کیے، اور ماہر فن اساتذہ کے پاس مزید قابلیت حاصل کرنے کے لیے بھیجا، وظیفہ بھی مقرر کیا، تاکہ یکسوئی سے علم حاصل کرسکیں، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

"ندوہ میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالسلام وغیرہ کے زمانہ میں تھے، گو ان سے بہت نیچے مولانا شبلی کے حاضر باشوں میں تھے، ان سے بہت مستفید ہوئے۔"(۲)

آگے لکھتے ہیں:

"لکھتے خوب ہیں، فکر وفہم حضرت تھانویؒ سے لی ہے، اور انداز تحریر مولانا شبلی سے، تعلیمات تھانوی کو بہ سلسلہ تجدید دین چار جلدوں

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ (۱۰ر فروری ۱۹۷۶ء) ص/۱۳۔ (۲) معاصرین۔

میں لکھ کر خوب مقبول بنا دیا ہے، اور اب اخیر زمانہ میں سائنسدانوں کی زبان سے خدا پرستی کا پیام خوب پھیلایا ہے۔"(۱)

لیکن یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ان کا انداز تحریر ہمیشہ یکساں نہیں رہا، مولانا دریابادی کا اس پر نقد بھی ملاحظہ ہو:

"میں اپنی تحریروں میں ان کا اکثر ذکر "ایک تھانوی الفکر اور شبلی القلم" کے عنوان سے کرتا ہوں، اپنی جوانی میں ایک رسالہ "مذہب وعقلیات" پر بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر بہت خوب لکھا تھا، پھر اس کے بعد سے جیسے لکھنا بھول ہی بیٹھے تھے۔"(۲)

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ان کے اس وصف کا اعتراف حسرت کے انداز میں کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے رنگ کا مولانا عبدالباری صاحب پر ایسا غلبہ ہوا کہ مولانا (جن کی طبیعت میں ہمیشہ سے کسی چیز کو پورے طور پر قبول کرنے اور ماسوا کے نفی کی صلاحیت تھی) کے علمی خیالات اور طرز تحریر تک پر پڑا، وہ دبستان شبلی کے ایک کامیاب وممتاز ادیب وصاحب قلم تھے، تحریر میں پختگی و شگفتگی، استدلال وعقلیت کا رکھ رکھاؤ اور زبان وادب کی چاشنی، جملوں کی برجستگی، دونوں پہلو بہ پہلو ہوتے، اور یہی مولانا شبلی کی تربیت کا فیض تھا، ان کا رسالہ "مذہب وعقلیات" اور ان کا مضمون "معجزات"(۳) پر جو سیرت النبیؐ کے پانچویں حصہ میں شامل ہے، اس کا نمونہ ہے، لیکن اب ان کو اپنے اس

---

(۱) معاصرین۔ (۲) ایضاً۔

(۳) یہ مضمون اب مستقل رسالہ کی شکل میں شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔

قدیم طرز تحریر میں تلبیس یا تدلیس کا (اور یہ الفاظ خود ان ہی کے ہیں) شبہ ہونے لگا، اور انھوں نے مولانا تھانوی کے طرز کی تقلید شروع کردی، اگر ''چھوٹا منھ بڑی بات'' نہ سمجھی جائے تو بڑے ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ اس میں محبت کو دخل زیادہ تھا، عقل وزمانہ کے تقاضوں کی رعایت کو کم، اگر وہ ان حقائق کو بھی جو ان کو مولانا تھانوی کی صحبت یا ان کی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوئے تھے، دبستان شبلی ہی کی زبان میں ادا کرتے تو اس جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے جس کے لیے وہ کتابیں لکھتے تھے زیادہ مفید ہوتا، اور نوجوانوں کا وہ طبقہ اور ملک کا دانشور حلقہ حقیقت دین سے زیادہ آشنا اور قریب ہوتا۔''(۱)

اندازِ تربیت

مولانا عبدالباری صاحب دینی امور میں خصوصاً ان چیزوں میں جن کا تعلق ضروری احکام سے ہوتا، عقائد وافکار سے ہوتا، یا اسلامی وملی شعائر سے ہوتا، تو وہ اس میں شدت سے گرفت فرماتے، اور کسی قسم کی رورعایت روا نہ رکھتے اور نہ ماننے کی صورت میں اس سے علاقہ ختم کرلیتے، چاہے وہ قریبی عزیز حتی کہ بیٹوں میں ہی کوئی کیوں نہ ہوتا، صاحبزادگان میں بھی ایک کے چہرہ پر داڑھی آجانے کے باوجود داڑھی نہیں تھی، ان سے کہہ دیا: ''میرے گھر میں قدم نہ رکھنا، مجھے اپنی صورت نہ دکھانا''، ایسے ہی ایک دوسرے معاملہ میں ایک دوسرے صاحبزادے پر کچھ پابندیاں عائد کردی تھیں، وہ ہر ایک کو عظیم دینی شان کے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے، ایک صاحبزادے جنھوں نے فرائض میں کوتاہی نہیں کی لیکن بعض دوسری مشغولیات باغات وغیرہ کی

(۱) پرانے چراغ ۲/۱۲۳۔

درستگی ونگرانی میں زیادہ وقت دینے لگے، گووہ ان سے خوش تھے مگر پھر بھی خالص دینی کاموں میں مشغولیت اختیار نہ کرنے کی وجہ سے مطمئن نہ ہو پارہے تھے، ان کی اس مشغولیت کے زمانے میں کوئی ان کو دریافت کرتا تو ظریفانہ انداز سے فرمادیا کرتے کہ وہ تو باغی ہوگیا ہے، بہرحال اولاد کی تعلیم وتربیت میں تمام تر امکانی صورتیں اختیار کرنے کی کوشش کی، حافظ احمد الباری صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت اقدس والد صاحب کی برکت سے بیسویں صدی کے اکابر علماء اور اہل اللہ کی خدمت میں متعدد بار حاضری اور قیام کی سعادت حاصل ہوتی رہی، تاہم اولاد کے سلسلہ میں صرف اللہ ہی کے لیے محبت کرنے اور صرف اللہ ہی کے لیے عداوت کرنے کا جذبہ حضرت والد ماجد کے اندر پایا، دوسری جگہ کم پایا، اپنی اولاد کو دین سے وابستہ کرنے کے لیے جتنی امکانی صورتیں تھیں وہ سب اختیار فرمائیں، ابھی راقم السطور کی عمر چھ سال کی تھی اور برادران کی عمر آٹھ اور دس سال کے اندر، ہم سب بھائیوں کو گھر سے بہت دور حضرت مولانا ابرار الحق صاحب مدظلہ جنھوں نے اسی وقت مدرسہ اشرف المدارس کی بنیاد ڈالی تھی، کی خدمت میں ڈال دیا، بدقسمتی کہ ہم میں سے کوئی ان کی خواہش کے مطابق ان کی ڈالی ہوئی راہوں پر نہ چل سکا، پھر حضرت اقدس شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز کی خدمت میں ڈال دیا، افسوس کہ حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کی بے پایاں شفقت کے باوجود حضرت اقدس والد ماجد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی آرزوؤں کو پورا نہ کرسکے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو

بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا، اگر ہم میں کا کوئی بھائی نماز میں
مسجد نہ حاضر ہوتا تو اس کا کھانا بند کر دیتے، دور سے آنے والے
اعزہ اگر نماز کے پابند نہ ہوتے تو انھیں گھر میں قیام وطعام کی
اجازت نہ تھی۔'' (۱)

اولاد کی تعلیمی وتربیتی فکر کے ساتھ ایمانی ترقی اور روحانی ارتقاء کی فکر بھی مسلسل رہی، اور یہی وجہ تھی آخر میں بقیۃ السلف حجۃ الخلف حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کی خدمت میں اپنے صاحبزادگان گرامی جناب الحاج حافظ احمد الباری صاحب کو بھیجا، اور اپنی صاحبزادی کا بھی اصلاحی ودینی ربط ان ہی حضرت شیخ الحدیث سے قائم کر دیا، ان کا اس سلسلہ کا ایک مکتوب درج کیا جاتا ہے:

''لکھنؤ: ۲ ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ/ ۲۹/۶/۱۹۶۸ء

حضرت مخدوم ومحترم بارک اللہ فی برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معذرت خواہ ہوں کہ احقر زادی کو بیعت فرمانے کے بعد آں محترم کے غایت شفقت نامہ کے جواب میں اتنی تاخیر سے عرض کرنے کی سعادت مل رہی ہے، لیکن اس کی تلافی کی توفیق اس طرح برابر ملتی رہی کہ حضرت نے اپنی صحت اور معذوری کے باوجود خط لکھوائے، میں بہت زیادہ مشکور ہوں اور ان سے قلب اتنا متأثر ہوا کہ دعا ہے کہ اللہ رب العزت حضرت کو صحت اور بابرکت زندگی عطا فرمائے، میں حضرت کے لیے ہمیشہ دعا کرتا ہوں اور اپنی جیسی نام کی دعا سے شاید ہی کسی دن محرومی رہی ہو، شفاك الله عاجلاً و كاملاً ومستمراً وزيدت بركاتكم

(۱) تجدید تصوف وسلوک طبع ۱۹۹۳ء ص/۳-۴

یوماً فیوماً. اب احقر زادی کی بیعت کی کچھ تفصیل عرض ہے، جس سے آپ خود ہی اندازہ فرمالیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی مشیت اس طرح پوری ہوئی کہ اس نے آں مخدوم کو کسی عذر کا موقع نہیں دیا، صورت واقعہ یہ ہے کہ میں مستورات کے لیے زیادہ سے زیادہ مستور ہی پسند کرتا ہوں، عزیزوں کے جوار میں چند میل کا فاصلہ ہے، ان کو بھی شرکت کی بہت کم، وہ بھی قیود اور شرائط کے ساتھ، چہ جائیکہ لکھنؤ سے بھٹ، دوسری طرف میری حقیقی بھانجی وہاں بیاہی ہوئی ہے، اور خود میری حقیقی بہن جو ماشاء اللہ مومنہ اور صالحہ اور ساتھ ہی ساتھ میری پیر بہن بھی ہے یعنی بیعت حضرت اقدس مولائی مولانا مدنی صاحب قدس سرہٗ سے ہیں، وہ بھی اپنی لڑکی کے ساتھ بھٹ جارہی تھیں (۱)، اور احقر زادی دل ہی دل میں بہت خواہش رکھتی تھی، مگر مجھ سے اجازت اور ہمت پانے کی امید نہیں کررہی تھی، اس لیے وہ خاموش تھی، بہن سلمہا کی روانگی سے چند گھنٹے پہلے اچانک قلب میں یہ خیال آیا کہ اگر وہ آں مخدوم سے بیعت ہونے کی نیت اس سفر میں شریک کرلیں تو میں بخوشی اجازت دے دوں گا، یہ خیال جب میں نے ظاہر کیا تو گویا من مانگی مراد مل رہی ہے اور چٹ چٹ تیار ہوکر اپنی پھوپھی کے ساتھ روانہ ہوگئی اور آں مخدوم نے اس کو اس حال میں بیعت سے شرف فرمایا کہ احقر زادی ہونا آپ کے علم میں بھی نہ تھا یا نہیں آیا تھا، آپ فرمائیں کہ اس ارادت میں کس ارادت کی تکمیل ہوئی، اپنی اور

---

(۱) مولانا عبدالباری ندوی کی ان بھانجی کا "ننھیال" "بھٹ" (ضلع سہارنپور نزد رائے پور) میں ہوا تھا۔ (م)

اس کی دونوں کی طرف سے بعد سلام عرض ہے کہ جب بھی خیال
آجائے تو وہ اپنی اور اپنی اولاد اور شوہر سب کے لیے حسن دنیا
اور آخرت کی بہت ہی عاجزانہ طلبگار رہے۔"(۱)

اس مکتوب سے مولانا کی اس فکر وتوجہ اور اولاد کی دینی واخروی سرخروئی کے حصول کے جذبہ پر روشنی پڑتی ہے، اسی طرح اولاد کی معاد کی درستگی کے جذبہ کے ساتھ دنیوی معاش کے بہتر طریقہ سے انجام دینے کی فکر وتوجہ کا ایک رہنما خط ان کے ہی ایک بڑے بیٹے جناب شمس الباری صاحب کے نام ہے، ملاحظہ ہو:

"شبستان قدم رسول
ہارڈنگ روڈ۔لکھنؤ
۳/۱۰/۱۹۶۹ء
فرزند میاں شمس الباری سلمہ۔
السلام علیکم ودعاء سعادت۔

دو تین دن ہوئے کہ ایک مفصل ملفوف تم کو میاں ایوب سلمہ (۲) کے قلم سے لکھ چکا ہوں، مگر وہی تمہارے پرانے مکان کے پتہ سے، مگر آخری خط میں تم نے لکھا تھا کہ اب تم کو رہائش کے لیے تمہارے سرمد ظلہ نے کوئی مکان دے دیا ہے، بہر حال تم اس کا اہتمام کرو کہ پہلے پتہ جو خط جائیں وہ ضائع نہ ہوں اور اب موجودہ مکان کا پتہ لکھ دینا، یہ خط احتیاطاً تمہارے امروز ہی پتہ پر لکھ رہا ہوں۔

---

(۱) مکتوبات حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی ص ۱۱۲-۱۱۳، جلد دوم، مرتبہ ڈاکٹر اسماعیل میمنی، مطبوعہ دار الاشاعت کراچی۔

(۲) مولانا محمد ایوب ہاشمی ندوی (داماد) مراد ہیں۔

اور ضرورت فوری پیش یہ آئی ہے کہ تمہارے زاہد حسین صاحب سلمہ کا کارڈ اچانک کل ملا، اور انھوں نے یہاں ادارہ اشاعت دینیات نئی دہلی نمبر ۱۳ کے پتہ پر ایک ہزار کتابوں کے لیے تمہارے حوالہ سے لکھا ہے، جب پہلی مرتبہ مکتبہ برہان کے لیے تم نے لکھا تھا تو آسانی تھی اور اس سلسلہ میں دوسری مرتبہ بھی مہینے دو مہینے کے اندر آسانی سے ممکن تھا مگر پھر درمیان میں تم نے روک دیا، اب سردست تو بہت دشواری ہے، پھر بھی جو تھوڑی بہت کوشش ہو سکے گی ہوگی، لیکن ادارہ اشاعت دینیات نئی دہلی کا جو پتہ لکھا ہے، اس کا غالباً کسی بینک میں بھی حساب ہوگا، بینک کے ذریعہ ہو کیسے ممکن ہوگا؟ اور یہ تم کہاں سے لاؤ گے؟

دوسری اس سے بھی اہم بات دوکان کی صورت میں کسی دوسرے شریک اور پھر مستقل دوکان پر کام کرنے والے ہر طرح قابل اعتماد آدمی کا ہونا ضروری ہے، دوسرے شریک تو اگر میرے دینی بھائی یا پیر بھائی اور تمہارے سراپا اشفاق رفیق مولانا اشفاق خاں سلمہ ہو سکیں تو کیا کہنا، ورنہ پھر گھر ہی پر مکتبہ قائم کر کے اور سردست اشتہارات سے کام لینے سے کام شروع ہو سکتا ہے۔

باقی انشاء اللہ اگر تم آ سکے تو زبانی۔

والسلام

دعاء جوو دعاء گو"

مولانا عبدالباری صاحب کی تربیتی فکر و جذبہ اور اللہ کے لیے محبت کرنے اور اللہ ہی کے لیے دوری اختیار کرنے کا جو حال تھا اور خوف و خشیت اور دین سے تعلق

ومحبت کی جو کیفیت تھی وہ ان کی اولاد کے مشاہدے میں آتی رہی، جس کا ایک بڑا فائدہ اس طور پر ظاہر ہوا کہ ان کی آخر حیات میں اولاد نے جو تیمارداری اور خدمت کی اور ان کی وفات کے بعد ان کی پسند و تعلق کے کاموں کو اختیار کرنے کی جو کوشش کی، اور آج بھی وہ لوگ ان کے مشن کو آگے بڑھانے کا کام انجام دے رہے ہیں، اور ان کی کتابوں کو شائع کرنے کے ساتھ اپنے والد کے تعلق والوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کا معاملہ کرتے ہیں، یہ سب اسی تربیت رہنمائی اور فکر و دعا کا فیض ہے۔

الحاج جناب فضل الباری صاحب جو مولانا کے زمانہ حیات میں ان کی تربیت میں سختی کی وجہ سے سامنے آنے کی ہمت بھی کرنے سے گریزاں رہتے تھے، مگر ان کا دل و دماغ ان کی ہدایات کی سچائی پر یقین سے معمور تھا، اسی لیے انھوں نے تلافی مافات میں خیر کے ان کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جو ان کے تقرب الی اللہ کا ذریعہ بنیں اور ان کے والد کے لیے ذخیرۂ آخرت ہوں کہ اولاد کی نیکی بغیر نیت وارادہ کے بھی والدین کی جھولی میں جاتی ہے کہ وہ اس دنیا میں ان کے وجود کا ظاہری ذریعہ ہوتے ہیں، اور نیت وارادہ کا فائدہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا یہ عمل تقرب الی اللہ کا بڑا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اخلاقی جرأت وصاف گوئی

مولانا عبدالباری ندوی کی طبیعت میں حق پسندی بے حد تھی، جس بات کو صحیح سمجھ لیتے اس کو بے جھجک کہتے اور بلا خوف لومۃ لائم عمل کرتے، اس راہ میں کسی دوستی اور عزیز داری کی پرواہ نہ کرتے، مولانا محمد نعیم صدیقی ندوی (حال مقیم دبئی) اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ:

> ''راقم الحروف کو اپنی ندوہ کی طالب علمی کے دور میں مرحوم کی خدمت میں بار بار حاضری کی سعادت نصیب ہوئی ہے، میرے

ساتھ ان کا برتاؤ ہمیشہ شفقت ومحبت کا رہا، لیکن اس کے باوجود رفتار وگفتار اور وضع ولباس میں اگر کوئی کوتاہی محسوس کرتے تو سختی کے ساتھ تنبیہ بھی کرتے، گفتگو میں علم کا وقار اور دین کا اخلاص نمایاں ہوتا۔" (۱)

مولانا نعیم صدیقی کے بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مولانا عبدالباری ندوی علیہ الرحمہ کے اندر صاف گوئی اور اخلاقی جرأت کا وصف نمایاں وصف تھا، وہ سوچ سمجھ کر ایک موقف اختیار کرتے پھر اس پر وہ جمتے اور ٹس سے مس نہ ہوتے، انھیں مغربی کھیلوں سے نفرت تھی، وہ یہ محسوس کرتے کہ ان سے اخلاقی قدریں متاثر ہوتی ہیں، تو وہ برملا اس کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے، تعزیتی جلسوں کو بھی صحیح نہ سمجھتے، استاذ محترم مولانا مفتی محمد ظہور ندوی نے جو کہ مولانا کے یہاں آمدورفت رکھتے تھے بتایا کہ مولانا تعزیتی جلسوں کو اَپ ٹو ڈیٹ (UPTODATE) عرس کہا کرتے تھے۔

مولانا کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ حدیث "مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَراً فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ وَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ." کو پیش نظر رکھتے، اور دل سے برائی کی قباحت محسوس کر لینے کے بعد فوراً اس کے ازالہ کی تدبیر اختیار کرتے، اور زبان سے ضرور کہتے، توجہ دلاتے، تنبیہ کرتے، ترغیب دیتے اور ترہیب سے بھی کام لیتے، اور اگر وہ اپنے دائرہ کار میں دیکھتے تو پھر ان کا رویہ بڑا سخت ہوتا، فرائض وشعائر میں کوتاہی پر تو ادنیٰ سزا یہ ہوتی کہ گھر سے باہر کردیتے، خاص طور پر بے نمازی کے لیے اپنے مکان کے کسی حصہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دیتے، اور سچ یہ ہے کہ ان کے یہاں اللہ کے فرائض وحقوق کے معاملہ میں بڑی سختی تھی، لچک نہ تھی۔

ایک بڑے عالم کے یہاں کے تقریب نکاح میں گئے، نماز کا وقت ہوا،

---

(۱) معارف (مارچ ۱۹۷۶ء)

زیادہ تر لوگ نماز کو گئے، نوشہ میاں نہیں گئے، مولانا نے برملا ان عالم صاحب سے کہا کہ ایسے بے نمازی داماد کا انتخاب کیوں کیا گیا، اسی طرح اپنے کرایہ داروں کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرتے تھے، نماز وشرعی وضع قطع کے پابند ہیں یا نہیں، اگر اس کے مطابق نہ پاتے تو کرایہ دار نہ بناتے، ایک صاحب الجھے اور کہا کہ آپ کو کرایہ سے مطلب! یا ہمارے دینی معاملات سے، انھوں نے صاف کہا یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہمارے احاطہ میں جو مقیم ہو وہ نمازی ہو، اور شریعت کا پابند ہو۔

جب ملی مسائل میں اظہار خیال کی بات آتی یا دین وملت کو تقویت پہنچانے والے کاموں میں رائے طلب کی جاتی تو پوری خیر خواہی، انسانی وملی ودینی خیر خواہی کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھ کر اپنی رائے پوری مضبوطی سے دے دیتے، جس کی ایک قابل ذکر مثال اس وقت کی ہے جب مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ناظم ندوۃ العلماء کی وفات کے بعد ندوۃ العلماء کی نظامت کا مسئلہ سامنے آیا تو مولانا عبدالباری ندویؒ نے پوری قوت سے یہ بات فرمائی کہ مولانا علی میاں اپنے ہجوم کار کی وجہ سے ندوہ کو پورا وقت اگر چہ نہیں دے سکتے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ندوۃ العلماء کو فائدہ انہی سے پہنچے گا، اس لیے نظامت کا بار ان ہی کے کاندھوں پر ڈالا جائے۔

دنیا نے دیکھ لیا کہ مولانا کی رائے کیسی مبارک ثابت ہوئی، اور ندوہ کو ان کی ذات والا برکات سے چار دانگ عالم میں شہرت ومقبولیت ملی۔

اسی طرح صاف گوئی اور حق پسندی کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب انھوں نے جماعت اسلامی کے سلسلہ میں اپنا موقف ظاہر کیا، اور اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے طریقہ کار اور فکر سے شدید اختلاف ظاہر کیا، جس کو پوری وضاحت کے ساتھ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے اپنی کتاب ''مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگذشت اور اب میرا موقف'' میں بیان کیا ہے، اسی طرح اور بھی بعض

تحریکوں اور افکار واشخاص پر انھوں نے اپنی تنقید مخفی نہیں رکھی، اور جو بات کہی برملا کہی، لیکن تنقیص سے ہمیشہ گریز کیا۔

کبھی وہ حق گوئی، اور غلط بات کو غلط کہنے میں اپنے ادبی مذاق اور ظریفانہ مزاج سے بھی کام لیتے، اور ایک دو جملوں میں پوری تصویر کھینچ دیتے، اور اسی سے نصیحت کا کام لے لیتے، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے معروف اسلامی شاعر جگر مرادآبادی کے تذکرہ کے ضمن میں لکھا ہے کہ:

> ''ایک روز مولانا سید سلیمان ندوی ندوہ کے مہمان خانہ میں مقیم تھے، مولانا عبدالباری ندوی بھی تشریف رکھتے تھے کہ نواب سید شمس الحسن خاں ملنے آئے، باتوں باتوں میں جگر صاحب کا تذکرہ آگیا، ان دنوں جگر صاحب انھیں کے مہمان اور بھوپال ہاؤس میں مقیم تھے، اور شاید یہی تذکرہ کی تقریب تھی، یہ وہ زمانہ تھا کہ جگر صاحب اپنی قدیم عادت (مے نوشی) سے توبہ کر چکے تھے، نواب شمس الحسن صاحب نے کہا: کل کا واقعہ ہے کہ جوش صاحب ہمارے یہاں آئے اور باصرار جگر صاحب کو لے گئے، اور وہ اپنی توبہ پر قائم نہ رہے، وہاں سے آئے تو دروازہ بند کرلیا اور بہت روئے، مولانا عبدالباری صاحب جو اصلاً فلسفہ اور تصوف کے رمز شناس ہیں، بڑا اچھا ادبی مذاق رکھتے ہیں اور بعض مرتبہ بڑے اچھے فقرے ان کی زبان سے نکل جاتے ہیں، بے ساختہ بولے کہ ''معلوم ہوتا ہے ''جگر'' خراب ہے ''دل'' اچھا ہے۔''

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس واقعہ کو بیان کر کے لکھتے ہیں کہ:

> ''واقعہ بھی یہی تھا کہ جگر صاحب کا دل ہمیشہ اچھا رہا، معلوم نہیں

کب اور کہاں ان کو یہ بری عادت پڑ گئی تھی۔"(۱)

بالآخر جگر صاحب کو اللہ نے بہت نوازا، علماء حقانی اور مشائخ و بزرگوں سے ان کا تعلق بڑھتا گیا، اور بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی "بالآخر اس جگر کو بزم خرابات سے اٹھا کر اہل دل کی صف میں بٹھا دیا گیا۔"

مولانا عبدالباری ندوی کی بے باکی اور حق گوئی کے واقعات بے شمار ہیں، یہاں مثال کے طور پر چند باتیں ذکر کر دی گئیں کہ اظہار حق اور احقاق حق کا عمل ابطال باطل کے لیے ضروری ہوتا ہے، اور ایسا نہ ہونے سے حق و باطل میں تمیز کرنا خواص امت کے ہی بس کی بات رہ جاتی ہے۔

حمیت وحمایت دینی

مولانا عبدالباری ندوی کے اوصاف وامتیازات میں ایک نمایاں اور امتیازی وصف حمیت دینی تھا، اور یہی حمیت ان کو ہر جگہ بے چین رکھتی، چونکہ ان کی حالات پر نظر تھی اور وہ سازشوں سے اچھی واقفیت رکھتے تھے، اخبارات کا مطالعہ کرتے، خاص طور پر انگریزی اخبارات دیکھتے، اس لیے وہ کسی بھی معاملہ کو یونہی نہیں لیتے، اس کی تہہ تک جاتے، اور بے چین ہو جاتے، اسی طرح دین کی صحیح روح اور مزاج سے ہٹ کر کسی کام کو دیکھتے تو ان کے سامنے اس کے منافع سے زیادہ اس کے مضرات ہوتے، اور ان کی دور رس نگاہ ان خطرات کو محسوس کرتی جس کا ادراک ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی، وہ اپنے متعلقین کو ان خطرات سے آگاہ بھی کرتے، اور دوسروں کو اس سے محفوظ رکھنے کے لیے تنبیہ بھی کرتے، جو چیز جس مقصد کے لیے ظہور میں آتی وہ اس میں مقصد سے انحراف کو پسند نہ فرماتے، تعلیمی مدارس میں تبلیغی مساعی کو اسی حد تک ضروری سمجھتے جن کا ہونا ضروری ہوتا، ان کے نزدیک مدارس

(۱) پرانے چراغ حصہ اول ص/۳۷۲

دارالمعلمین والمعلمین ہیں، دارالمبلغین اور دارالمصنفین نہیں، ان کی رائے صاف اور شدت کے ساتھ ہوتی، جس سے بعض لوگ ان کے اس فعل کو انتہا پسندی سے تعبیر کرتے، لیکن یہ سب کچھ ان کی دینی حمیت اور دینی حمایت کا نتیجہ تھی، حمیت وحمایت دینی یہ دونوں ان کے امتیازی اور نمایاں وصف تھے، استاد محترم مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی جو کہ ان کی خدمت میں نیازمندانہ اور مستفیدانہ حاضری دینے والے علماء دین میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور مولانا کے معتمد بھی رہے، راقم نے ان سے مولانا عبدالباری ندوی کی امتیازی خصوصیت اور نمایاں وصف دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا ''ان کا نمایاں وصف حمیت دینی تھا، اور ان کا یہ وصف کبھی کمزور اور مغلوب نہیں ہوا۔'' (۱)

دینی ودنیوی جامعیت

مولانا عبدالباری ندوی کا ایک امتیازی وصف دینی ودنیوی جامعیت تھا، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ دعا ''رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ.'' کا گویا ان کی زندگی میں پورا ظہور نظر آتا تھا، دینی سوجھ بوجھ، ایمانی فراست وبصیرت کے ساتھ دنیوی سوجھ بوجھ، یعنی عقل دینی اور عقل دنیوی دونوں سے ہی وہ متصف تھے، اور ان کے خیرخواہانہ مزاج نے ان کی اس

---

(۱) اسی سلسلہ کا ایک واقعہ مولانا سید محمد غفران صاحب ندوی نے بتایا کہ جب مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ راوڑکیلا، جمشید پور کے فسادات کے بعد وہاں کے لیے عازم سفر ہوئے تو مولانا عبدالباری ندوی خاص طور سے اپنی قیام گاہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء عصر بعد رکشہ سے اکیلے آئے، اور مولانا سے اپنا درد وکرب رکھتے ہوئے کہا کہ ان فسادات میں ہماری شامت اعمال کا بڑا دخل ہے، اور ہمیں رپورٹ ملی ہے کہ ''ابھی قریب ہی رمضان شریف میں وہاں کے مسلمانوں نے بہت ہی زیادہ رمضان کی ناقدری کی، اس لیے آپ وہاں جاکر خاص طور پر دینی فکر اور تعلق مع اللہ کی طرف لوگوں کو توجہ دلائیں کہ انھیں سے اللہ کی مدد آتی ہے، اور اس کی رحمت متوجہ ہوتی ہے۔'' مولانا یہ فرمارہے تھے اور ان کے چہرے سے انتہائی اضطراب اور بے چینی کے آثار ظاہر ہورہے تھے۔

خصوصیت سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچایا، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (برادر اکبر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) اور مولانا عبدالباری ندوی نے باغات تیار کرائے، اور ایک دوسرے کی پوری مدد فرمائی، چند باتیں اسی سے متعلق مولانا عبدالباری ندوی کے قلم سے نقل کی جاتی ہیں، جس سے ان دونوں کے دین پر عمل کے ساتھ دنیا کو برتنے کا سلیقہ بھی سیکھا جاسکتا ہے، مولانا ندوی نے جو کچھ دنیوی فہم وبصیرت اور دینی مزاج ومذاق ڈاکٹر صاحب کا بیان کیا ہے اس میں وہ ان کے پورے شریک رہے ہیں، مولانا لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحبؒ کوئی تارک الدنیا قسم کے دیندار بالکل نہ تھے، جن چیزوں کو خالص دنیاداری خیال کیا جاتا ہے، ان میں بھی ایسی مشغولی تھی کہ وطن (رائے بریلی) ننیہال (ہنسوہ) اور لکھنؤ میں اچھے بڑے باغات لگائے، لکھنؤ میں پختہ چالیس بیگھے سے زیادہ کا باغ خود ہی اس نیازمند کو شریک فرما کر لگایا اور مجھ کو ہزار میل دور حیدرآباد میں رہ کر خالی شرکت ہی شرکت کی سعادت حاصل رہی، ورنہ وہی اس کے ابتدائی محرک ومجوز سب کچھ تھے، اور ان ہی کی نگرانی میں انتہا تک پہنچی، جب میں پنشن پر آیا تو قریب قریب تیار پایا، فہم سلیم جس کو انگریزی میں ''فہم عام'' (Common Sence) کہتے ہیں، ماشاءاللہ ایسی سلیم اور عام وہمہ گیر تھی کہ تھوڑی واقفیت اور تجربہ سے ہر معاملہ میں بقدر ضرورت خاصی بصیرت پیدا ہوجاتی، باغبانی کے متعلق مختلف کھادوں نیز درختوں، پھلوں کی بیماریوں وغیرہ سے متعلق اچھی خاصی واقفیت وبصیرت بہم پہنچالی تھی۔

لیکن ان کی یہ دنیاداری جیسی عین دینداری تھی، اس کا اندازہ ''مشتے نمونہ از خروارے'' ایک ہی واقعہ سے کر لیجئے، باغ کے ایک بیل میں عیب یہ ہوگیا کہ جوتائی وغیرہ میں چلتے چلتے بیٹھ جاتا، جب کسی طرح یہ عیب دور نہ ہوا، تو مویشیوں کے کسی بازار میں بچوانے (فروخت) کے لیے بھجوادیا، تھانوی جوتیوں کی بدولت بعد کو مجھ کو خیال آیا کہ یہ ہدایت کرنا رہ گیا ہے کہ خریداروں پر بیل کا یہ عیب ظاہر کردیا جائے، مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا، ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ یہ تو بڑی چوک ہوگئی، فرمایا: نہیں، میں نے پوری اس کی تاکید کردی ہے، اب سننے کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود بیل بکا اتنے ہی کا جتنے کا وہ خریدا گیا تھا، اور خریدار نے کہا کہ ٹھیک ہوجائے گا۔

ندوہ کی نظامی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں وقف کا ایک مقدمہ تیس بتیس (۳۰-۳۲) سال لڑنا پڑا، کبھی اس پر گفتگو فرماتے تو میں ششدر رہ جاتا کہ ڈاکٹر صاحب آپ تو خود کچہری کے معمولی مختاروں، کارپردازوں سے زیادہ مقدمات کو سمجھ لینے لگے ہیں، خصوصاً جب خود اپنی اسی باب میں انتہائی نافہمی وناا ہلی سے مقابلہ کرتا کہ ایک نجی وقف ہی کی بدولت بعض مقدمات میں پھنس کر آج تک نہ کوئی بات مختار کی ٹھیک سمجھ پاتا ہوں نہ وکیل کی، بس یہ سمجھتا ہوں کہ دل ودماغ لے کے اس دنیا میں شاید ہی کوئی ''عذاب الیم ومہین'' موجودہ دور کے عدالتی چکروں سے بڑھ کر ہو، نام کی ان عدالتوں میں حق اور سچائی کے مقابلہ

میں ظالموں اور چوروں ہی کے لیے ہر طرف چور دروازے زیادہ سے زیادہ کھلے رکھے گئے ہیں، پھر دیکھا کہ لوگ ہنسی خوشی برداشت کرتے ہیں، عادت کی قہرمانی کے سوا کیا کہا جائے کہ جہنم بھی جہنم نہیں معلوم ہوتی، ڈاکٹر صاحب کو بھی اس سلسلہ میں وقتاً فوقتاً بڑی اذیتوں کا سامنا رہتا، بعض وقت مضطر ہوکر دعاء کے لیے ارشاد فرماتے، تاہم ان کی نظر چونکہ بالکلیہ ایک دینی ادارہ کے وقف کی حفاظت وخدمت اور خدا وآخرت کی وفا واجر پر رہتی، اس لیے یہ تلخیاں ''از محبت تلخہا شیریں شود'' کا حکم رکھتیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ ممدوح کی اس نظر دقیق ہی نے مقدمہ بازی کی ان طویل و مدید پریشانیوں کے بعد ندوہ کے اس وقف کو بہت کچھ بچالیا، آخر میں جن مشہور ایڈوکیٹ حکیم الدین صدیقی صاحب کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے کامیابی بخشی، جو اس نیازمند کے پرانے عنایت فرما تھے، وہ خود مجھ سے ڈاکٹر صاحب کی معاملہ فہمی خصوصاً اس مستقل مزاج کے بہت معترف تھے کہ معاملہ کو ایک مرتبہ اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد پھر ان کو کوئی ڈانواڈول نہیں کرسکتا تھا، مقدمات ہی کے معاملہ میں اپنا ایک تجربہ وفیصلہ خود راقم ہٰذا کو یاد ہے، ڈاکٹر صاحب نے یہ سنایا کہ معمولی ووقتی مشورہ کے علاوہ کوئی مستقل کام کسی دینی مدرسہ وادارہ کا بھی کسی بظاہر دیندار وکیل سے بھی بلامحنتانہ ہرگز نہ لینا چاہئے، ورنہ محنتانہ تو بچتا ہے مگر کام اکثر بگڑ جاتا ہے، ان چیزوں کا شمار تو پھر بھی مہمات امور میں ہوسکتا ہے لیکن ان کی ادائے

حقوق وفرائض میں وفا وآخرت والی ایمانی واحتسابی نظر گھر کی روزمرہ کی معمولی معمولی جزئیات تک پر رہتی، مدتوں اپنا معمول رہا کہ جمعہ ڈاکٹر صاحب کی مسجد میں ہی پڑھتا، اور عصر تک ان کی خاص آرامگاہ میں آرام اور باتیں کرتا رہتا، بارہا الماریوں پر پیاز وغیرہ کی سی چیزیں پھیلی دیکھتا، فرماتے کہ ضرورت کی چیزوں کو وقت پر اور یکجائی طور سے فراہم کر لینے میں سہولت بھی رہتی ہے، اور برکت وکفایت بھی، حلال مال بھی بڑی نعمت ہے، اس کی بڑی قدر وحفاظت کرنی چاہئے۔

یہ خاص تھانوی ذوق کی بات تھی، کیا کہوں چھوٹے چھوٹے معاملات تک میں ذمہ داریوں کے ان احساسات کے ساتھ انتظامی مادہ ایسا تھا کہ اگر کسی سلطنت کی انتظامی ذمہ داریاں حوالہ کر دی جاتیں تو عمرین (عمر بن خطاب وعمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہما) کی خلافت کا ایک نظارہ اس ''حسنی عہد'' میں دنیا کے سامنے پھر آجاتا۔''

☆☆☆☆☆

باب نہم

علمی خدمات، اہم کتابیں جائزہ وتعارف

۱- تفسیر قرآن مجید:

مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو اعلی درجہ کا قرآنی فہم عطا ہوا تھا، علوم شرعیہ واسلامیہ اور عربی زبان میں انھیں جو درک حاصل تھا اور اس کے ساتھ علوم جدیدہ پر بھی نظر بلکہ سائنس وفلسفہ جدیدہ کا جو انھیں علم حاصل تھا اس سے انہیں یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں، باقاعدہ تفسیری کام نہیں کیا لیکن دوران تلاوت آیات کے معانی مفاہیم ومطالب کو ایجاز واحتیاط کے ساتھ سپرد قلم کردیا، اس کے لیے تھوڑا بہت ان کا یہ اہتمام رہا کہ انھوں نے اس حمائل شریف میں ہر ورق قرآنی کے ساتھ ایک سادہ ورق بھی لگالیا، اور اسی میں دہ آیت پاک سے متعلق اپنی معلومات تحریر فرمادیتے، انھوں نے اس نسخہ قرآن مجید کو عام نہیں کیا، البتہ اپنے فاضل دوست مولانا عبدالماجد دریابادی کے حوالہ کردیا، مولانا دریابادی اپنے ایک مکتوب (بنام ڈاکٹر غلام محمد صاحب کراچویؒ) میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا عبدالباری نے اپنی وہ حمائل (مطبوعہ مصر) حوالہ کردی جو قیام حیدرآباد میں ان کے زیر تلاوت رہی تھی، اسے مروّق کرالیا تھا، اور سادہ اوراق پر نوٹ لکھتے چلے گئے ہیں، بہت خوب ہیں، اگر یہ نوٹ چھپ جائیں تو ایک خاص تفسیر کا کام دے سکتے ہیں، گو میرے رنگ سے بہت الگ ہیں لیکن بہرحال

بجائے خود بڑے نافع ہیں، میں ان سے کہا کرتا ہوں کہ آپ نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے، ایک مومن صادق وراسخ کی حیثیت سے، اور میں نے محض ایک کتاب کی عینک سے۔"

والسلام

دعا گو

عبدالماجد(۱)

۲- مبادیٔ علوم انسانی:

یہ برکلے کی کتاب Principles of Human knowledge کا ترجمہ ہے، اور ایسا کامیاب ترجمہ ہے جو ترجمہ سے آگے نکل کر اصل کتاب کی صورت اختیار کر گیا ہے، حضرت مولانا عبدالباری ندوی کا یہ ایک اہم کارنامہ ہے جس پر انھیں علمی و دینی حلقوں سے بڑی داد تحسین ملی، اور جو ذہن اسلامی عقائد وافکار کے سلسلہ میں شکوک وشبہات کا شکار ہو رہے تھے اس سے ان کو اطمینان حاصل ہوا، اور اسلام پر نئے سرے سے ان کا اعتماد بحال ہوا، ندوۃ العلماء کے سترہویں اجلاس منعقدہ ناگپور (۲۹-۳۰/مارچ ۱۹۱۸ء/ ۱۵-۱۶/جمادی الآخرۃ ۱۳۳۶ھ) میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے ان کے اس کارنامہ کو سراہتے ہوئے اپنے خطبۂ صدارت میں داد دیتے ہوئے کہا:

"مولوی عبدالباری ندوی صاحب پونا کالج کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں، اول انھوں نے عربی علوم کی تکمیل دارالعلوم میں

---

(۱) خط پر تاریخ ۲۸/اکتوبر ۱۹۶۸ء درج ہے، ڈاکٹر غلام محمد صاحب جن کے نام یہ خط ہے، وہ حضرت سید سلیمان ندوی کے مسترشد وخلیفہ اور حضرت مولانا عبدالباری ندوی کے شاگرد خاص بزمانہ حیدرآباد ہیں، اب ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ (م)

کی، اس کے بعد انگریزی حاصل کی، فلسفہ جدید کی مستند کتابیں پڑھیں، اور قوت مطالعہ سے اس قدر استعداد بہم پہنچائی کہ کم تر گریجویٹ ان کا اس فن میں مقابلہ کر سکتے ہیں، ان تمام مراتب کو طے کرنے کے بعد انھوں نے برکلے کی کتاب ''پرنسپلز آف ہیومن نالج'' کا مجتہدانہ ترجمہ اردو میں کیا، ترجمہ سے یہ مطلب ہے کہ اول مطالعہ کر کے مضامین پر حاوی ہوئے پھر ان کو اردو میں ادا کیا، یہ نہیں کیا کہ انگریزی لفظ کے مقابل اردو لفظ رکھ کر حق مترجمی ادا کر دیا، برکلے کے فلسفہ پر پورا ریویو کیا، یہ ترجمہ کس پایہ کا ہے، اس کا اندازہ اس سے فرمایئے کہ نواب عماد الملک سید حسین صاحب بلگرامی نے ازبس پسند کیا، اس میں دار العلوم ندوۃ العلماء کا حسین موقف یہ ہے کہ ہمارے عالم نے یہ محنت اس لیے گوارہ کی کہ برکلے کا فلسفہ مادیت کی شکست کا بہترین ہتھیار ہے، اس طرح یہ خدمت ایک دینی خدمت ہے۔''(۱)

۳- برکلے کی سوانح اور اس کا فلسفہ:

مشہور عالم و مصنف مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا نے ڈی. کارٹ سے لے کر ڈیوڈ ہیوم تک کی تمام کتابوں کو خصوصیت سے پڑھا، اور ان سب کا نچوڑ جو انگریزی کے مآخذ میں ملا، سب پر ناقدانہ نظر ڈالی۔''(۲)

---

(۱) تاریخ ندوۃ العلماء ۲/۲۰۳، از مولانا شمس تبریز خاں۔

(۲) سوانحی نقوش از مولانا عبداللہ عباس ندوی (مشمولہ سلسلہ کتب تجدید)

دارالمصنفین اعظم گڑھ نے یہ کتاب شائع کی، اور اس وقت شائع کی جب اس نے چند ہی کتابیں شائع کی تھیں، اور اس کی اہمیت کو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی میں بیان کیا گیا تھا۔

۴- مذہب وعقلیات:

یہ رسالہ ۴۸ رصفحات کا ہے اور اپنے موضوع پر البیلا، منفرد اور شاہکار ہے، اور یہی وہ رسالہ ہے جس کی تصنیف سے حضرت مولانا عبدالباری ندوی کی شہرت کو چار چاند لگے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے انھیں عارف اور ان کے اس رسالہ کو اسلام کا آہنی قلعہ قرار دیا، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو یہ کہنا پڑا کہ فلسفہ نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا ہے، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے جب اپنی محسن ترین کتابیں گنائیں تو اس کو بھی اس فہرست میں رکھا، یہ ایک لکچر تھا جو مولانا عبدالباری ندوی نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سورت منعقدہ دسمبر ۱۹۱۸ء میں دیا تھا، جس میں انھوں نے مذہب وعقلیات کے اختلاف نوعیت اور تباعد حیثیت کی توضیح وتشریح کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ عقل ومذہب کے مابین تطبیق کی کوشش ایک سعی لاحصل ہے، اس رسالہ کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ یہ زبانی تھا، لوگوں کے اصرار پر بعد میں انھوں نے قلمبند کیا، اور حوالوں کے ساتھ مرتب کیا، انھوں نے دیباچہ کتاب میں شکوہ کیا ہے کہ ''جس قسم کا مضمون ہے اس طرح کی بحثوں کے لیے بڑی بڑی کانفرنسوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی مخصوص صحبتیں زیادہ موزوں ہوتی ہیں، مگر "المأمور معذور" مخدوم ومحترم مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کے حکم سے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے بھرے پنڈال میں مذہب وعقلیات کے موضوع پر تقریر کرنی پڑی۔''(۱)

---

(۱) دیباچہ کتاب از مؤلف

رسالہ کو اس نتیجہ پر ختم کیا ہے کہ مذہب کے دو حصوں (عقائد و اعمال) میں سے عقل کے لیے اگر گنجائش نکلتی ہے تو صرف ثانی الذکر میں، اس لیے اگر کسی علم کلام کا وجود کسی حد تک جائز ہو سکتا ہے تو وہ جس کو صرف اسرار اعمال سے بحث ہے، لیکن اعمال میں بھی عقل آخری حکم نہیں قرار پا سکتی، یعنی جو بات آج خلاف عقل معلوم ہوتی ہے اس کا ہمیشہ خلاف عقل معلوم ہونا یا فی نفسہٖ نامعقول ہونا ضروری نہیں، اس لیے عقل اور بالتخصیص عقل عملی کی حقیقت جو کچھ ہے اس کو مولانا حالی کی حکیمانہ زبان میں سن رکھو!

دیکھ عادت کا تسلط میں نے عادت سے کہا
گھیر لی عقل صواب اندیش کی سب تو نے جائے
ہنس کے عادت نے کہا کیا عقل ہے مجھ سے الگ
میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل ورائے

۵- معجزات انبیاء اور عقلیات جدیدہ:

یہ ۸۸ صفحات کا رسالہ ہے، جو حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی فرمائش پر سیرۃ النبیؐ مؤلفہ علامہ شبلی نعمانیؒ کے لیے لکھا تھا، جس کی تکمیل وہ کر رہے تھے، مذہب و عقلیات کا رسالہ اس زمانہ میں سامنے آیا جب وہ احمد آباد کالج گجرات میں پروفیسر تھے، اور یہ اس زمانہ کا کام ہے جب وہ حیدر آباد منتقل ہو گئے تھے، اور جامعہ عثمانیہ میں معلم فلسفہ جدیدہ تھے، علامہ سید سلیمان ندوی نے ان کے اس کام کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے، انھوں نے اعتراف کیا کہ:

"ہماری جماعت میں بلکہ علماء کی جماعت میں پروفیسر عبدالباری ندوی (معلم فلسفہ جدیدہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن) سے بڑھ کر فلسفہ جدیدہ کا کوئی ماہر نہیں، معجزات کی بحث میں ضرورت تھی کہ

اس باب میں فلسفہ جدیدہ کی جو موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں ہیں ان سے بھی تعرض کیا جائے، چنانچہ میری درخواست پر موصوف نے ''معجزات اور فلسفہ جدیدہ'' کا باب لکھ کر عنایت کیا ہے۔''(۱)

مولانا نے پانچ مباحث پر کتاب کو تقسیم کیا ہے جو یہ ہیں:

۱- امکان معجزات۔

۲- شہادت معجزات۔

۳- استبعاد معجزات۔

۴- یقین معجزات۔

۵- غایت معجزات۔

ان مباحث پر بحث کرنے کے بعد چند سطروں میں اس کا خلاصہ خود ہی یوں پیش کرتے ہیں:

''گذشتہ مباحث کا لب لباب یہ ہے کہ:

۱- معجزہ نام ہے پیمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے جامع انسان کے تعلق سے کسی واقعہ کے ظہور کا، جس کی کم از کم بوقت ظہور عام علل واسباب سے توجیہ نہ ہو سکے۔

۲- ایسے واقعات بذات خود عقلاً ناممکن نہیں، ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ انتہائی حیرت انگیز یا مستبعد واقعات کی ہوتی ہے، اس لیے بظاہر ان کو قبول کرنے کے لیے بھی نہایت غیر معمولی شہادت کی ضرورت نظر آتی ہے۔

---

(۱) مقدمہ سیرۃ النبیؐ ۳/۳ (سید سلیمان ندویؒ ۱۳۴۳ھ)

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ و مصنف تاریخ اسلام نے لکھا ہے کہ سیرت کا یہ حصہ ۱۹۲۰ء میں لکھا گیا اور ۱۹۲۴ء میں طبع ہوا۔

۳- لیکن دراصل یہ استبعاد ایسا نہیں ہوتا جس کی کافی مثالیں عام زندگی میں بھی نہ ملتی ہوں اور جن کے قبول کے لیے کسی غیر معمولی شہادت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔

۴- مگر یقین صرف شہادت وغیرہ خارجی چیزوں سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کا دارومدار زیادہ تر یقین کی خواہش اور اس کے موانع و مؤیدات پر ہے، جس کا تعلق بڑی حد تک خود یقین کرنے والے کے گذشتہ معتقدات ومزعومات سے ہوتا ہے۔

۵- یقین معجزات کی خواہش کا پیدا ہونا موقوف ہے ''ایمان بالغیب'' پر۔

۶- اگر غیب پر ایمان ہے اور فرعون و ابوجہل کی طرح عناد و تعصب کے موانع موجود نہیں ہیں، ساتھ ہی مدعی نبوت کی زندگی اپنے احوال و اخلاق کے لحاظ سے بجائے خود اس کی نبوت کی مؤید ہے تو معجزہ (بمعنی خارق عادت) کا کیا ذکر ہے خود پیمبر کی آواز وصوت ہی معجزہ ہے۔ ؎

در دل ہر کس دانش را مزہ است
روئے و آواز پیمبر معجزہ است

۶- حدیقۂ نفسیات:

ماہر نفسیات اور فلسفی جی. ایف. اسٹوٹ کی کتاب ''مینول آف سائکالوجی'' کا اردو ترجمہ بھی مولانا کے کارناموں میں سے ایک کارنامہ ہے، یہ ترجمہ ۶۶۶/ صفحات پر مشتمل حدیقۂ نفسیات کے نام سے جب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوکر منظر عام پر آیا تو مولانا عبدالباری کی شہرت کو چار چاند لگ گئے، ۱۹۲۸ء کا سنہ ان کے

لیے کئی خوشیاں لایا، ان کی یہ محنت سامنے آئی، تلاش مرشد میں مرشد تھانوی کا دامن پکڑا، اور حج کا مبارک سفر طے ہوا، ایک طرف مولانا کا یہ انقلابی کام جس نے دل و دماغ کو مسحور کیا، اور ان کی دھاک بیٹھائی دوسری طرف مولانا کی تواضع کا یہ عالم کہ انھوں نے اس شہرت سے کوئی دنیوی فائدہ حاصل کرنا روا نہ سمجھا، ان کا عنفوان شباب تھا، جبکہ ان کے ہمسروں کو بھی یہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی تھی، جو انھیں اس وقت حاصل تھی، مگر معرفت کا جام پینے کی وجہ سے ان پر اس عارضی شہرت کا کوئی اثر نہیں پڑا، چونکہ یہ ان کی زندگی کا اہم مرحلہ تھا اس لیے ان کی اس تحریر کو یہاں پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں جو انھوں نے اس کے دیباچہ کے طور پر لکھی تھی اور وہ یہ ہے:

> ''اگر دیکھا ہوگا کہ نجومی لوگوں کا محض نام پوچھ کر حال بیان کرتے ہیں، اسم اور مسمّٰی کے اس پر اسرار رابطہ کی اگر کچھ بصیرت نصیب ہوتی تو کم از کم یا ناتواں مترجم تو ہرگز ایسے ''شہ زور'' (اسٹوٹ) مصنف سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ نہ کرتا، خیر خدا اس حوصلہ شکن حوصلہ کا بھلا کرے کہ اس نے ترجمہ کے نام سے ہمیشہ کے لیے ڈرایا، پروفیسر اسٹوٹ کے اس احسان کو کبھی نہ بھولوں گا۔
>
> ہمارے محسن پروفیسر کا اپنے فن میں استناد و اعتبار ظاہر ہے، وہ نہ صرف متعدد بڑی بڑی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں میں معلم و ممتحن رہے ہیں، بلکہ ان کی کتابیں اکثر یونیورسٹیوں میں پڑھی جاتی ہیں، لیکن غریب مترجم کو مصنف کی صرف فن دانی سے دوچار ہونا نہیں پڑتا بلکہ اس کی زبان دانی طریق فہم و تعبیر اور سلیقہ تصنیف و ترتیب وغیرہ کے نہ جانے کتنے ہفت خواں طے کرنا پڑتے ہیں۔

میں اپنے کو انگریزی داں بالکل نہیں کہہ سکتا، اس لیے جب بظاہر قصور زبان دانی کی بناء پر فہم مطلب کی راہ میں کوئی ٹھوکر لگی تو اطمینان قلب کے خاطر ہمیشہ مستند انگریزی داں احباب کی طرف رجوع کیا، اور کبھی کبھی تو ان احباب کی پوری پوری کونسل نے مدد فرمائی، پھر بھی تشفی بخش فیصلہ مشکل ہی سے ہوسکا، اکثر ان کی زبان سے یہی سنا کہ: ''عجیب وغریب انگریزی ہے۔''

اس سے بڑھ کر یہ بیچارے مترجم کا علم زیادہ سے زیادہ نفس فن تک محدود مگر حضرت مصنف کے وسیع دائرہ علم میں موسیقی مصوری وغیرہ جتنے دیگر علوم وفنون داخل ہیں سب کا استعمال ضمنی وذیلی مد سے زائد ہی فرماتے ہیں، اس مشکل کے لیے بھی خدا جانے کتنے دروازوں کو جھانکنا پڑا، اور صاف کہنا چاہئے کہ جا بجا ان چیزوں کا ترجمہ بے سمجھے کرنا پڑا۔

اصل یہ ہے کہ درسی کتابیں بالعموم اور ان میں بھی جی. ایف. اسٹوٹ صاحب کی ''مینول آف سائکالوجی'' کی سی بالخصوص ترجمہ کے بجائے اخذ وتلخیص کے لیے زیادہ موزوں ہوتی ہے، باقی مترجم کی جان لینے کا حق اگر حاصل ہے تو صرف نہ مرنے والی (کلاسیکل) کتابوں کو، نہ کہ حشرات الارض کی طرح روز پیدا اور فنا ہونے والی کتابوں کو۔

بہر حال مجھ کو اپنے ترجموں سے یوں بھی کبھی اطمینان نہیں ہوا، اور پیشکش ترجمہ سے تو قطعاً غیر مطمئن ہوں، اس کے پڑھنے پڑھانے والے ارباب علم سے خاص طور پر درخواست ہے کہ جو

غلطی نظر آئے مترجم کے اعلان جہل کی غرض سے نہیں کہ وہ سراپا ''جہول'' ہے البتہ اصلاح کی نیت سے ضرور مطلع فرمادیں تاکہ اگر طبع ثانی کی نوبت آئے تو صحت ہوجائے۔

جن دوستوں سے تھوڑی یا بہت مدد ملی ہے ان کا دل سے منت پذیر ہوں۔''(۱)

والسلام

ظلوم وجہول

عبدالباری ندوی

۲۷ر صفر ۱۳۴۷ھ

۷- مذہب وسائنس:

مولانا ڈاکٹر غلام محمد کراچوی کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

یہ کتاب گو مذہب وسائنس پر ہے، مگر چونکہ سائنس خصوصاً طبیعیات جو یہاں موضوع بحث ہے، اپنی انتہا پر فلسفہ ہی بن جاتی ہے، اس لیے فلسفیانہ تصانیف کے ذیل ہی میں ہم اس کا ذکر کررہے ہیں، یہ مولانا کے عمر کی آخری تصنیف ہے اور ان کا شاہکار ہے، بلکہ اس موضوع کے لٹریچر میں یہ چوٹی کی تصنیف ہے، اس پر مقدمہ عصر حاضر کے ماہر طبیعیات ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی صاحب کا ہے، جن کی شہادت اور تحسین کتاب کو ہر تحسین غیر سے مستغنی کرتی ہے، ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

''یوں تو میں ایک عرصہ سے واقف تھا کہ حضرت مولانا کس گہری نظر سے ان حقائق کا مطالعہ کررہے ہیں جو فلسفۂ اسلام اور سائنس کے امتزاج سے منکشف ہورہے ہیں، لیکن اس کتاب

---

(۱) دیباچہ کتاب ہذا۔

کے مسودہ کو پڑھنے کے بعد ہی پتہ چلا کہ حضرت مولانا کا مطالعہ کس قدر وسیع رہا ہے اور انھوں نے قدیم یونانی فلسفہ سے لے کر آج تک بڑے بڑے علماء اور حکماء کی اصل تصنیفوں اور مقالات سے اپنے موضوع کے متعلق کس طرح قیمتی مواد حاصل کیا ہے اور پھر اس مواد کی تحلیل اور تشریح کے بعد ایک مدلل پیرایہ میں کیسے صحیح نتائج اخذ کئے ہیں۔''(۱)

آخر میں ڈاکٹر صاحب ممدوح تحریر فرماتے ہیں:

''بہر حال جب مادیت اور دہریت کے پرستاروں کا وہ طلسم جو انھوں نے سائنس کی بنیادوں پر قائم کیا تھا ٹوٹ گیا تو پھر کائنات کی حقیقت پر غور وفکر کرنے والوں کے لیے بمصداق ''کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شد'' خدا کی ہستی پر ایمان لانے کے لیے نئی راہیں کھل گئیں اور کم از کم ایک ہمہ گیر آفاقی ذہن (Universal Mind) کو تسلیم کرنا ناگزیر ہوگیا، حضرت مولانا عبدالباری ندوی نے اس حقیقت کو اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان اصحاب کے لیے جو سائنس اور ٹکنالوجی کی حالیہ غیر معمولی ترقی سے مرعوب اور متاثر ہوکر ایمان کی کمزوری کا شکار ہورہے ہیں یقین محکم حاصل کرنے اور دنیا وآخرت میں نجات پانے کا سامان مہیا کیا ہے، اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا کا یہ ایک نہایت اہم اور قابل تحسین کارنامہ ہے جو انھوں نے اس کبرسنی میں اس قدر محنت شاقہ برداشت کرکے انجام دیا ہے۔''(۲)

---

(۱) مذہب وسائنس صفحات ۳۳ و ۴۷ (۲) ایضاً

اس معرکۃ الآراء تصنیف کے متعلق قابل اظہار بات یہ بھی ہے کہ یہ ایک ایسے سچے اور پکے مسلمان فلسفی اور ماہر طبیعیات کی ادعائی تصنیف ہے جو بیک وقت مادی کائنات کی حقیقت اور ماورائے عقل اور حواس عالم کے حقائق کا واقف کار تھا اور زمان و مکان کے بھید کو سمجھتا تھا جو صحیح معنوں میں ؎

بہ جلوت اند کمندے بہ مہر و مہ پیچند
بہ خلوت زمان و مکاں در آغوش اند

کا مصداق تھا۔

میرے لیے یہ بات وجہ سعادت و شرف ہے کہ مولانا کی اس شاہکار تصنیف کی صورت گری یعنی تربیت و عنوان بندی میں مولانا نے شامل فرمالیا تھا(۱) اور بحمد اللہ خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہونا میسر آیا، مولانا کے مکتوب مؤرخہ ۲۲ر جون ۱۹۷۲ء کا ضروری اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''لیجئے اتنی خوشخبری تو سن ہی لیجئے کہ وہ کتاب جس پر آپ نے بھی خاص محنت فرمائی تھی، کسی نہ کسی طرح ''مذہب و سائنس'' کے نام سے چھپ کر مجھ تک دو نسخے تو پہنچ ہی چکے ہیں..... مجھ کو سب سے زیادہ شرمندگی اس کی ہے کہ کچھ تشکر کے سلسلہ میں میں نے آپ کا بھی شکریہ ایک دو لفظوں میں ادا کر دیا تھا، وہ سرے سے تشکر کے عنوان سے غائب ہو گیا ہے۔''

---

(۱) مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے تو لکھا ہی تھا کہ مذہب و سائنس کے مسودہ کی صورت گری کی خدمت انجام دوں مگر اس کے ساتھ ساتھ خود مخدومی ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی صاحب کو بھی ہدایت دی تھی کہ وہ مقدمہ تحریر فرما کر مسودہ مجھ کو بھیج دیں، ڈاکٹر صاحب ممدوح نے اس کا اتنا اہتمام فرمایا کہ اسلام آباد سے کراچی کا سفر کر کے غریب خانہ پر تشریف لائے اور دست بدست کتاب کا مسودہ میرے حوالہ فرمایا اور تاکید فرمائی کہ حضرت مولانا کے ارشاد کی تعمیل کر کے اس بیش بہا مسودہ کو میں ڈاک سے نہیں بلکہ اعتماد کے کسی جانے والے کے ہاتھ لکھنؤ بھجوادوں۔ (غلام محمدؒ)

۸- کلامیاتِ سائنس:

مولانا کی یہ کتاب مکمل تو ہوگئی تھی مگر نظر ثانی باقی تھی اس لیے چھپنے سے رہ گئی، ۶ راگست ۱۹۶۹ء کے الطاف نامے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''آج کل تو آپ کی یاد بے طرح ایک دینی غرض سے آرہی ہے، ''کلامیاتِ سائنس'' کو مکمل ہوئے ایک سال ہوتا ہے، اور چھ سات مہینے ولایت (۱) میں پڑی رہی، اب تین چار دن پہلے علی میاں نے آکر اپنے مسمع کو ساتھ لاکر، از اول تا آخر سماعت فرمائی، ان کی رائے یہ ہے کہ اس حصہ کو ''کلامیات قرآن'' کی تکمیل تک روکا نہ جائے، لیکن ایک بڑا مرحلہ عنوانات قائم کرنے کا ہے، اور اس معاملہ میں ''نظام صلاح واصلاح'' میں آپ کی عنوان بندیوں نے مجھ کو اس بارے میں آپ کا بہت معتقد کر دیا ہے۔''

اب معلوم نہیں کہ مولانا کی یہ قیمتی تصنیف کہاں ہے، محفوظ بھی ہے یا نہیں؟

۹- اسباق زندگی:

''اسباق زندگی'' (۲) کے نام سے مولانا نے ایک مضمون تحریر فرمایا تھا، اس میں نفس فلسفہ کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ:

''فلسفہ کو اگر اس کے اصل موضوع ومقصد، تلاش حقیقت کے بجائے صرف فلسفی یا ڈاکٹر و پروفیسر بننے بنانے کے لیے نہ پڑھایا

---

(۱) یہ لفظ سمجھ میں نہیں آیا، یا تو کلامیات سائنس کا مسودہ لندن کسی کے پاس بھجوایا ہوگا، اس کا ذکر ہے یا پھر لفظ کچھ اور ہے۔ (غلام محمدؒ)

(۲) یہ مضمون معلوم نہیں کہاں چھپا مگر مولانا نے اس کی قلمی نقل مجھے بھیج دی تھی جو محفوظ ہے۔ (غلام محمدؒ)

جائے تو خاص عقل کی راہ سے ''فلسفہ'' خصوصاً جدید فلسفہ سے زیادہ خدا تک پہنچنے والا کوئی دوسرا علم قطعاً نہیں، البتہ نرا کتابی فلسفی اسی طرح ''خطرۂ ایمان'' ہے، جس طرح ''نیم حکیم خطرۂ جان۔''

تنہا یہ رائے ہی مولانا کے حقیقی بلند پایہ فلسفی اور ماہر استاذ فلسفہ ہونے پر شاہد ہے۔''(۱)

۱۰- تجدید دین کامل:

۴۶۴ صفحات کی یہ کتاب مولانا عبدالباری ندوی کی سلسلہ تجدید کی کتابوں کی پہلی کتاب ہے، جسے انھوں نے ''جامع المجدد ین'' کا نام دیا تھا، لیکن جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اس نام سے لوگوں کو الجھاؤ پیدا ہو رہا ہے تو انھوں نے اس کا نام بدل کر ''تجدید دین کامل'' رکھ دیا، جس میں انھوں نے اپنے شیخ و مربی اور زمانہ کے مجدد و حکیم حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی اصلاحی و تجدیدی کاموں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اسلامی تعلیمات کے تعلق سے تجدید و اصلاح کا ہمہ گیر کام لیا ہے، اس طرح مختلف زمانوں کے مجدّ دین دین نے الگ الگ میدانوں میں تجدید کا کام لیا، حضرت حکیم الامت نے ان تمام میدانوں میں بذات خود کارہائے نمایاں انجام دیئے، اور معاشرہ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا، اس طرح وہ مجدد تعلیم و دعوت بھی ہوئے اور مجدد معاشرت بھی اور مجدد صلاح و اصلاح اور مجدد تصوف و سلوک بھی، مزید مجدد معاشیات و اقتصادیات بھی، مولانا عبدالباری ندوی نے تعلیمات تھانوی میں غوطہ زنی کر کے موتی نکالنے کا کام کیا، اور اپنی بات ثابت کرنے کی طاقتور کوشش کی ہے، یہ کتاب حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ جب سامنے آئی تو لوگ دم بخود رہ گئے، اور مولانا

---

(۱) تعمیر حیات ۱۰ر جون ۱۹۸۹ء مضمون ڈاکٹر غلام محمد صاحب کراچی۔

عبدالباری ندوی کے فاضلانہ ومحققانہ اسلوب کی داد دیئے بغیر نہ رہے، اس کتاب نے بھی شکوک وشبہات کے دور کرنے کا بڑا کام کیا، البتہ یہ الگ بحث ہے کہ وہ تمام میدانوں میں تنہا مجدد تھے یا اپنے زمانہ کے مجددین کی جماعت کے ایک عظیم فرد تھے، ہاں یہ ضرور ہے کہ تصوف وسلوک اور معاشرت کے میدان میں ان کی تجدیدی خدمات تسلیم شدہ ہیں، البتہ مصنف کی رائے سے اتفاق کرنے والوں میں ایک اہم نام مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ہے، انھوں نے کتاب کی قیمت واہمیت پر بڑی جامعیت اور توازن واعتدال سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''اس میں مؤلف نے حضرت والا کی ان تجدیدی و اصلاحی کوششوں کو جو امت مرحومہ کی ہر نوع و ہر صنف کے لیے مفید ہیں، پورے استقصاء کے ساتھ جمع کر دیا ہے، ان کو پڑھ کر خاص وعام ہر شخص حضرت کے ان اصلاحی کارناموں کو تجدیدی رنگ میں پاکر ان کے مجدد وقت ہونے کے قوی سے قوی تر احتمال کے ماننے پر مجبور ہوگا، اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک فضل ہے کہ حضرت والا کے ان تجدیدی کارناموں پر ایک فاضل ولائق شخص نے ظن وتخمین کو قوی کرنے کے لیے شواہد ودلائل بھی یکجا کر دیئے اور یہ ایک ایسی زبردست چیز ہے جو کسی زمانہ میں کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی، وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء.
>
> لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کسی کو یہ شبہ نہ گذرے کہ اس تحریر یا تالیف کا مدعا کسی شخص کی مجددیت کے دعوی کی تشہیر یا منصب تجدید کی دعوت وتلقین ہے، بلکہ یہ مؤلف کی عقیدت مندانہ تعبیر ہے کہ وہ حضرت کی اصلاحی مساعی کو تجدیدات کے نام سے یاد

کرتے ہیں۔"(۱)

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۵۰ء میں طبع ہوئی جس پر بڑے گرانقدر تأثرات سامنے آئے پھر بار بار چھپی، ایک اہم تأثر مدیر "فاران" کراچی جناب ماہر القادری کا ملاحظہ ہو:

مولانا ماہر القادری کا تبصرہ ہے:

"جامع المجد دین میں ارشاد و ہدایت کے پھول اور دانش و حکمت کے موتی ہر صفحہ پر بکھرے ہوئے ہیں، دینی کوتاہیوں اور بیماریوں کی نشاندہی کی گئی ہے، اور ساتھ ہی ان کے ازالہ کی کارگر اور آسان تدبیریں بتائی گئی ہیں۔

جامع المجد دین شروع سے آخر تک سبقاً سبقاً پڑھنے کے قابل ہے، دین کے وہ نکتے بتائے ہیں کہ دل وجد کرنے لگتا ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے دل میں خشیت اور تواضع کے ساتھ تعلق باللہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، یہ کتاب دین اور دنیا کی سعادتوں کا سنگم ہے۔

مولانا عبدالباری ندوی اسلامی دنیا کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ اتنی مفید اور کارآمد کتاب انھوں نے مرتب فرمادی، جس کسی نے اس کتاب (جامع المجد دین) کو نہ پڑھا اس کی حرماں نصیبی پر ہمیں افسوس ہے، یہ کتاب تو اس قابل ہے کہ اس کے لیے باقاعدہ محفلیں منعقد ہوں اور ان میں اس کو پڑھا جائے۔"(۲)

---

(۱) مقدمہ کتاب، ص/ ۲۸۔

(۲) فاران (نومبر ۱۹۵۰ء)

۱۱- تجدید تصوف وسلوک:

مولانا عبدالباری ندوی کی سلسلہ تجدید دین کی اہم ترین کتاب ہے جس میں بقول مصنف علیہ الرحمہ کے:

''تصوف سے متعلق ہر قسم کی علمی و عملی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کر کے بتلایا گیا ہے کہ حقیقی تصوف دراصل کمال اسلام اور کمال ایمان کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور بے صوفی بنے اسلام کی دنیوی واخروی، انفرادی اور اجتماعی برکات وثمرات کا حاصل ہونا عملاً ناممکن ہے۔''(۱)

مولانا نے صوفی سے مراد مومن کامل لیا ہے یعنی وہ سبھی ایمانی و اسلامی شعبوں میں احسانی کیفیت کے ساتھ رہے، اور تمام کاموں کے انجام دیتے وقت اسے یہ خیال رہے کہ وہ اللہ کے حضور میں ہے، اور اللہ کے یہاں جواب دہ ہونا ہے، اور بقول مولانا عبداللہ عباس ندوی کے:

''مولانا نے اس کتاب میں تصوف کی حقیقت یہ بتائی ہے کہ ''یہ فقہ باطن ہے'' جو فقہ ظاہر سے زیادہ اہمیت کا مستحق ہے، اذکار و اشغال کی کیا حقیقت ہے، مجاہدات کا کیا مطلب ہے، بیعت و ارادت کیوں اور کس حد تک اور کس منزل پر ضروری ہے، عشق و محبت کا دعویٰ بغیر عمل صالح کے لغو ہے، امانت کا اصل مفہوم کیا ہے؟ غرض اس کتاب میں اصولی باتیں ہیں جن کو ملفوظات اور مکاتیب تھانوی سے استفادہ کر کے مرتب کیا گیا ہے، تقریباً ۵۰۰/صفحات پر یہ کتاب پہلی مرتبہ چھپی تھی۔''(۲)

---

(۱) سرورق کتاب ہذا (۲) ایضاً (جدید ایڈیشن)

کتاب کا جدید ایڈیشن ۳۶۹ رصفحات پر مشتمل ہے جسے منظر عام پر مولانا کے ہی صاحبزادگان لائے ہیں، چونکہ اس میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تعلیمات کو سامنے رکھ کر تصوف کے مباحث سے بحث کی گئی ہے کہ درجہ احسان پر فائز ہونے کے بعد کیسے کیسے احوال سے سالک گذرتا ہے، حضرت حکیم الامت نے جس بلیغ انداز میں اس کو واضح کیا ہے، اس کو نئے اسلوب میں ڈھالنے کا کام ان ہی کے نامور خلیفہ مولانا عبدالباری ندوی نے انجام دیا، اور بطور مقدمہ کے اپنے فائق معاصر مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون شامل کیا، جس کا عنوان ہے ''حقیقت تصوف کا مکتشف اعظم اور فن حصول احسان وتقوی کا مجدد کامل'' اس میں شبہ میں نہیں کہ اس شعبہ دین متین اور فن احسان وسلوک میں ان کی تجدیدی خدمات کو ان کے نامور معاصرین جنہیں خود اس شعبہ میں یدطولیٰ حاصل تھا اور انھوں نے دریائے معرفت میں غواصی کی تھی، جیسے حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی اور حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری نے بھی انھیں تصوف وسلوک کا مجدد کہا، اسی مجدد ملت کی اس سے متعلق تعلیمات کا خلاصہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے، جس کے مرکزی موضوعات یہ ہیں:

۱- تصوف کی حقیقت۔

۲- اذکار واشغال اور مجاہدات۔

۳- بیعت وارادت۔

۴- عشق ومحبت۔

۵- باطنیت (یعنی اخفائے حال)۔

۶- وحدۃ الوجود۔

۷- قرب مطلوب۔

۸- سلوک وتربیت۔

۹- تربیت السالک۔

۱۰- حیات طیبہ۔

۱۱- بعض اکابر تصوف کی بدنامی کی حقیقت وغیرہ۔

مصنف کتاب اپنی اس پیشکش کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''تصوف نام دراصل دین کی روح ومعنی یا کیف وکمال کا ہے، مگر بدقسمتی سے دین کے تمام شعبوں سے زیادہ تو برتو غلطیاں بلکہ گمراہیاں اسی میں سرایت کر گئیں، جس کی بدولت رہا سہا دین بھی معنویت سے خالی بے جان وبے کیف ہوکر رہ گیا۔

حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا شاہ اشرف علی نور اللہ مرقدہ کی تجدیدی خدمات وتوجہات کا بڑا حصہ بھی دین کے اس کیف وکمال (تصوف) ہی کی تجدید وتحقیق کے حصہ میں آیا ہے، اور الحمد للہ کہ راقم احقر کے اس ''سلسلہ تجدید'' میں بھی یہ پوری کی پوری ایک کتاب (تصوف) کے حصہ میں آئی، جو ضخامت میں چاروں کتابوں کے ایک ثلث سے بھی زیادہ ہی ہوگی، پھر بھی ع

''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''

بلکہ حق یہ ہے کہ یہ نااہل سب سے زیادہ اسی حصہ کی تحریر کا نااہل تھا، تاہم حق تعالیٰ کی بڑی نعمت کا بڑا کفران ہوگا اگر اس بے پایاں فضل واحسان کا اقرار نہ کیا جائے کہ قلم تو بے شبہ اسی نااہل کے ہاتھ میں تھا، باقی سارے دوران تحریر میں تائیدات غیبی کا علانیہ مشاہدہ رہا۔ وما ذلك على الله بعزيز. ع

''دادحق را قابلیت شرط نیست''

اورالحمد للہ حمداً کثیراً کہ ان اوراق کے دامن میں اسی غیبی نصرت کی بدولت اسلامی تصوف وسلوک کے اصول وفروع اور تعلیم وتربیت سے متعلق ایسا جامع مستند ومحققانہ ذخیرہ ہزاروں اوراق کی ورق گردانی اور اخذ واستنباط سے جمع ہوگیا ہے کہ بے تکلف عرض کیا جاسکتا ہے کہ کسی اسلامی وغیر اسلامی زبان میں ایسی جامعیت واحاطت تحقیق وتنقید کا کوئی مجموعہ موجود نہیں، کاش کوئی سعادت مند قلم اس کی تلخیص ہی کو عربی وانگریزی کا جامہ پہنا دیتا تو اپنے پرائے سب اسلامی تصوف کے جمال و کمال کو جان و پہچان کر پھر نہ اس پر بدعت ورہبانیت کا دھوکہ کھاتے نہ جوگ واشراقیت کا، اور خدا چاہتا تو مغربی محققین و مستشرقین کی بھی آنکھیں کھل جاتیں۔''(۱)

بلاشبہ مولانا عبدالباری ندوی کے عظیم کارناموں میں یہ کتاب ایک کارنامہ ہے، عربوں کے لیے ضرورت محسوس کرتے ہوئے تعریب کا کام موجودہ ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے حصہ میں آیا ہے، جو''المنهج الإسلامی لتربية النفس'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے، مزید''بين التصوف والحياة'' کے نام سے بعض مکتبوں نے شائع کیا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ لکھتے ہیں:

''تجدید تصوف وسلوک کا ترجمہ کسی قدر اختصار کے ساتھ عربی میں بھی ہوا، یہ خدمت میرے بھانجہ مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی نے انجام دی، میں نے اس پر مقدمہ لکھا جو کئی جگہ نقل

---

(۱) از دیباچہ کتاب ہذا۔

ہوا، پھر میں نے اسی کو اپنی کتاب "ربانیة لا رهبانیة" کا مقدمہ بنایا، عربی ترجمہ دمشق سے شائع ہوا، اور اس سے ترکی میں ترجمہ کیا گیا، مولانا نے دونوں ترجموں کو اپنی زندگی میں دیکھ لیا اور اپنی آواز کو بلاد عرب اور ترکی میں سن کر بہت خوش ہوئے۔"(۱)

۱۲- تجدید تعلیم وتبلیغ:

اس میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی اجتماعی وسماجی افکار وتعلیمات کا نچوڑ پیش کر کے ان کی اس پہلو سے بھی تجدیدی واصلاحی خدمات کو مصنف نے اجاگر کیا ہے، یہ بھی ان کے سلسلہ تجدید کی اہم کتاب ہے، مولانا عبداللہ عباس ندوی اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"اس میں سب سے پہلے انسان کے اس اسلامی تصور کو واضح کیا گیا ہے جو قرآن وسنت سے مستنبط ہے، اس کے مقابلہ میں فلاسفہ یورپ نے جو کہا ہے اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، جو مولانا کا خاص مضمون تھا، اس کتاب میں تعلیم، مقصد تعلیم، طریق تعلیم، حاصل تعلیم اور تعلیم کے غلط نتائج اور اس کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے دینی تعلیم وتربیت کے گوشوں کو اجاگر کیا ہے، اس سلسلہ میں مدارس کے نظام، اسناد کی تقسیم، علماء کی غفلت اور اس کے مہلک نتائج بھی کھول کر بیان کئے ہیں، استدلال زیادہ تر حضرت تھانوی کے ملفوظات وارشادات سے ہے، اور درس وتدریس، تعلیم وتعلم، وظیفہ وچندہ کے ذکر میں

---

(۱) پرانے چراغ ۲/۱۲۴۔

ماحول اسلامی تعلیمات کے مدرسوں کا ہے۔"(۱)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تعلیمی وتبلیغی تجدیدات پر مستقل کتاب کی صورت میں "تجدید تعلیم وتبلیغ" کے عنوان سے اس کتاب میں دینی و عربی مدارس کی تعلیم وتدریس کے سلسلہ میں جن اصلاحات وتجدیدات کا ذکر آیا ہے ان میں مدارس کو اس اصلاح کی طرف بہ تاکید متوجہ کیا گیا ہے کہ نصاب درسیات میں باقاعدہ اخلاق وتصوف کی تدریس کو بھی شریک کیا جائے۔

۱۳- تجدید معاشیات:

سلسلہ تجدیدیات کی آخری کڑی ہے جو ۱۹۵۵ء میں پہلی بار شائع ہوئی، اس کے ابواب کے نام سے بحث وتحقیق کا رخ متعین ہوجاتا ہے "معاشیات عبدیت" اس میں معاشیات کی اسلامی اساس آیت کریمہ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. مَا أُرِيدُ مِنهُم مِن رِزقٍ وَّمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمون. إِنَّ اللّٰه هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو القُوَّةِ المَتِين." کی تشریح کرتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ معاش کو اللہ کی ذمہ داری اور عبادت کو اپنا فرض سمجھے، وسائل معاش مقصد حیات سے الگ کر کے تلاش نہیں کئے جاسکتے، یہ بہت اعلیٰ اور باریک مضمون ہے کہ وسائل معاش کے حصول کے ذرائع سے انکار نہیں، لیکن عبدیت یہ ہے کہ مقصد کے منافی وسائل اور مقصد کی برابری سے زیادہ وسائل رزق پر قبضہ نہ کیا جائے۔

دوسرا باب ہے "معاشیات مشیت" اس میں توحید کا مطلب، توحید مشیت، علت ومعلول کی حقیقت، تدابیر کا درجہ، محض فکری ونظری عیاشی سے نفرت "فظلتم تفکھون" سے استدلال، معاشی تنگی وفراخی کا مقصود واضح کیا گیا ہے۔

تیسرا باب ہے "معاشیات انفاق" احادیث جن میں کسب حلال کی ترغیب

---

(۱) سوانحی نقوش مولانا عبدالباری ندوی۔

دی گئی ہے ان کا مطلب "ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة" کی صحیح تفسیر حضرت تھانوی کے الفاظ میں، معاش معاد سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، انسانی فطرت کا تقاضہ، انسان کی لامحدودیت، کسب وتدبیر کے حدود۔

اس طرح کے سیکڑوں ذیلی عناوین قائم کر کے مولانا تھانوی کے مواعظ و مکاتیب اور ارشادات سے پورا نظام معیشت مرتب کر دیا ہے، اور ظاہر ہے کہ مولانا نے معاشیات کے مروجہ فن پر نہیں بلکہ معاشیات کی نئی تشکیل پیش کی ہے، اس لیے ابواب وفصول اس طرح کے نہیں ہو سکتے تھے جو اس فن پر لکھی ہوئی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، جسے انھوں نے حضرت تھانویؒ کے تجدیدی یا مجددانہ انداز فکر میں ڈھالا ہے، اور یہ ایک اہم کارنامہ ہے، مولانا کے نزدیک ''انسان'' اور مقام آدمیت اور مقصد حیات، کلیدی عنوانات ہیں، اس لیے سب کچھ انسان کے لیے ہے تو خود ''انسان'' کی حقیقت اور اس کی ضرورت سے بات شروع کی جائے۔''(۱)

۱۴- قرآن کا دو آیاتی نظام صلاح واصلاح:

یہ دراصل سورۂ والعصر کی تفسیر ہے اور پورے بسط کے ساتھ اس کے مضامین کی تشریح بھی، یہ تذکیر بھی ہے اور اس میں ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے اجزاء سے ایک مکمل نظام صلاح واصلاح مرتب کر دیا گیا ہے تاکہ مسلمان اس سے عملی فائدہ اٹھا سکیں، یہ مولانا کی قرآنی بصیرت، ان کی اصلاح ملت کے سوز و درد اور ان کی حکیمانہ نظر کا جامع مرقع ہے، اس کے متعلق مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ نے صحیح فرمایا کہ ''مولانا نے اپنی اس گرانقدر پیشکش سے تمام علماء اور خادمان دین کو عبرت آموز سبق دیا ہے۔''

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی لکھتے ہیں:

---

(۱) تحریر مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی سابق پروفیسر ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ۔

''مولانا کی یوں تو تمام تصنیفات ہیرے جواہرات میں تولنے کے لائق ہیں، کیونکہ وہ سب ان کے گہرے مطالعہ ومشاہدہ احسات کا نتیجہ اور اخلاص وتقویٰ اور امت کی اصلاح کے جذبہ سے لکھی گئی ہیں، ان ہی کتابوں میں ''نظام صلاح واصلاح'' بھی ہے، جو دراصل سورۂ ''والعصر'' کی تفسیر ہے، تفسیر سے زیادہ تفہیم ہے، اور تفہیم سے زیادہ تبلیغ مدنظر ہے، یہ ۳۸۷ صفحات پر مشتمل کتاب جو معقولات ومنقولات کی جامع ہے، اور تذکیری پہلو اور اصلاح حال کی دعوت جس کی روح ہے، پہلی مرتبہ مجلس علمی کراچی سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی تھی۔''(۱)

۱۵- تجدید کلامیات:

مولانا عبدالباری ندوی کی یہ اہم تصنیف ان کے سلسلہ کتب تجدید دین کا چھٹا حصہ ہے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کے نام ان کے دو اہم خطوط سے اس کی اہمیت وضرورت اور اس کے لیے ان کی فکرمندی اور کوشش کی جو کیفیت معلوم ہوتی ہے وہ ذکر کی جارہی ہے۔

ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''آں مخدوم سے اپنے حق میں خصوصیت سے ایمان پر خاتمہ اور مغفرت کا بہت زیادہ ملتجی ہوں، نیز سلسلۂ تجدید دین کی چھٹی کتاب ''تجدید کلامیات'' کے نام سے تقریباً پانچ سال سے بہت سست رفتار سے چل رہی ہے، بڑی وجہ یہ ہے کہ احقر سائنس سے بالکل جاہل ہے، امید تھی کہ کالجوں، یونیورسٹیوں کے اساتذہ

---

(۱) سوانحی نقوش مولانا عبدالباری ندوی۔ از ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی

سے مدد ملے گی، لیکن ہندوستان سے پاکستان تک کوئی معتد بہ مدد دینے والا نہ ملا، پیرس میں ایک دوست ہیں (۱) ماشاء اللہ بڑے دیندار، یہاں بھی جب درمیان میں آئے تو انھیں سے کچھ مدد ملی، اور اب سائنسی حصہ مبیضہ کی صورت میں ان کو پیرس بھجوا رہا ہوں، انشاء اللہ، اور اب بحمد اللہ کلامیات قرآن کا آخری حصہ چل رہا ہے۔'' (۲)

دوسرے مکتوب کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:

''حضرت! جدید کلامیات کا دوسرا حصہ الحمد اللہ کسی طرح پورا ہو کر پیرس میں ایک دوست کو روانہ کر دیا، وہاں کے اکابر سائنسداں کی تحقیق کے لیے اب آخری حصہ زیادہ نازک اور اخروی ذمہ داری کا حصہ ''کلامیات قرآن'' کا چل رہا ہے، مگر بہت اٹک اٹک اور سست رفتار سے، اور ہمہ وقت اس دعا کے ساتھ کہ "اَللّٰھُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقّاً وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَأَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلاً وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ". ہمیں حضرت! لکھانے اور املا کرانے کی عادت نہیں ہے، پھر بھی خطوط دوسروں سے ہی لکھانے پڑتے ہیں، اس لیے عموماً کچھ طوالت ہو جاتی ہے، میں نے آنحضرت کی خدمت میں بھی کچھ طوالت سے کام لیا، میں حسن خاتمہ کے لیے کبھی کبھی دعا کے لیے عرض کرتا کراتا رہا ہوں، اب کلامیات قرآن کی تکمیل، تسہیل و تتمیم بالخیر کی دعا کا خصوصاً ملتجی ہوں۔'' (۳)

---

(۱) ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدرآبادی مرحوم (م)

(۲) مکتوب ۳؍ذی الحجہ ۸۷ھ/۳؍مارچ ۶۸ء

(۳) مکتوب لکھنؤ ۲؍ربیع الثانی ۸۸ھ/۲۹ جون ۶۸ء

تجدید کلامیات سے متعلق ایک گرانقدر رائے

مولانا ڈاکٹر غلام محمد کراچوی مؤلف ''تذکرہ سلیمان'' کا تاثر ملاحظہ ہو:

''سلسلہ تجدید کی یہ آخری اور اہم ترین کڑی ہے، اس اعتبار سے بھی کہ ''کلامیات'' مولانا کا خاص موضوع تھا اور اس جہت سے بھی کہ جدید علم کلام وقت کا مطالبہ ہے، یہ تصنیف مولانا نے مکمل فرمالی تھی مگر چھپ نہ سکی تھی، ۱۰؍دسمبر ۱۹۶۸ء کے ایک مکرمت نامہ میں مولانا نے اس عاجز کو تحریر فرمایا تھا:

''اگر آپ سے چند ماہ بھی قرب کی کوئی صورت نکل سکتی کہ میں ہی کسی طرح سفر کر کے اور آپ کے پاس یا آپ کے قریب قیام کرتا اور کم از کم تجدید کلامیات کے سیکڑوں صفحات کی نظر ثانی آپ سے کراتا..... مجھ کو اب اپنی حد تک معنوی اعتبار سے تو کچھ زیادہ اپنی تحریروں سے بے اطمینانی نہیں لیکن تعبیری حیثیت سے کسی آپ ہی کے سے بے تکلف دوست کو لفظاً لفظاً نظر ثانی کی زحمت دینے کا جی چاہتا ہے۔''

یہ مولانا کی قدر افزائی و ذرہ نوازی تھی، افسوس اس کا ہے کہ یہ تصنیف غیر مطبوعہ رہ گئی۔'' (۱)

تجدیدی تصانیف کا اسلوب

''تجدید تصانیف میں مولانا کا اسلوب نگارش وہ نہیں جو ان کی فلسفیانہ تصانیف کا ہے، یعنی ان میں جدید نفسیات اور فلسفہ سے

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰؍جولائی ۱۹۸۹ء

تقابل کے ساتھ حضرت اقدس تھانوی کے گہرے نفسیاتی اور فلسفیانہ امتیاز کو آشکار نہیں کیا گیا ہے اور تقابلی اظہار میں مولانا کی جو استدلالی زبان اور طرز بیان ہے وہ یہاں نہیں ملتا، راقم عاجز کا خیال ہے کہ اگر مولانا کا عمومی اسلوب ان تصانیف میں بھی قائم رہتا تو تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے تجدیدی تصانیف میں زیادہ کشش پیدا ہوتی۔

دراصل ان تصانیف میں مولانا پر حضرت تھانویؒ کی عظمت کا اس قدر غلبہ ہے کہ ان کا اسلوب تحریر تک اس سے متاثر ہوگیا ہے۔"(۱)

سلسلۂ تجدید کی کتابوں کا امتیاز

مولانا ڈاکٹر غلام محمد مؤلف "تذکرہ سلیمان" سلسلہ تجدید کی تصانیف پر تبصرہ اس طرح کرتے ہیں:

"باقی ان تصانیف کا امتیاز ہے کہ حضرت مجدد تھانویؒ کی تعلیمات کا اس قدر مرتب تحلیلی مطالعہ اور ان کے علوم کی اس قدر صحیح تشریح و ترجمانی، نہ اس سے قبل کسی نے کی تھی، نہ آج تک کسی اور سے بن آئی ہے، حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت تھانویؒ کے مسلک ومشرب کو صحیح طور پر سمجھنا ہو تو مولانا عبدالباری ندوی کی ان تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہئے، مولانا سید فضل اللہ صاحب (صاحب "فضل اللہ الصمد فی شرح الأدب المفرد" پروفیسر حدیث جامعہ عثمانیہ) مجھ سے فرماتے تھے کہ مولانا عبدالباری صاحبؒ نے حضرت تھانویؒ کے علوم کو

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر جولائی ۱۹۸۹ء

اپنی ان تصانیف میں جس بلندی تک ظاہر کیا ہے اس کا اندازہ
اہل علم ہی لگا سکتے ہیں۔" (۱)

ایک تبصرہ

سلسلۂ تجدید کی کتابیں جب مولانا عبدالباری ندوی کے قلم سے نکلیں تو قارئین کے مثبت اور منفی دونوں تاثرات سامنے آئے، ایک طبقہ نے یہ محسوس کیا کہ وہ ہر خیر کو حضرت تھانوی کی ہی طرف راجع کرنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ ہندوستان کے مؤقر اور وقیع علمی اور تحقیقی رسالہ ماہنامہ "برہان" دہلی میں ممتاز اور بالغ نظر عالم و محقق مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس پر ایک ریویو شائع کیا، اور حلقہ تھانوی کو چھوڑ کر دوسرے حلقوں کی طرف سے بھی دبی دبی آواز اٹھی، البتہ ندوۃ العلماء کے فضلاء و محققین نے مولانا عبدالباری صاحب کا دفاع کرتے ہوئے یہ حقیقت آشکارا کی کہ ان کا مقصد حضرت تھانوی کو شیخ الکل فی الکل ثابت کرنا نہیں ہے، بلکہ دین کے مختلف شعبوں عقائد و عبادات، معاملات و معاشرت اور اخلاق میں جو جو مفاسد، امراض، کوتاہیاں اور کمزوریاں ہمارے اندر گھر کر گئی ہیں، ان کا اجمالی جائزہ لے کر اصلاح کی ایسی آسان اور اختیاری تدابیر کو جمع کرنا ہے، جن پر عمل کر کے مسلمان از سر نو اسلامی زندگی کی دینی و دنیوی برکات و ثمرات سے مالا مال ہو سکتے ہیں، جس کی وضاحت خود مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے بھی کر دی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ان کتابوں کی تصنیف کے زمانہ میں مولانا عبدالباری صاحب کے ساتھ حکیم الامت حضرت تھانوی کی ہی کتابوں کا ذخیرہ تھا اور بس، اس لیے ان ہی کے حوالے نظر آئے، ان ہی کی تلقینات کا شواہد و دلائل سے اثبات اور ان ہی میں تمام مسائل کا حل ناظرین سامنے پائیں گے، اگر مصنف کے

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر جولائی ۱۹۸۹ء

سامنے دوسرے مصلحین امت کی بھی خدمات، ارشادات اور تصنیفات ہوتیں تو سلسلۂ تجدید کی کتابوں کا افادہ محدود نہ رہتا، وسیع سے وسیع تر ہوتا، ایک ایک شیخ ومربی اور معلم ومصلح کے اٹھنے کے بعد جب مولانا عبدالباری صاحب نے ایک دوسرے عظیم مصلح ومربی اور جلیل القدر عالم ومحدث حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی سے رابطہ قائم کیا، اور استفادہ کرنا چاہا تو وہ اپنے ان مربی کے سامنے اس تاثر کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے، چنانچہ وہ حضرت شیخ علیہ الرحمہ کو اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''احقر کا خیال ہے کہ انھیں (والد صاحب) کی خواہش اور دعاء نے تھانوی قدموں تک پہنچایا اور وہاں پہنچ کر وہ کچھ دیکھا اور پایا کہ یہ یقین رہا کہ اس ذات گرامی کا ثانی غالباً ساری دنیا میں نہ ہوگا، پھر اس خیال کی تصحیح ''خوان خلیل'' نے فرمائی کہ ساری دنیا کا کیا ذکر ہے چند قدم ہی پر بالکل ''ثانی اثنین'' موجود ہے، بلکہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے مثنیٰ ہیں، کیا عرض کروں حضرت مثنیٰ کا لفظ بھی مجھے ذرا کم ہی معلوم ہوتا ہے، ورنہ جن علوم ومعارف سے سالہا سال تھانہ بھون میں مانوس وفیضیاب رہا، اس کم علم وکم نظر کو اس ''خوان خلیل'' میں بالکل اور ہو بہو پایا، اور جب تک پڑھتا رہا یہی معلوم ہوتا رہا کہ تھانوی مجالس وملفوظات ہی میں حاضر ہوں اور پڑھ رہا ہوں، سچ یہ ہے کہ میرے لیے ان دونوں حضرات میں اب کوئی فرق وتمیز کرنا دشوار ہو گیا ہے، کاش ''خوان خلیل'' کے کچھ اور لقمے نصیب ہوتے تو مجالس وملفوظات تھانوی سے محرومی کے احساس کی کچھ تلافی ہوتی رہتی، حضرت تھانوی کی مجالس وملفوظات سے تو لوگوں نے ہزاروں صفحات

جمع کردیئے ہیں، کیا ''خوان خلیل'' کے لقموں کو بھی کہیں اور کسی نے جمع کر کے شائع فرمایا ہے کہ مزید استفادہ کے لیے ان کو حاصل کرلوں؟''(۱)

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی سے بالمشافہ اوران کے مربی واستاد مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی سے ان کی تصنیفات وافادات سے استفادہ کے بعد کا تاثر ان کی ذہنی وسعت اور حقیقت پسندانہ طبیعت کی صاف طور پر عکاسی کرتا ہے، اوراس سے ان شبہات کا ازالہ ہوجاتا ہے جوان کی تصنیفات کے مطالعہ کے بعد بعض اہل نظر کو پیدا ہونے لگ گئے تھے، خصوصاً ان کی کتاب ''جامع المجد دین'' کے مطالعہ سے جس کا نام انھوں نے بعض مخلصین کے مشورہ سے بدل کر ''تجدید دین کامل'' کردیا تھا، مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے ان شبہات واعتراضات کا جو جواب دیا ہے، اس سے صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے، وہ ملاحظہ ہو:

''حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے اس کتاب میں حضرت تھانوی کے تجدیدی کارناموں کا خلاصہ پیش کیا ہے، یہ کتاب ایک طرح سے تعلیمات وارشادات تھانوی کا انسائیکلوپیڈیا ہے، البتہ اس کتاب کے نام ''جامع المجد دین'' پر اہل علم کو اعتراض رہا ہے، ان کا کہنا ہے کہ جامع المجد دین تو اللہ کی صفت ہوسکتی ہے، کہ قیامت کے روز تمام مجددوں کو یکجا کردے گا اور مجددین پر کیا موقوف ہے، انبیاء، صلحاء، اور عام بندے سب کا جامع وہی ہے، وھو علی جمعھم إذا یشاء قدیر.

مولانا نے غالباً اس طرح کے اعتراضات کی بناء پر اس کا نام

---

(۱) مکتوبات حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ حصہ دوم ص/۱۰۵ مرتبہ: ڈاکٹر محمد اسماعیل میمنی

بدل کر ''تجدید دین کامل'' کر دیا تھا، لیکن سچ پوچھئے تو اعتراض بے جا تھا، یہ اردو کی عربی نما ترکیب ہے، جس کا مطلب واضح ہے کہ تمام مجددین میں جو صفات وخصوصیات تھیں آپ ان کے جامع تھے، جیسے نعت کا مشہور شعر ہے ع

حسن یوسف ، دم عیسیٰ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں، ہمہ دارند تو تنہا داری

اس طرح مجددین سلف میں سے کسی نے تزکیۂ قلب کے اندر، مقام امتیاز پایا، کسی نے اصلاح نفس میں کارہائے نمایاں انجام دیا، کسی نے تعلیم وتربیت میں اختصاص حاصل کیا، لیکن حضرت تھانوی نے تنہا ان تمام گوشوں کو اجاگر کیا، مولانا نے کتاب کا نام بدل کر یہ واضح کر دیا کہ ان کے اندر صرف اصلاح کا جذبہ تھا، وہ لفظی موشگافیوں سے بچنا چاہتے تھے، ورنہ اپنی بات پر اَڑ سکتے تھے، اور اصرار کر سکتے تھے کہ ان کا تجویز کردہ نام غلط نہ تھا۔''(۱)

بعض دوسرے اعتراضات واشکالات کو سامنے رکھ کر جواب دیتے ہیں:

''جامع المجددین (یعنی جامع اوصاف المجددین)'' تجدید معاشیات، تجدید تصوف وسلوک، تجدید تعلیم وتبلیغ، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا پر وہ غلبۂ حال تھا کہ عصر حاضر کی تمام تر الجھنوں، مشکلات، مادی، علمی وروحانی مصائب کا حل، شفاخانۂ تھانہ بھون سے حاصل کرنے کی ترغیب دیتے رہے، اور اگر ان کتابوں کا سنجیدگی سے، عصبیت وخودرائی سے

(۱) سوانحی نقوش مولانا عبدالباری ندوی۔ از ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی

بے نیاز ہوکر مطالعہ کیجئے تو بات معقول اور برمحل نظر آئے گی، صرف یہ ملحوظ رہے کہ مولانا عبدالباری ندوی نے حصر سے کام نہیں لیا ہے، کہ نجات کا ذریعہ اور مشکلات کا حل صرف اور صرف اسی راہ میں ہے، جس کے نقوش حضرت تھانوی نے چھوڑے ہیں، مولانا کا منشایہ ہے کہ ان کے علم و تجربہ قدیم و جدید کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ حضرت تھانوی کا طریقہ ایک بہترین سہل الوصول اور اقرب ترین راستہ ہے، اس میں نہ کسی ''سلسلہ'' کا انکار ہے، اور نہ کسی طریقہ کی نفی، جہاں تک حصر وقصر کا تعلق ہے، وہ صرف اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، راقم سمجھتا ہے کہ اس نکتہ کی وضاحت ضروری تھی، کیونکہ حضرت مولانا عبدالباری ندوی کی جب یہ کتابیں نکلی ہیں، اس وقت مجھے یاد ہے، بعض ایسے اہل قلم نے جن کا علمی سلسلۂ نسب دیوبند ہی سے ملتا ہے، اس پر معترض تھے، اور اعتراض کا نشانہ یہی تھا، کہ مولانا عبدالباری صاحب طریقہ تھانوی کے علاوہ ہر طریقہ کو ناقص اور قابل اصلاح سمجھتے ہیں، حالانکہ بات قطعاً ایسی نہیں تھی اور نہ ہے۔''(۱)

---

(۱) سوانحی نقوش مولانا عبدالباری ندوی۔ از ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی نے چند اہم تصنیفات کے نام مع سنین اشاعت دیئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱-مبادی علم انسانی (۱۹۱۸ء) ۲-مذہب وعقلیات (۱۹۱۹ء) ۳-برکلے (۱۹۱۹ء) ۴-علم اخلاق (۱۹۲۳ء) ۵-حدیقۂ نفسیات (۱۹۲۸ء) ۶-مقدمہ مابعد الطبعیات (۱۹۳۱ء) ۷-اخلاقیات (۱۹۳۲ء) ۸-طریق اور تفکرات (۱۹۳۲ء) ۹-فلسفۂ نتائجیت (۱۹۳۷ء) ۱۰-فہم انسانی (۱۹۳۸ء) ۱۱-نباتیات (۱۹۳۸ء) ۱۲-تجدید تصوف وسلوک (۱۹۴۹ء) ۱۳-جامع المجددین (۱۹۵۰ء) ۱۴-تجدید تعلیم وتبلیغ (۱۹۵۱ء) ۱۵-تجدید معاشیات (۱۹۵۵ء) ۱۶-تفسیر نظام صلاح واصلاح (۱۹۶۴ء)۔ (معارف: مارچ ۱۹۷۶ء)۔

باب دہم

چند مایہ ناز مگر بے تکلف رفقاء واحباب

۱- علامہ سید سلیمان ندویؒ:

علامہ سید سلیمان ندوی ان شخصیات میں ہیں جن سے مولانا عبدالباری ندوی کو گہرا تعلق اور حد درجہ محبت وعقیدت تھی، ان کو بھی مولانا سے نہ صرف محبت وتعلق تھا بلکہ ان کی صلاحیتوں پر بھرپور اعتماد تھا، اسی لیے انھوں نے مولانا کو اپنی جگہ دکن کالج پونا میں دعوت دی، اور سیرت النبیؐ کی تکمیل کا کام جب ان کے سپرد ہوا تو معجزات کی بحث پر قلم اپنے ان ہی عزیز رکن قافلہ سے اٹھوایا، اور ان کی اس تحریر پر ان کو بڑی داد ملی۔

ندوۃ العلماء میں وہ ممتاز فضلاء جن پر شروع سے ان کے سرپرست اور ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم علامہ شبلی نعمانیؒ کی نگاہ رہی، علامہ سید سلیمان ندوی سرفہرست تھے، اور اسی فہرست میں ایک نام مولانا عبدالباری ندوی کا تھا، چنانچہ مولانا عبدالباری ندوی نے علامہ شبلی نعمانی سے جہاں بھرپور استفادہ کیا اور ان کی نگرانی و رہنمائی میں تعلیمی مراحل طے کئے، وہیں ان کے بعد ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی استفادہ کا ربط قائم رکھا، مولانا نے ان کی صلاحیتوں کی قدر کرتے ہوئے ان کو دارالمصنفین بھی بلایا اور وہاں علمی کاموں کی سرپرستی کا کام ان کے سپرد کیا، گو وہ بعض اسباب کی بناء پر وہاں مستقل قیام نہ کر سکے، اور ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ان کو علاحدگی اختیار کرنی پڑی، دونوں کا تعلق مختلف نوعیتوں کا اور زندگی کے ہر موڑ پر بڑا ناصحانہ وخیر خواہانہ رہا، جس کو دونوں کے درمیان مکاتبت سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جو مقام وعظمت ان کے دل میں تھا اس کا اندازہ ڈاکٹر غلام محمد صاحبؒ (کراچی) جو کہ ان میں سے ایک کے مرید وخلیفہ اور دوسرے کے عزیز ترین شاگرد اور دونوں ہی کے محبوب ومنظور نظر تھے، کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے ان کے عرفانی مقام کے ضمن میں اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اپنے آپ کو اس قدر مٹایا کہ خود مٹنے کا احساس بھی جاتا رہا، فنا سے گذر کر فناء الفناء تک پہنچ گئے، مدح وذم ایک ہوگئی، مفوض کامل بن گئے، خود حضرت حکیم الامت کے متعدد خلفائے اجل مثلاً حضرت مفتی محمد حسن صاحب، مولانا محمود الغنی صاحب، حاجی محمد عثمان خاں صاحب مرحوم، مولانا عبدالباری صاحب ندوی، ڈاکٹر عبدالحی صاحب، مولانا مسیح اللہ صاحب وغیرہ کو راقم نے اس معاملہ میں ایک زبان پایا کہ حکیم الامت قدس سرہ سے فنائیت کا درس جیسے حضرت سید صاحب نے حاصل کیا اور جو کمال اس مرتبہ میں پیدا کیا وہ کہیں اور نظر نہیں آتا، مثالیں اس کی چند ہوتیں تو نقل بھی کرتا یہ تو ایک مستقل باب ہے،

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لیے (۱)

مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے ''معارف'' کے سلیمان نمبر صفحہ ۹ میں اپنے مضمون ''سیرۃ السید'' کے کچھ انمول سبق میں ان کے عرفانی مقام کے ساتھ ان کے علمی جلالت شان کا ذکر بھی بڑے اچھوتے انداز میں کرتے ہوئے نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے ارادت و استرشاد کا ربط قائم کرانے میں ان کے اضطرار کو بھی بڑی حد تک دخل تھا، اور خود انھوں

(۱) ماہنامہ القاسم علامہ سید سلیمان ندوی نمبر، نوشہرہ، پاکستان۔ مرتبہ: مولانا عبدالقیوم حقانی ص/۳۲۰

نے ہی اپنے اضطرار کو اس طرح بیان کر دیا، جس سے باہم ایک دوسرے سے تعلق ومحبت کا پتہ چلتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''آخر اپنے اس مرض ''خیر خواہی'' سے مضطر ہوکر دھیرے دھیرے ادھر متوجہ کرنا شروع ہی کر دیا، ابتداء غالباً تھانہ بھون ہی کی کسی حاضری کے دوران میں ہوئی، وہیں یہ تقاضا قلب میں تیز ہوتا جاتا تھا کہ میرے جیسے بے علموں سے زیادہ اور بہت زیادہ یہ آستانہ سید صاحب جیسے اکابر علم وقلم کے استفادہ کا ہے، کہ ان کے استفادات کا سونا یہاں کی آنچ میں انشاء اللہ کندن ہو جائے گا، الحمد للہ ایسا ہی ہوا۔''

اس ربط وتعلق کے بعد علامہ نے مولانا عبدالباری ندوی کو جو مکتوب تحریر فرمایا اس میں ان کے شکریہ کے ساتھ ایک جگہ یہ تحریر فرمایا کہ:

''بہر حال اپنی طرف سے سفر شروع کر دیا ہے، منزل پر پہنچانا جس کا کام ہے، وہ پہنچائے گا، دعا کیجئے۔''

چنانچہ بہت جلد ان کو یہ مقام حاصل ہو گیا کہ ان کے مرشد حکیم الامت حضرت تھانوی نے دس بارہ توصیفی شعر لکھ کر بھیجے، جس کے تین شعر یہ ہیں:

از سلیمان گیر اخلاص عمل — داں تو ندوی را منزہ از دغل
اے دلت معمور از اسرار حق — اے دلت مخمور از آثار حق
اے دلت پرنور از انوار حق — اے دلت مسرور از اخبار حق (۱)

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو صرف مدرسہ کا ایک عالم و فاضل اور مصنف ومترجم ہی نہیں قرار دیا، ان کو باطن کی دولت سے مالا مال اور مشرقی و مغربی فلسفہ کا ماہر بتاتے ہوئے ان کی اصلاحی تصنیفی خدمات کو موجودہ حالات کے

(۱) ملاحظہ ہو: تذکرۂ سلیمان از: ڈاکٹر غلام محمد کراچی

تناظر میں خراج تحسین اس طرح پیش کیا ہے کہ:

''ان حالات میں بڑی ضرورت تھی کہ اس اصلاح وتجدید کے خاکے کو جس کو ایک مصلح وقت اپنی تصنیفات ورسائل میں سپرد کر گیا ہے، اور جن پر زبان کی کہنگی اور طریق ادا کی قدامت کا پردہ پڑا ہے، ان کو موجودہ زمانہ کے مذاق اور تقریر وتحریر کے نئے انداز کی روشنی میں اجاگر کیا جائے، سلسلۂ تجدیدات واصلاحات کے نام سے چار جلدوں میں اسی خدمت کو انجام دیا گیا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچائے، اس وقت دنیا اور ہندوستان و پاکستان رفتار سفر کے جس موڑ پر ہے، ضرورت تھی کہ عین اسی وقت یہ فرض انجام پاتا، سو بحمد اللہ تعالیٰ وہ عین وقت پر ایک سعادت مند قلم سے انجام پا رہا ہے، یہ کتابیں مسلمانوں کی حقیقی اصلاح وترقی کے متعلق حرف اخیر کی حیثیت رکھتی ہیں، دل سربہ سجود ہے، اور ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دیں کہ وہ اس آئینہ میں اپنے خط وخال کو دیکھ کر اپنی شکل کو پہچانیں اور غلط اور گمراہ دنیا کے پیرو و مقلد بننے کے بجائے دنیا کے امام و پیشوا بنیں، اور ایک نئے تمدن، نئے طرز حیات، نئے مقصد زندگی اور نئے آئین سلطنت کی بنیاد ڈالیں۔

اور اس وقت کی غمزدہ اور مصیبت سے بھری ہوئی امن کی جویا اور سکینت کی پیاسی دنیا کو امن وسلامتی کا پیغام دیں، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی تکمیل کریں جو دنیا وآخرت کی صلاح وفلاح کی

کفیل ہو اور سیاست اور ملک داری کو حرص و ہوا، جھوٹ اور دغا،
مکر و فریب سے آزاد کریں۔" (۱)

علامہ سید سلیمان ندوی کے اس زبردست اعتراف کے بعد ان کے اس مقام کی تعیین میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے جو اللہ نے وقت کے مجدد و مصلح اور مربی اعظم کے تجدیدی و اصلاحی اور تربیتی کاموں کی تقویت و اشاعت اور اس کو افادۂ عام کے لائق بنانے میں ان کو معاون بنا کر عطا فرمایا تھا۔

مولانا عبدالباری ندوی اپنے حلقۂ احباب و رفقاء اور ندوہ و دارالمصنفین کے اکابر میں مولانا سید سلیمان ندوی کو شیخ و امام کی حیثیت سے دیکھتے تھے اور اسی لیے انھیں سید الطائفہ کہتے، اور مولانا عبدالباری صاحب کو وہ محبت و تعلق میں ان کے نام کا مخفف کر کے مولانا عباری کہہ دیا کرتے، مولانا عبدالباری صاحب نے ان سے اس زمانہ میں بھی استفادہ کیا تھا جب سید صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طالب علمی کے آخری مرحلہ سے گذر رہے تھے، اور مولانا عبدالباری ندوی کا بھی اسی ادارہ میں زمانہ طالب علمی تھا، اور دونوں ہی کے تعلیمی سرپرست استاذ الاساتذہ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ تھے، پھر اس وقت ان سے پڑھا بھی جب وہ ان کی طالب علمی کے زمانہ میں ندوہ کے استاد ہو چکے تھے۔

۲- مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ:

مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا گیلانی کا تعلق بڑا ہی دوستانہ محبانہ اور اشتراک عمل کا رہا، یہ دونوں شخصیتیں ہمدم، ہمسایہ، ہمراز و ہم خیال تھیں، جو ان کے محبوب وہ ان کے محبوب، جو ان کے بزرگ وہ ان کے بزرگ، جو ان کے چھوٹے وہ ان کے چھوٹے، دونوں ایک دوسرے کے غم میں شریک اور خوشی میں رفیق، جس شیخ

(۱) از مقدمہ تجدید دین کامل

کی روحانیت کے ایک قائل ہوئے دوسرا کا قائل ہونا ناگزیر ہوگیا، جس استاد کی قابلیت کا ان میں سے کوئی معترف ہوا تو دوسرے کو بھی ہونا پڑا، جس شخص کو ایک نے فرشتہ صفت ہستی تسلیم کیا تو دوسرے نے بھی فرشتہ صفت انسان ہونے کی گواہی دی، حج جیسا مقدس اور مہتم بالشان رکن اسلام دونوں نے ایک ساتھ ادا کیا، بس عرفات کے میدان میں باوجود ساتھ ہونے کے ایک دوسرے سے بچھڑ گئے، وہ بھی اس لیے کہ اللہ سے لو لگانے، اس سے مانگنے اور گڑگڑانے میں ایسا مستغرق ہوئے کہ اسی استغراق نے اور نظارہ رحمت الٰہی سے حیرانی میں دور ہوئے تو پھر بیت اللہ کے پاس ہی جا کر ملے، اللہ نے دونوں کو عجیب عشق و مستی، کیف و حال، شوق و ذوق، محبت و معرفت عطا کی تھی، اسی لیے دونوں اپنے کو باوجود کارہائے نمایاں انجام دینے اور علم و قابلیت میں اپنا سکہ منوا لینے کے بعد صحیح معنی میں بڑا ہی کمتر سمجھتے رہے، جبکہ یہ دونوں روئے زمین پر چلنے والے انسانوں میں بہترین تھے، عمر علامہ گیلانیؒ کی بہ نسبت مولانا ندوی کے کم ہوئی، اکائی میں نہیں دہائیوں میں، لیکن مولانا ندوی کا عمر کا آخری حصہ بستر علالت پر گذرا، البتہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دونوں کے تعلقات کی استواری کے باوجود بعض علمی مباحث میں کچھ نظریاتی اختلافات لوگوں کے سامنے آگئے، جس کی ضرب دونوں کے حساس دلوں پر پڑی، مگر دونوں کا عمل حسبۃً للہ تھا، اس لیے کچھ پرواہ نہ کی اور اپنا کام جاری رکھا، یہ ان دونوں کا نقص نہیں کمال تھا، تعلق اس قدر تھا کہ جب مولانا عبدالباری ندوی صاحب نے لکھنؤ میں مکان تعمیر کرایا تو اس کا تاریخی نام ان ہی (حضرت گیلانی) نے ''شبستان سعادت'' رکھا، اور پھر کچھ اپنا قیمتی وقت بھی اسی مکان میں گذارا، اور گذار کر بڑی فرحت محسوس کی، حیدرآباد میں تو ایک ہی حجرہ میں رہ کر یار غار ہونے کا بھی ثبوت فراہم کیا۔

مولانا عبدالباری ندویؒ نے مولانا گیلانی کی وفات کے اپنے تاثرات

''بڑا نادر سنگم - دل و دماغ دونوں کا آئینہ'' کے عنوان سے مکاتیب گیلانی کے مقدمہ کے طور پر لکھے تو اس شہادت واعتراف کا اظہار کئے بغیر نہ رہے کہ:

''۳۳-۳۴ سال اس دنیا میں ان سے دور نزدیک تعلقات کی سعادت حاصل رہی، ان میں قریباً چوتھائی صدی کی طویل و مسلسل قیام و طعام، خلوت وجلوت، سفر وحضر، صحت و مرض وغیرہ کے ہر حال میں شب وروز کی یکجائی و رفاقت کی بدولت جس طرح جتنا موقع ان کے علمی و عملی، دینی و دنیوی، ظاہری و باطنی احوال کو قریب سے دیکھنے کا نصیب رہا، یقیناً اس خوش نصیبی میں کوئی دوسرا شریک نہیں، آج ان سطروں کو سپرد قلم کرتے اور از سرنو اس طویل و مدید معیت و رفاقت کا پوری احتیاط کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ شہادت ادا کر رہا ہوں کہ مولانا مرحوم میں جو بھی کمزوریاں رہی ہوں اور معصوم کون بشر ہوتا ہے، لیکن جہاں تک دل کا تعلق ہے کہنا چاہئے کہ اس کی تمام بیماریوں سے ان کو پاک ہی پاک پایا ہے، بغض وحسد، انتقام وعداوت، ریا ونفاق، نمود ونمائش، حرص و ہوس، طولِ امد وغیرہ کے نفسانی جذبات کا کوئی داغ دھبہ یاد پر زور ڈالنے سے بھی ان کے آئینہ دل پر پڑتا خصوصاً ٹھہرتا قطعاً یاد نہیں پڑتا، ہمارے علم وقلم کے نیچے اونچے نام والے صلحاء بھی ذرا ٹھنڈے دل سے خود اپنے دلوں کا محاسبہ فرما دیکھیں تب ہی دل کی ان بیماریوں کی ہمہ گیری اور گیلانی جیسے صاحب علم وقلم کی ان سے اتنی استثنائی وکرامتی دوری کی قدر و قیمت معلوم ہوگی۔

سارے اِخلاقی رذائل یا باطنی وقلبی امراض سچ پوچھئے تو کبر و

نخوت، خود بینی وخود پرستی ہی کی شیطانی ذریت یا انڈے بچے ہوتے ہیں، مگر مولانا کی ہر شان پر غالب خودفراموشی یا فنائیت تھی، کچھ تو پیدا ہی مست وفانی ہوئے تھے، کچھ ذہانت وذکاوت کی افراط کا لازمہ بھی عموماً کچھ نہ کچھ مستی وربودگی ہی دیکھی جاتی ہے، پھر وجودی توحید جو مولانا کا خاص مذاق تھا، یہ نام ہی صحیح معنی میں ''خودی'' سے گذر جانے یا اس کے فنا ہو جانے کا ہے۔(۱)

ان کے ندوی الفکر ہونے اور ہم مذاقی کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کرتے ہیں:

''مولانا پڑھے تو ''دیوبند'' میں تھے لیکن پیدا ''ندوی'' ہوئے تھے، اور اس کو دیوبند میں قدم رکھنے سے بہت پہلے ٹونک میں ان کے استاد مولانا برکات احمدؒ نے ایسا بھانپ لیا تھا کہ خود مولانا ہی مزہ لے کر ان کا یہ فقرہ نقل فرمایا کرتے کہ ''شبلی کا یہ انڈا میرے ہاں کہاں سے آ گیا'' ندوہ سے باہر خالص دینی تعلیم و تربیت والوں میں شاذ ونادر ہی ایسے افراد ملیں گے جن کو حضرت اکبر کی زبان میں ندویوں کی سی ''زبان ہوشمند'' ملی ہو، یا جن کی زبان سے دین کی وکالت وحمایت کی بات جدید تعلیم کے دنیادار کان لگا کر سننا کچھ پسند کرتے ہوں، مولانا ان شاذ ونادر افراد میں فرد فرید کا درجہ رکھتے تھے، بلکہ مولانا دریابادی سلمہ کے بقول:

''ہر بڑے سے بڑے ندوی سے بڑھ کر ندوی تھے۔''(۲)

ان کے علمی کمالات میں سب سے زیادہ قدردانی ان کی قرآن فہمی کی تھی، جس کا اظہار مولانا ندوی نے یوں کیا ہے:

''حضرت گیلانی (جعل اللّٰہ فی قبرہ نوراً کما جعل فی

---

(۱) مقدمہ مکاتیب گیلانی ۱/۴۲-۴۳۔ (۲) ایضاً ۱/۵۶-۵۷۔

قلبہ نوراً) کے ذہنی ودماغی علمی وقلمی گوناگوں کمالات کسی تعریف وتعارف کے محتاج نہیں، خصوصاً اس بے علم کے قلم سے البتہ اس سلسلہ میں ایک بڑے خاص کمال کا علم واندازہ جتنا اور جیسا کہ چاہئے لوگوں کو کم ہے، وہ ان کی بہت خاص الخاص قرآن مجید کی فہم وتفہیم تھی، ان کی انفرادی وفکری بڑائیوں میں راقم ہذا کی نظر میں یہی سب سے بڑی بڑائی تھی۔'' (۱)

دوسری طرف مولانا مناظر احسن گیلانیؒ مولانا عبدالباری ندوی کے متعلق جو احساسات رکھتے ہیں وہ ان کے خلوص وصداقت کی اعلیٰ مثال ہے، جیسے کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کو ایک مکتوب میں لکھا کہ:

''مولانا عبدالباری صاحب کی حالت دن بہ دن بہت زیادہ قابل رشک بنتی جارہی ہے، میں تو ان میں ہر دن ارتقاء کی کیفیت پارہا ہوں، وہ بڑی روح اور بڑے نفس کے آدمی ہیں۔'' (۲)

اور ایک مکتوب میں مولانا عبدالباری صاحب سے ہی مخاطب ہیں:

''اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ. (۳) انشاءاللہ اب شیطان بھی آپ کے دین سے مایوس ہو چکا ہے، بلاشبہ یہ حق تعالیٰ ہی کا فضل ہے لیکن اس کے فضل کے ظہور کی شکل اللہ والوں کی صحبت ہوتی ہے، حضرت مدنیؒ کا ہاتھ پکڑنے والا اور حکیم الامت کی صحبت طیبہ سے استفادہ کرنے والا کیا محروم رہ سکتا ہے؟ اور سب سے بڑی ولایت کا سایہ تو آپ پر ان کے ہی اقدام کا سایہ ہے جن کے نیچے آپ کی جنت ہے۔'' (۴)

---

(۱) مقدمہ مکاتیب گیلانی ص/۲۷۔
(۲) ایضاً ۱/۳۵۲۔
(۳) سورۂ مائدہ/۳
(۴) مکاتیب گیلانی۔ ۱/۳۶۰۔

۳- مولانا عبدالماجد دریابادیؒ:

مولانا عبدالباری ندویؒ کے قریب ترین احباب و رفقاء میں ایک اہم بلکہ اہم ترین نام مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا ہے، جو ان کے ہم سفر، ہم مشرب، ہم مسلک اور اس سے بڑھ کر ایک دوسرے کے استاد و شاگرد بھی تھے، اور دونوں نے ہی ایک دوسرے سے الگ زبانوں اور علوم میں اتنا استفادہ کیا کہ اس میں درک اور عبور حاصل کرلیا، مولانا عبدالباری نے انگریزی سیکھی اور فلسفہ اور اس کے متعلقات میں جو مولانا دریابادی کا خاص موضوع تھا وہ استفادہ کیا کہ ان کی اس سے شناخت ہونے لگی اور اسی کے وہ ماہر قرار پا گئے، انگریزی کتابوں کے ترجمے کئے اور اسی زبان میں درس ومحاضرے دیئے، دوسری طرف مولانا دریابادی نے ان سے عربی سیکھنی شروع کی اور بہت جلد وہ کمال پیدا کرلیا کہ قرآن مجید اور عربی کی اہم ترین کتابوں، مراجع وامہات الکتب کو بآسانی اور صحیح طور پر سمجھنے لگ گئے، علوم دینیہ میں خاص طور پر قرآن مجید میں بھی استفادہ کیا تا آنکہ مفسر قرآن اور علوم دینیہ کے رمز شناس کی حیثیت سے متعارف ومشہور ہوگئے، استاد شبلی کے دونوں ہی اسیر رہے، مرشد تھانوی کے دونوں زیر سایہ آئے، مولانا مدنی کے ہاتھ میں دونوں نے ساتھ ہاتھ دیا، حج کو گئے تو دونوں ساتھ گئے، عمر تقریباً یکساں پائی، عمر کے آخری ایام دونوں کے ہی لکھنؤ میں گذرے، جو پہلے پیدا ہوا وہ دنیا سے گیا بھی پہلے، مولانا دریابادی متأخر السن تھے، وہ متأخر الوفاۃ بھی رہے، تعلقات میں بھی دونوں کا اشتراک رہا، البتہ مولانا دریابادی باوجود تفسیری کام کی وجہ سے اعتکاف کر لینے کے تمام ہی طبقات کے لوگوں سے مربوط رہے، یہ بات ان کو صحافت کی وجہ سے حاصل ہوئی، مولانا عبدالباری اس میں ان کا اشتراک نہ رکھ سکے، وہ ایک محقق مصنف تھے، اور مولانا دریابادی صحافی اور مفسر قرآن، مولانا دریابادی ان کے نامور و باکمال معاصر رہے، انھوں نے اپنے ان عظیم معاصر کو اپنی

کتاب ''معاصرین'' میں خصوصیت سے جگہ دی، اسی سے ان کے تاثرات نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہوں:

''شناساؤں اور کرم فرماؤں میں کسی کی بھی دوستی کی عمر ان سے زیادہ طویل نظر نہیں آتی، مجھ سے سن میں دو ڈھائی سال بڑے ہوں گے، دیر سے دیر ۱۹۰۸ء سے ملاقات ہے، اب ۱۹۷۲ء ہے، گویا کم سے کم ۶۴ سال دوستی کو ہوئے، ایک چھوٹا سا عجوبہ یہ بجائے خود ہے۔

رہنے والے بارہ بنکی ہی کے کسی غیر معروف قصبہ یا موضع کے ہیں، پیدائش میں تو شک ہوتا ہے قصبہ کرسی میں ہوئی، لڑکپن کا ایک بڑا حصہ قصبہ گدیا میں گذرا، غالباً میری ملاقات اسی زمانہ سے ہے، وہیں ان کے والد مولوی حکیم عبدالخالق طبیب تھے، اور چھوٹے سے تعلقہ گدیا کے ملازم تھے، دینی تعلیم نگرام میں پائی اور پھر عرصہ تک ندوہ میں رہ کر (اور شاید کچھ دن فرنگی محل میں بھی) ندوہ میں مولانا سید سلیمان، مولوی عبدالسلام وغیرہ کے زمانہ میں تھے، گو ان سے بہت نیچے، مولانا شبلی کے ہاں حاضر باشوں میں تھے، ان سے بہت مستفید ہوئے۔

پہلی ملاقات غالباً بانسہ کے عرس میں ہوئی، بانسے والے میرے تو عزیز قریب ہی تھے، یہ بھی اس وقت تک وہاں عرس میں کبھی کبھی آجاتے تھے، پھر ندوہ کی طرف سے وفد میں دریابادجون ۱۹۰۸ء میں آئے، مجھ سے راہ ورسم قائم ہوگئی، میں کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھنے آگیا تھا اور وہ ندوہ کے ہوسٹل میں تھے،

ملاقات اکثر ہوتی رہتی، اور زیادہ تر میرے ہاں آتے، علمی، ادبی، معاشرتی مذاق کا اشتراک محبت وارتباط کا باعث ہوا، کتاب وہ زیادہ نہ پڑھتے (کتاب کا کیڑا تو میں کڑھ مغز ہی تھا) البتہ ذہانت اور تیزی فکر میں یہ بہت آگے تھے، میں کتابوں، مقالوں کا خلاصہ ان سے بیان کردیتا اور وہ اس پر بحث شروع کردیتے، اصل موضوع انگریزی فلسفہ، منطق اور نفسیات تھے، اور مطالعہ گویا ہم لوگوں کا ساتھ ساتھ ہوتا رہتا، میری تشکیک اور بے دینی بڑھتی رہی، اور یہ بیچارے اپنی والی کوشش میری تسکین وتشفی کی کرتے رہتے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی کھلا ہوا دشمن اسلام مل جاتا، جیسے کوئی مشہور پادری اور اس کا مقابلہ ہم دونوں مل کر اسلام کے دفاع میں کرتے، میں نے کورس میں عربی لی تھی، اور انھیں پرائیوٹ انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا، میں نے ان سے عربی کچھ سبقاً سبقاً پڑھی، اور انھوں نے مجھ سے انگریزی، مجھے تو عربی کچھ آئی وائی نہیں، البتہ انھوں نے انگریزی مطالعہ بھر کی ضرورت بھر سیکھ لی، میں نے جب شادی کا ارادہ کیا اور شادی کر بھی ڈالی تو ان بالکل نجی معاملات گفتہ بہ وناگفتہ بہ میں بھی میرے رازدار اور شریک کار رہے، اور انھیں بھی جو واردات قلب اس سلسلہ میں پیش آئے تو ان میں وہ اپنے اعتماد سے مجھے نوازتے رہے، لکھنؤ میں میرا قیام مستقل تھا، ان کا اکثر باہر رہنا ہونے لگا، کبھی اعظم گڑھ، کبھی پونا، کبھی بمبئی وغیرہ، جب کبھی باہر سے آتے میرے ہی ہاں ٹھہرتے، اور میں

کبھی کبھی اپنے بدنفسی سے میزبانی کے فرائض بھی ٹال جاتا، برسوں بعد جب حج کو روانہ ہوا (۱۹۲۹ء میں)(۱) تو یہ بھی مع اپنے والدین اور چھوٹے سے قافلہ کے میرے ساتھ ہی چلے اور ساتھ رہے، اسی طرح اپنی پہلی شادی کی تو میرے صلاح ومشورہ سے، اور میرے دور کے ایک سسرالی عزیز کے ہاں۔

میری اکثر باتوں پر مجھے بڑے اچھے انداز میں ٹوک دیتے اور میں ان کا احسان مند ہوں کہ بعض خانگی معاملات میں انھوں نے مجھے زیادتیوں سے روکے رکھا، اور والد مرحوم کے زمانہ میں ان کی نافرمانیوں کی راہ میں بہت دور تک جانے سے باز رکھا، اور میں نے اگر ان کی رائے پر عمل نہ کیا ہوتا تو بڑی خرابیوں میں پڑ گیا ہوتا، جولائی ۱۹۲۸ء میں جب ہم تلاش مرشد میں نکلے ہیں اور سہارنپور گئے ہیں تو یہ میرے رفیق طریق تھے، ضابطہ سے جو تعلق مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ہوا اور عملاً جو تعلق اصلاح مولانا تھانوی سے رہا، اس میں یہ میرے ساتھی اور ساجھی رہے۔

دنیا بہرحال دنیا ہی ہے، جنت نہیں ہے، یہاں کسی تعلق کو بھی سو فیصدی اور دائمی ہمواری نصیب ہو سکتی ہے؟ بارہا ان سے بھی اختلافات ہوئے، اور شکر رنجیاں بلکہ تلخیاں بھی پیش آتی رہیں ..... جب صحابہ کرامؓ تک باہم ان بشری لغزشوں سے محفوظ نہ رہ سکے تو ہم گندے بندوں کا ذکر ہی کیا ہے، اخلاص وخلت کامل کا ظہور ناسوت میں نہیں، صرف عالم آخرت ہی میں ہوگا۔

---

(۱) ۱۹۲۸ء میں حج کے سفر پر روانہ ہوئے تھے اور ۱۹۲۹ء کو واپس ہوئے، اس لیے ۲۸ اور ۲۹ دونوں روایتیں صحیح ہیں۔ (م)

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ﴾ (۱)

ترجمہ: ''اور ہم دور کرائیں گے (جنتیوں سے) جو کچھ غبار ان کے دلوں میں رہا ہوگا (دنیا میں)۔''

ابتدائی زمانہ تنگدستی کا تھا، پھر اوسط درجہ کی فراغت حاصل ہوگئی، حیدرآباد جاکر کچھ روز بعد خوشحالوں میں شمار ہونے لگے، ۱۹۱۸ء میں میں یونیورسٹی کے سررشتہ تالیف وترجمہ سے رخصت ہوا تو اپنے جانشینوں کے لیے تین نام پیش کرآیا تھا، اس میں شاید پہلا نام انھیں کا تھا، یہ شعبہ فلسفہ میں تعلیم دینے کو بلائے گئے، چند سال بعد جب ایک انگریز نگراں مسٹر میکنزی کا دور دورہ ہوا تو یہ شعبہ دینیات میں تبدیل کردیئے گئے، لکھنؤ میں شہر کے کونے پر ایک بڑی سی کوٹھی بنوالی، سابقے والوں سے ذرا بنتی کم ہے، اسباب جو کچھ بھی ہوں، یہ لکھتے خوب ہیں، فکر وفہم حضرت تھانوی سے لی ہے اور انداز تحریر مولانا شبلی سے، تعلیمات تھانوی کو بہ سلسلہ تجدید دین چار جلدوں میں لکھ کر خوب مقبول بنادیا ہے، اور اب اخیر زمانہ میں سائنس والوں کی زبان سے خداپرستی کا پیام خوب پھیلایا ہے۔

گراں گوش تو ہمیشہ رہے، اس کا ایک طبی باعث ممکن ہے کہ لیموں کا زیادہ استعمال ہو، اور اب کئی برس سے گراں گوشی بہت بڑھ گئی ہے، اور عام صحت بھی خراب رہنے لگی ہے، اور چلنے پھرنے کے تو جیسے ناقابل ہی ہوگئے ہیں، اس پر بھی لکھنے کا کام خوب کئے جاتے ہیں، افسوس ہے کہ اس پر حضرت تھانوی کے زمانہ میں توجہ نہ کی، ورنہ وہ بڑی مدد فرماتے، میں اپنی تحریروں

---

(۱) سورۂ اعراف/۵۔

میں ان کا اکثر ذکر ایک تھانوی الفکر اور شبلی القلم کے عنوان سے کرتا ہوں، اپنی جوانی میں ایک رسالہ ''مذہب وعقلیات'' پر ''بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر'' خوب لکھا تھا، پھر اس کے بعد جیسے لکھنا بھول ہی بیٹھے تھے۔

حضرت تھانویؒ کو اس کی حسرت ہی رہ گئی، اب ان کی وفات کے بعد گویا بڑی حد تک تلافی مافات کر دکھائی، خدمت دین کے لیے اللہ ان کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائے، ضابطہ سے بیعت تو مولانا حسین احمد صاحبؒ سے ہے لیکن تربیت میری طرح انھوں نے بھی حضرت تھانویؒ سے پائی، اور انھیں نے انھیں خلافت واجازت بیعت عطا فرمادی ہے، سخت افسوس ہے کہ گوناگوں بیماریوں نے انھیں بالکل فریش بنا رکھا ہے۔

مستزاد:

۱۹۷۴ء میں میری کتاب ''معاصرین'' ''صدق جدید'' میں قسط وار نکلنا شروع ہوئی اور ابھی مولانا عبدالباری ندوی کی باری آنے نہیں پائی تھی کہ وہ مرحوم ہوگئے، ۳۰ رجنوری ۱۹۷۶ء جمعہ کی صبح کو وفات پائی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

نماز جنازہ جمعہ کی نماز کے بعد ندوۃ العلماء کی مسجد میں ایک مجمع عظیم کے ساتھ ہوئی، جس میں طلبہ ندوہ کی بڑی تعداد اور اساتذہ شامل تھے، نماز جنازہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے پڑھائی اور تدفین ڈالی گنج کے قدیم قبرستان میں ہوئی۔'' (۱)

---

(۱) مأخوذ از معاصرین از مولانا عبدالماجد دریابادی۔

۴- مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ: (سابق ناظم ندوۃ العلماء)

حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی محبوب اور عزیز ترین شخصیتوں میں ایک ان ہی کی معاصر شخصیت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب (برادر اکبر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ) کی ذات گرامی بھی ہے، جن کے متعلق مولانا عبدالباری ندوی بڑے وثوق واعتماد کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ ''ڈاکٹر صاحب سے گناہوں کا صدور تو بڑی چیز گناہ کا خیال بھی نہیں گذرتا'' (۱) ان کی نیک نفسی، شرافت خاندانی، تعلق مع اللہ اور فرشتہ صفتی نے مولانا عبدالباری ندوی کو گرویدہ بنالیا تھا، یہاں تک کہ اپنے شیخ ومرشد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی لے کر ان کو اپنے ذاتی، اجتماعی اور دیگر معاملات میں مشیر بنا لیا تھا، اس طرح مرشد تو تھے حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ اور مشیر یہ دوسرے حکیم وڈاکٹر مولانا سید عبدالعلی صاحب، ڈاکٹر صاحب کو بھی مولانا عبدالباری صاحب سے بڑا تعلق خاطر تھا، اور اگر یہ بات کہی جائے کہ حضرت ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کے صرف ایک ہی دوست تھے، تو نام ان ہی مولانا عبدالباری صاحب کا بہتوں کی زبان پر آئے گا، بڑی خاص تقریبات میں جن میں محدود سے محدود تر لوگ ہوتے تو مولانا عبدالباری صاحب ضرور ہوتے، مولانا عبدالباری صاحب کو کئی وجوہات سے ڈاکٹر صاحب سے مناسبت تھی، ایک تو یہ کہ دونوں کے شیخ مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، دونوں ہی ان سے بیعت تھے، لکھنؤ میں حضرت مدنیؒ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ اگر کہیں رات گذارنا منظور فرماتے تو ان ہی مولانا عبدالباری صاحب کی دعوت قیام وطعام کو قبول کرتے ہوئے ان کے مکان ''شبستان سعادت'' میں قیام کرلیتے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے

---

(۱) روایت مولانا محمد غفران ندوی جو راسی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

دونوں ہی کو ذوقاً ومزاجاً مناسبت تھی، مولانا عبدالباری صاحب نے اس بات کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے کہ:

''خوش فہمی عرض کرنے کی یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی وفات تک حضرت (تھانویؒ) کے ساتھ ان کی اس عقیدت میں زیادہ کیا تمام تر حصہ اپنی سعادت کا جانتا رہا، لیکن ان خطوط کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ وہ پیدا ہی تھانوی مزاج ومذاق کو لے کر ہوئے تھے۔''(۱)

مولانا پر ان کی خشیتی زندگی کا بھی بڑا تاثر تھا، اسی لیے وہ ڈاکٹر صاحب کو ''إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا'' کی صحیح اور سچی تصویر قرار دیتے تھے، معاملات اور معاشرتی زندگی میں دوسروں کی راحت اور نفع کا خیال، عبادات میں قرب بالفرائض تو ترجیح، دینی ودنیوی بصیرت، اور پاکدامنی ایسی کہ مولانا عبدالباری صاحب ان کو ''یوسف ثانی'' کہہ بیٹھے، اور یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ ''إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ'' بلکہ ان کی وفات پر پورا ایک مضمون اسی عنوان کے تحت سپرد قلم کر دیا، مزید انتظام وتدبیر میں ان کی دوررس نگاہ ایسی کہ مولانا عبدالباری صاحب انھیں ''ثالث العمرین''(۲) کہہ بیٹھے، اور ان کے لیے ایک ملک عادل کا تصور قائم کیا، ان کے علاج ومعالجہ کے اس قدر قائل تھے کہ وہ ان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو دکھانا جرم سمجھتے تھے، ہاں ڈاکٹر صاحب خود ہی کسی کا اشارہ فرما دیتے تو اس کی طرف رجوع میں انھیں تأمل بھی نہیں ہوتا، معاملات میں دونوں بزرگ کئی معاملوں میں اشتراک رکھتے تھے، مگر ایک دوسرے کا ایسا خیال کہ جیسے دونوں ایک دوسرے کو اپنے سے زیادہ عزیز رکھتے ہوں، مولانا عبدالباری ندوی صاحب نے اپنے ممدوح کو فرشتہ کیوں کہا؟

---

(۱) فرشتہ صفت انسان۔ ص/۳۷

(۲) یعنی خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور خلیفہ عادل حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ

اس کا جواب بھی وہ خود دیتے ہیں، لکھتے ہیں:

''انسان کو جنت سے نکال کر دنیا میں بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ دنیا کو عین دین بنا کر دکھلائے، فرشتوں کی نظر انسانی خلقت کے غالباً صرف افادی پہلو پر پڑی تھی، اس کے جواب میں جو یہ ارشاد ہوا تھا کہ ﴿إِنِّيٓ أَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُونَ﴾ اس کا کم از کم ایک اشارہ کیا عجب ہے اس حقیقت کی طرف بھی رہا ہو کہ ہر طرف سے ہر طرح کی دنیاوی و مادی ترغیبات و تحریصات میں گھرا ہو کر اور ہر وقت نفس و شیطان سے جنگ کرتے ہوئے ہزاروں لاکھوں میں ﴿إِنۡ هَٰذَآ إِلَّا مَلَكٞ كَرِيمٞ﴾ کی صفت والا ایک ڈاکٹر عبدالعلی بھی نکل آئے تو کیا وہ معصوم الخلقت ہزاروں لاکھوں فرشتوں پر بھاری نہ ہوگا؟!''(۱)

مولانا عبدالباری صاحب مزید ان کی بشریت کو مثالی بشریت قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''یوں بہر حال بشر ہی تھے، بشریت کے لوازم سے خالی کیسے رہے ہوں گے، لیکن جس طرح حضرت گیلانیؒ کا ایمانی فراست والا قلب چند مہینوں میں اس تاثر پر مضطر ہو گیا تھا کہ ایک ایسے شخص کو دیکھا کہ جس کے قلب پر کسی معصیت کا خطرہ بھی شاید گذر پاتا ہو، اس طرح اپنی آنکھوں کے شہتیر سے آنکھیں بند کر کے دوسروں کی آنکھوں کا تنکا دیکھنے والا یہ راقم ۳۲ سالہ قریب سے قریب اور نجی سے نجی معاملات و تعلقات پر مبنی تجربات و تاثرات پر مبنی آخر میں پھر اس شہادت پر ختم کرتا ہوں

---

(۱) فرشتہ صفت انسان۔ ص/۶۳

کہ نہ ان کی نگاہ قلب ایک معاملہ میں بھی دین سے ہٹتی دیکھی نہ ان کے قالب کا کوئی فعل وعمل اتفاقی طور پر بھی خلاف دین دیکھا، ذہن پر زور ڈالنے پر بھی یاد نہیں آرہا ہے کہ کبھی ایسا دیکھا ہو، تفصیل میں جاؤں تو کسی رسالہ کا ضخیم نمبر یا کتاب بھی کافی نہ ہوگی، بس ''بزور بازو نیست'' والی قلب وقالب دونوں کی اس بے داغ زندگی والی سعادت کو خدا بخشندہ کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے: إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ.''

اللّٰهم اغفر له وارفع درجاته. (۱)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی جامع اور پر مغز عبارت بھی ان دونوں کے فکری وذاتی اتحاد واشتراک سے متعلق نقل کی جاتی ہے، جس سے ان دونوں شخصیتوں کے تعلقات کو سمجھنا زیادہ آسان ہوگا:

''مولانا عبدالباری صاحبؒ وبرادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ میں بڑے گہرے روابط وتعلقات تھے، دونوں میں کئی باتیں مشترک تھیں، اور یہی مناسبت و اتحاد کا قوی ذریعہ رہا ہے، دونوں معاملات اور حقوق العباد میں بہت محتاط اور ذکی الحس واقع ہوئے تھے، دونوں مظاہر واشکال اور لوگوں کی تعریف و تنقید سے بے نیاز ہوکر شریعت پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور فرائض کو نفلی عبادتوں اور تکمیلی چیزوں پر ترجیح دیتے تھے، دونوں طبعاً ومزاجاً منتظم واقع ہوئے تھے اور حساب کتاب کے صاف اور اس میں بے تکلف تھے، دونوں مولانا مدنیؒ سے بیعت

(۱) فرشتہ صفت انسان ص/۷۹

کا تعلق رکھتے تھے، ان مناسبتوں اور مشترک نقطوں کے باوجود تعلیم وتربیت، ماحول کے اختلاف اور خاندانی اثرات کی بنا پر دونوں میں بہت سی مابہ الامتیاز خصوصیتیں تھیں، اور جن کو خدا نے دو پیدا کیا ہے وہ کبھی ایک نہیں ہوسکتے، مولانا عبدالباری صاحبؒ میں ایک حد تک شدت اور بے لچک پن تھا، وہ اپنے خلاف مزاج وخلاف اصول کسی چیز کو برداشت نہیں کرسکتے تھے، اسی وجہ سے ان کے چھوٹے اکثر ان سے خائف اور ان سے دور رہتے تھے، اور گھر کے کم افراد ان کے معیار پر اترتے تھے، ان کی اسی مزاجی خصوصیت کو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے ایک مرتبہ ایک بلیغ جملہ میں ادا کیا کہ ''مولانا عبدالباری چاہتے ہیں کہ شیطان مرجائے اور ایسا ممکن نہیں۔''

مولانا عبدالباری صاحبؒ نے بھائی صاحب مرحوم کو اپنا مستقل معالج بنا رکھا تھا اور وہ ان کے علاوہ اسی وقت کسی ڈاکٹر یا حکیم کی طرف رجوع کرتے تھے جب بھائی صاحبؒ ان کو مشورہ دیتے، وہ وحدتِ مرشد کے بھی قائل تھے اور وحدتِ معالج کے بھی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مشورہ سے انھوں نے بھائی صاحبؒ کو اپنا مشیر بھی بنالیا تھا۔''(۱)

☆☆☆

(۱) فرشتہ صفت انسان۔ص/۹

باب یازدہم

چند نامور مستفیدین

۱- مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ:

مفکر اسلام اور عالم اسلام کی نابغہ عصر اور دنیائے انسانیت کی رہبر شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے جن اوصاف، امتیازات اور خصوصیات و کمالات سے نوازا تھا، ان میں ان کا ایک مابہ الامتیاز وصف صاحب کمال سے استفادہ کا بھی تھا، جس نے ان کو زمانہ کے عبقری و مرکزی شخصیتوں اور علمی رسوخ رکھنے والے افراد اور مجددین و مصلحین تک طالب علمانہ طور پر پہنچایا، مثال کے طور پر حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا احمد علی لاہوری، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری، مولانا شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی، مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی، ڈاکٹر محمد اقبال، اور شام کے مشہور عارف شیخ حارون العسل الحجار، اسی طرح ایک نام مولانا عبدالباری ندوی لکھنوی کا بھی ہے، اگر دو اور شخصیتوں کا نام لے لیا جائے تو غلط نہ ہوگا، ایک مولانا سید مناظر احسن گیلانی اور دوسرے مولانا عبدالماجد دریابادی۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی ایک اور خصوصیت تھی کہ وہ قرآن مجید کے تعلق سے استفادہ کو ترجیح دیتے تھے، اور اسی چیز نے انہیں مولانا عبدالباری ندوی کی طرف زیادہ کھینچا، جس کا اظہار انھوں نے اپنے اس مضمون میں کیا ہے جو انھوں نے

مولانا کی وفات کے بعد ''پرانے چراغ'' کے لیے سپرد قلم کیا تھا، مولانا سے استفادہ کے لیے ان کو کسی دوسرے شہر کا سفر نہیں کرنا پڑا، وہ جب حیدرآباد سے تعطیل کا زمانہ گذارنے اپنے مستقر واقع لکھنؤ میں آتے تھے تو کسی نہ کسی صورت میں استفادہ کی شکل نکل ہی آتی تھی، جس کا اظہار مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مولانا گرمیوں کی تعطیل میں جب لکھنؤ آتے تو ان کا معمول تھا (اور یہ معمول سبکدوشی کے بعد تک قائم رہا) کہ جمعہ کی نماز ہمارے محلّہ کی مسجد میں پڑھتے جس کے امام وخطیب اس زمانہ میں بھائی صاحب مرحوم تھے، پھر انھوں نے مجھے اپنی جگہ کھڑا کردیا تھا، اگر مولوی مسعود علی صاحب (۱) لکھنؤ میں ہوتے تو وہ بھی آجاتے، دونوں صاحبان اس دن دوپہر کا کھانا بھائی صاحب ہی کے ساتھ کھاتے اور وہیں نیچے کی گلی کے کمرہ میں جو گرمیوں میں ٹھنڈا رہتا آرام کرتے، نشست کے وقت میں بھی حاضر ہوجاتا، اس وقت ان تینوں حضرات کی علم آموز، دلچسپ و دل آویز باتیں سننے میں آتیں، اگر مولانا مناظر احسن گیلانی بھی ہوتے تو ''نورٌ علیٰ نور'' کا منظر ہوتا، مولانا کی شیریں گفتاری، بذلہ سنجی، نکتہ آفرینی اور لطیفہ گوئی مجلس کو باغ و بہار بنادیتی۔

مولانا کے اسی زمانہ تعطیل کے قیام میں میں نے صبح کو ان کے

---

(۱) مولانا مسعود علی صاحب ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ممتاز فضلاء میں اور بعد میں اس کے مؤثر ارکان میں ہوئے، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ذمہ داروں اور منتظمین میں رہے، اوران دونوں اداروں کی مسجدیں ان ہی کے ذوق تعمیر کی یادگار ہیں، علامہ شبلی کے پروردہ تھے، اور حضرت تھانویؒ کے مرید ہوئے اور مجاز صحبت بھی اور اس حلقہ احباب کے رکن تھے جس کے ارکان مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، ڈاکٹر عبدالعلی حسنی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا مناظر احسن گیلانی وغیرہ تھے، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

دولت کدہ پر حاضری دینی شروع کی، میرے ساتھ میرے محترم رفیق انگریزی میں میرے استاد اور عربی میں میرے شاگرد حاجی عبدالواحد صاحب ایم.اے. حال مقیم لاہور بھی ہوتے، ہم دونوں ٹہلتے ہوئے مولانا کی کوٹھی پر پہنچ جاتے جو ہماری قیامگاہ بازار جھاؤلال سے دو میل ضرور ہوگی، مولانا قرآن مجید کا درس دیتے، اور درس کے بعد منتخب آموں سے ضیافت بھی کرتے، مولانا کے درس میں ایسے حکیمانہ اشارے ملتے جن کی شرح میں صفحہ کے صفحہ بلکہ رسالے لکھے جاسکتے ہیں، اس درس کے کچھ معین مضامین وفوائد تو یاد نہیں رہے لیکن اس سے اصولی طور پر بہت فائدہ پہنچا، اور قرآن مجید کی عظمت اور اس کے اعجاز کے یقین میں اضافہ ہوا، یہ سلسلہ زیادہ دن تو جاری نہیں رہا، لیکن اپنے نقوش ذہن پر چھوڑ گیا۔

پھر جب میری تدریسی زندگی کا آغاز ہوا تو میری ترغیب پر دارالعلوم کے اونچے درجہ کے طلبہ نے بھی یہاں آنا جانا شروع کیا، مولانا نے یہ پسند نہیں فرما کہ طلبہ ہی چل کر جائیں، وہ اپنی کوٹھی سے چل کر ایک مسجد میں جو ریلوے لائن پر ہے تشریف لاتے اور اس کو "مکاناً سویً" (درمیانی مقام) کے نام سے یاد فرماتے، طلبہ کے ساتھ اکثر میں بھی چلا جاتا، اور مستفید ہوتا۔"(۱)

مولانا عبدالباری ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بڑے ہی قدرداں اور قائل تھے، جس کا اظہار انھوں نے اپنی بعض تحریروں میں بھی کیا ہے، اپنی کتاب

---

(۱) پرانے چراغ۔ ۱۲۱/۲

''مذہب وسائنس'' کے دیباچہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''جب سال کی بڑی تعطیلات میں لکھنؤ آتا تو ندوہ کے اوپر کے درجوں کے کچھ طلبہ قریب کی مسجد میں آجاتے، اوران سے اپنی بھڑاس نکالتا رہتا، ان میں کبھی کبھی علی میاں بھی آبیٹھتے، بلکہ غالباً حیدرآباد کے زمانہ تعلق میں کسی سال کی بڑی تعطیل میں آنا ہوا تھا تو غالباً کئی ہفتہ اپنے بعض اعزہ واحباب کے ساتھ روزانہ کم وبیش دو میل کی مسافت طے فرما کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے تشریف لاتے، اب خیال کرتا ہوں کہ عرب وعجم کے صاحب علم وقلم حضرت علی میاں کے مقام کو کچھ بھی اس وقت پہچان سکتا تو یقیناً اپنی جگہ چھوڑ کر طالب کی صف میں جابیٹھتا'' من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ'' کی یہ کیسی جیتی جاگتی مثال ہے کہ جو آج ان کے سامنے طفل مکتب ہے، اس سے بھی ان کو کوئی بات کام کی ملتی نظر آتی تو اس میں تامل نہ فرماتے بارك اللّٰہ فی برکاتھم. ''مذہب وسائنس'' کی کتاب میں بھی انھیں کی برکات کا حصہ ہے۔''

وہ مولانا کی صلاحیتوں اور خدمات کو دیکھتے ہوئے عالم عربی کو مرکز توجہ بنانے پر زیادہ زور دیتے، اور وہ یہاں تک کہتے کہ اسی کام کی طرف پوری طرح یکسوئی حاصل کرلیں، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے الفاظ ہیں:

''مجھ ناچیز سے متعلق ان کی عرصہ سے رائے تھی کہ مجھے اصلاً عربوں کو اپنا مخاطب اور عالم عربی کو اپنی دعوت کا موضوع اور اپنی حقیر صلاحیتوں کا میدان بنانا چاہئے، وہ کہتے تھے کہ تم یہاں

ہندوستان میں Miss Fit ہو، تم یہاں کیا چین کے حملہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ٹھہرے ہوئے ہو؟(۱) وہ مشرق وسطیٰ اور ممالک عربیہ کے غیر دینی رجحانات اور بعض دشمن اسلام تحریکوں (عرب قوم پرستی اور فتنہ ناصری) سے واقف تھے، اور میرے عربی مضامین ورسائل سے بھی اجمالی واقفیت رکھتے تھے، اس لیے ان کی خواہش تھی کہ میں اپنی ساری توجہ اسی رخ پر مرکوز کردوں۔''(۲)

مولانا سے ان کے تعلق ومحبت کی ہی بات تھی کہ جب انھوں نے اپنی معرکۂ آراء تصنیف ''مذہب وسائنس'' لکھی تو اس کا انتساب اپنے جن قدیم وعظیم محسنین کی طرف کیا تو اس میں آخری نام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا تحریر فرما کر اس فہرست کو انھیں پر ختم کیا، اور اس طرح ختم کیا کہ ان ہی کو اولیت بھی دی، جو اس طرح ہے:

بہ برکات

حضرت والد ماجد حکیم عبدالخالق وسراپا شفقت واحسان استاذی علامہ شبلی نعمانی ومحسن ومجسم کرم پروفیسر شیخ عبدالقادر (آئی.اے. ایس. بمبئی یونیورسٹی) وقدردان اعظم مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدرالصدور مملکت آصفیہ مرحومہ، ومرشدی ومولائی حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اور اولاً و آخراً برادر عالی قدر حضرت مولانا علی میاں سلمہم۔

سرورق کے اس سرنامہ ''بہ برکات'' کو کوئی رسمی Dedication

---

(۱) یہ اس زمانہ کی بات ہے جب ہندوستان پر چین نے ایک حملہ کیا تھا۔
(۲) پرانے چراغ۔ ۲/۱۲۸

بالکل تصور نہ فرمایا جائے، بلکہ پیشکش کتاب کم وبیش نصف صدی کی سرگذشت میں جن حضرات کے برکات واحسانات کارفرما رہے بس ان کا مختصر ذکر مقصود ہے۔

۲- ڈاکٹر رضی الدین صدیقی:

مولانا عبدالباری ندوی جس زمانہ میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں رہے تھے وہ جامعہ کا زریں دور تھا، اپنے اپنے فن اور موضوع کے عبقری لوگ وہاں اپنی صلاحیتوں سے فائدہ پہنچا رہے تھے، جیسے مولانا سید مناظر احسن گیلانی، پروفیسر الیاس برنی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (۱)، ڈاکٹر سید عبداللطیف وغیرہ، پھر اسی صف میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی بھی کھڑے ہوگئے، جنھوں نے بعد میں اور بھی ترقی کی مگر انھیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا میدان پاکستان میں ملا، جہاں انھوں نے اسلام آباد اور پشاور میں رہ کر وہاں کی یونیورسٹیوں میں نمایاں حیثیت بنائی، اور پشاور یونیورسٹی کے وہ وائس چانسلر بھی ہوئے، مولانا عبدالباری ندوی کے عہد تدریس میں وہ وہاں طالب علم بھی رہے اور پھر استاد بھی ہوگئے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ:

> ''ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر حمید اللہ (حال مقیم پیرس) اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی) اسی زمانہ کے طالب علم تھے۔'' (۲)

ڈاکٹر رضی الدین صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں اپنے زمانہ

---

(۱) خلیفہ عبدالحکیم مرحوم شاعر تھے، فلسفی تھے، اچھی خاصی علمی شہرت رکھتے تھے، علامہ اقبال کی ہم نشینی کا بھی انھیں شرف حاصل تھا۔ (ماہر القادری یادرفتگاں ۱/۴۶۸ ذکر جگر مرحوم)

(۲) پرانے چراغ۔ ۲/۱۲۵۔

طالب علمی کا جونقشہ کھینچا ہے اس میں انھوں نے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی سے اپنے تلمذ کا پورا اعتراف کیا اور ان ہی کے توسط سے حضرت مولانا عبدالباری ندوی سے ملاقاتوں اور پھر استفادہ کی شکلوں کا ذکر کیا، جس سے اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف ان سے استفادہ کرنے والوں میں ضرور ہیں، اور یہی نہیں بلکہ ان کے قدردان اعظم ہیں، لیکن باضابطہ شاگرد نہیں، ان کے ہی مضمون سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے اس حقیقت پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

''جامعہ میں کم وبیش ۲۰ سال تک مولانا کی رفاقت حاصل رہی، حضرت مولانا شعبہ فلسفہ سے متعلق تھے، اور میں شعبہ ریاضی سے، حضرت مولانا قدیم و جدید فلسفہ اور علم الکلام سے تو اچھی طرح واقف ہی تھے، لیکن اس کے ساتھ وہ جدید سائنس کے اہم اصول اور نتائج اور فلسفہ اور کلام پر ان کے اثرات سے بھی واقف ہونا چاہتے تھے، ادھر میں خود اضافیت اور کوانٹم Quantum کے ریاضیاتی نظریوں پر درس دیا کرتا تھا، اور ظاہر ہے کہ فلسفہ اور کلام پر ان دونوں نظریوں کا بڑا گہرا اثر مرتب ہو رہا تھا، اسی تعلق سے مجھے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا، اور ان مسائل پر اکثر گفتگو رہی، گردش ایام کے سبب گذشتہ بیس سال کے دوران حضرت مولانا سے نیاز تو حاصل نہیں ہو سکا، البتہ وقت بوقت خط و کتابت کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا رہا کہ موصوف ان ہی مسائل پر غور وفکر کرنے کے بعد فلسفہ، کلام اور سائنس کے باہمی تعلق اور اثرات پر ایک کتاب میں مصروف ہیں۔

چند ماہ قبل حضرت مولانا نے بذریعہ خط ارشاد فرمایا کہ اس کتاب پر مقدمہ تحریر کردوں، حضرت مولانا کی نظر عنایت تو شروع ہی سے مبذول رہی ہے لیکن میرے لیے یہ مشکل آپڑی ہے کہ میں یہ جسارت کس طرح کروں، بہرحال جب حضرت مولانا نے ازراہ ذرہ نوازی یہ سعادت بخشی ہے تو اس کو قبول نہ کرنا کفران نعمت کے مترادف ہوتا، امتثال امر کے طور پر چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

یوں تو میں ایک عرصہ سے واقف تھا کہ حضرت مولانا کس نظر سے ان حقائق کا مطالعہ کررہے ہیں جو فلسفہ، کلام اور سائنس کے امتزاج سے منکشف ہورہے ہیں لیکن اس کتاب کے مسودہ کو پڑھنے کے بعد ہی پتہ چلا کہ حضرت مولانا کا مطالعہ کس قدر وسیع رہا ہے، اور انھوں نے قدیم یونانی فلسفہ سے لے کر آج تک بڑے بڑے علماء اور حکماء کی اصل تصنیفوں اور مقالات سے اپنے موضوع کے متعلق کس طرح قیمتی مواد حاصل کیا ہے، اور پھر اس مواد کی تحلیل اور تشریح کے بعد ایک مدلل پیرایہ میں کیسے صحیح نتیجے اخذ کئے ہیں۔''

آگے لکھتے ہیں:

''بہرحال جب مادیت اور دہریت کے پرستاروں کا وہ طلسم جو انھوں نے سائنس کی بنیادوں پر قائم کیا تھا ٹوٹ گیا تو پھر کائنات کی حقیقت پر غور وفکر کرنے والوں کے لیے بمصداق ''کافر نتوانی شد، ناچار مسلمان شد'' خدا کی ہستی پر ایمان لانے کے لیے نئی راہیں کھل گئیں، اور کم از کم ایک ہمہ گیر آفاقی ذہن

(Universal Mind) کوتسلیم کرنا ناگزیر ہوگیا، حضرت مولانا عبدالباری ندوی نے اس حقیقت کو اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے، اوران اصحاب کے لیے جو سائنس اور ٹکنالوجی کی حالیہ غیر معمولی ترقی سے مرعوب اور متاثر ہوکر ایمان کی کمزوری کا شکار ہورہے ہیں، یقین محکم حاصل کرنے اور دنیا و آخرت میں نجات پانے کا سامان مہیا کیا ہے، اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا کا یہ نہایت اہم اور قابل تحسین کارنامہ ہے جوانھوں نے اس کبرسنی میں اس قدر محنت شاقہ برداشت کر کے انجام دیا ہے، اوراس کے لیے وہ یقیناً عنداللہ ماجوراور عندالناس مشکور ہوں گے۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس تحریر سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ حضرت مولانا عبدالباری سے نہ صرف متاثر ہیں بلکہ انھوں نے اپنے دوران مطالعہ ودرس اور زمانہ تدریس وتعلیم میں پھر بعد میں مراسلت کے ذریعہ خاطر خواہ استفادہ کیا ہے، گرچہ وہ بسلسلہ تلمذ منسلک نہ ہوسکے لیکن زیادہ سے زیادہ استفادہ کی صورت پیدا ہونے کے نتیجہ میں وہ ان سے آخر تک مرتبط نظر آتے ہیں۔

۳- ڈاکٹر حمیداللہ (پیرس):

ڈاکٹر حمیداللہ صاحب ان عظیم شخصیات میں سے ایک ہیں جنھوں نے علم و تحقیق میں پوری دنیا سے اپنا لوہا منوایا، فروری ۱۹۰۸ء میں وہ پیدا ہوئے، دسمبر ۲۰۰۲ء میں انتقال کیا، اس طرح انھوں نے علم دین کی خدمت کے لیے طویل عمر پائی، جس کو انھوں نے رائیگاں نہیں جانے دیا، تعلیم عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں حاصل کی، ان

---

(۱) از: مقدمہ کتاب۔

کے خصوصی استاد حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی تھے، جن کے وہ تاعمر احسان مند رہے، ان کی شخصیت کی تشکیل میں مولانا گیلانی کا اہم کردار رہا ہے، جس کے وہ ہمیشہ معترف رہے، ڈاکٹر حمید اللہ نے بلاشبہ اپنی محنت، جانفشانی، عمل پیہم اور جہد مسلسل سے جو کچھ حاصل کیا، اس کی بہت کم نظیریں ملیں گی، خود انھیں اس بات کا احساس رہا کہ جہد مسلسل اور عمل پیہم سے انھوں نے اونچا علمی مقام حاصل کیا ہے، اس کے ساتھ ان کے داعیانہ کردار نے فرانس میں اسلام کو فروغ دیا، اور اس اعتبار سے وہ فاتح فرانس کہے جانے کے سب سے زیادہ حقدار نظر آتے ہیں، فرینچ زبان میں انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا، اس کے علاوہ دیگر یورپین زبانوں میں ترجمہ کیا، جس سے وہاں کے باشندوں کو اسلام کو سمجھنے کا موقع ملا، اور اس کے باعث ان کے دلوں میں اللہ کی محبت کا بیج پڑا، پھر جس کی آبیاری ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے وہاں رہ کر اور دوسری اسلامی تنظیموں، عرب داعیوں اور تبلیغی جماعتوں نے کی، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اور قرآنیات سے شغف رکھا، اس کے ساتھ علم حدیث کی خدمت کا شوق رکھتے تھے، ان کے اندر یہ علمی ذوق اور دینی شوق جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں تعلیم کے دوران علامہ مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی کی صحبتوں سے پروان چڑھا تھا، اسی لیے وہ جہاں کہیں رہے اپنے ان محسنوں سے رابطہ بنائے رہے، اور ملاقات نہ ہوسکنے کی صورت میں مراسلت سے کام لیتے رہے، مولانا عبدالباری ندوی ان کا احترام بھی کرتے تھے، اور ان کی ہمہ جہت علمی ترقی کے معترف تھے، جدید وقدیم فلسفہ پر ان کی نظر اور جدید سائنس میں ان کے مطالعہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اسی لیے انھوں نے اپنی بعض تصنیفات میں ان سے استفادہ بھی کیا، اور بعض تحریرات ان کی نظر سے گذارنا ناگزیر سمجھا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے ایک مکتوب میں مولانا عبدالباری ندوی اس

تعلق سے لکھتے ہیں:

''.....احقر سائنس سے بالکل جاہل ہے، امید تھی کہ کالجوں، یونیورسٹیوں کے اساتذہ سے مدد ملے گی، لیکن ہندوستان سے پاکستان تک کوئی معتد بہ مدد دینے والا نہ ملا، پیرس میں ایک دوست ہیں، ماشاء اللہ بڑے دیندار، یہاں بھی جب درمیان میں آئے تو انھیں سے کچھ مدد ملی اور اب سائنسی حصہ مبیضہ کی صورت میں ان کو پیرس بھجوا رہا ہوں، انشاء اللہ۔''(۱)

دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''تجدید کلامیات کا دوسرا حصہ الحمد للہ کسی طرح پورا ہو کر پیرس میں ایک دوست کو روانہ کر دیا۔''(۲)

ڈاکٹر حمید اللہ سے مولانا عبدالباری ندوی کا تعلق واعتماد جہاں ان سطروں سے ظاہر ہوتا ہے وہیں یہ بات مخفی نہیں رہتی کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے حیدرآباد کے زمانہ طالب علمی میں جو تعلق قائم کیا تھا اسے کمزور نہیں ہونے دیا، افسوس کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے ۲۰۰۲ء کو پیرس میں انتقال کیا، اور علمی دنیا میں وہ خلا چھوڑ گئے جس کا پر ہونا آسان نہیں۔

۴- ڈاکٹر میر ولی الدین حیدرآبادی:

ڈاکٹر میر ولی الدین الدین نامور فلسفی وصوفی اور مشہور مصنف ومعلم تھے، ۸۰/سال کی عمر میں اپنے وطن حیدرآباد میں انتقال کیا، فلسفہ میں مولانا عبدالباری ندوی کے شاگرد، اور عارف باللہ مولانا محمد حسین حیدرآبادی کے مرید صادق تھے، یکم

---

(۱) مکتوب لکھنؤ مؤرخہ ۳/ذی الحجہ ۸۷ھ/۳/مارچ ۶۸ء

(۲) مکتوب لکھنؤ مؤرخہ ۲/ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ/۶/۶/۶۸ء

دسمبر ۱۹۷۵ء ان کی وفات کا دن ہے۔

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء و مدیر مجلّہ ''البعث الاسلامی'' لکھتے ہیں:

''توفی الدکتور میر ولی الدین فی دیسمبر الماضی بحیدر آباد فإنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون.

کان الدکتور من علماء الفلسفة الجدیدة ورئیس الفلسفة الحدیثة بالجامعة العثمانیة بحیدر آباد، وله کتابات ومؤلفات جیدة فی هذا الموضوع ونشر له فی "البعث" مقالات عدیدة وقد حدث من وفاته فراغ کبیر فی صف الکتّاب والأساتذة الإسلامیین.''(۱)

معروف صحافی و محقق مولانا ضیاء الدین اصلاحی (م: ۲۰۰۸ء) نے ان کی اچھی تعریف کی ہے اور لکھا ہے:

''ڈاکٹر صاحب کا اصل موضوع فلسفہ تھا، مگر حقیقتاً وہ ایک مرد مومن اور عارف باللہ تھے، اس لیے وہ فلسفہ کے برے اثرات ونتائج سے ہمیشہ محفوظ رہے، ان کی فلسفیانہ تحریریں بھی ایمان کی لذت وحلاوت سے معمور ہوتی ہیں، اور وہ خالص فلسفہ کی کتابوں میں بھی پہلے قرآنی فلسفہ بیان کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے انداز بیان کی شگفتگی ودلکشی نے فلسفہ کے خشک اور دقیق موضوع میں شعر وادب جیسی لطافت اور دلآویزی پیدا کردی ہے، تصوف میں ذوقی اور وجدانی باتیں ہوتی ہیں، اور کیفیات وذوقیات کو تعقلات کی زبان میں ادا کرنا بہت مشکل ہوتا

---

(۱) مجلّہ البعث الاسلامی (جنوری-مارچ ۱۹۷۶ء)

ہے، مگر ان مباحث کو بھی وہ اس قدر سلجھے انداز میں بیان کرتے
ہیں کہ عام قاری کو ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔''(۱)

ڈاکٹر میر ولی الدین نے اپنے استاذ مولانا عبدالباری ندوی کی خصوصیات کو بڑی حد تک اپنے اندر جمع کرلیا تھا، وہ فلسفہ کے استاد بھی رہے، اور فلسفہ کی کتابوں کے مصنف بھی، قرآن حکیم اور تصوف اسلامی کو بھی موضوع بنایا، جس کے اثرات ان کی سبھی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، ان کی فلسفہ پر بلکہ کسی بھی موضوع پر پہلی کتاب ''فلسفہ کی پہلی کتاب'' دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی، ان کی ایک اہم کتاب ''مراقبات'' بھی ہے، اس میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ ''دینی تعلیمات اور ایمانیات وعقائد پر پختہ یقین وایمان نہ صرف مذہبی عقیدت کے لحاظ سے بلکہ نفسیاتی اصول سے بھی انسان کی اخروی فلاح اور دنیاوی ومادی کامرانیوں کا ضامن ہے۔'' ڈاکٹر میر ولی الدین حیدرآبادی نے اس حقیقت کو بڑے شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے اندر بڑی پختہ دینداری تھی، تعلق مع اللہ مضبوط اور گہرا تھا، اور اس دینداری نے ان کا برابر ساتھ دیا، کہنے والوں نے صحیح کہا ہے کہ ان کا دماغ فلسفہ جدیدہ سے روشن تھا مگر دل ہمیشہ ایمان سے منور رہا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ وغفرلہ مغفرۃ تامۃ.

مشہور ادیب ومؤرخ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم.اے. مدیر معارف اعظم گڑھ نے مولانا عبدالباری ندوی کے متعلق ''معارف'' کے شذرات میں ان کی وفات پر لکھا تھا کہ:

''مولانا عبدالباری ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مایہ ناز
فرزند اور قدیم ترین یادگار تھے، بڑے نامور مصنف، فلسفی اور

---

(۱) معارف (اعظم گڑھ) اشاعت جنوری ۱۹۷۶ء

مترجم ہونے کے علاوہ دینداری کے بھی اعلیٰ نمونہ بن کر رہے۔''

یہ بات کچھ حذف وترمیم کے ساتھ مولانا عبدالباری ندوی کے مایہ ناز شاگرد ڈاکٹر میر ولی الدین حیدرآبادی پر بھی صادق آتی ہے، کہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے حقیقی معنوں میں فرزند تو نہ تھے لیکن اس کے مایہ ناز فرزند کے واسطہ سے فرزند معنوی ضرور تھے، اور یہ کہ مولانا عبدالباری کی طرح انھیں علوم اسلامیہ سے سابقہ پہلے نہیں پڑا، فلسفہ میں غواصی کے بعد دینیات میں تعمق پیدا کرنے کی کوشش کی، اور قرآن مجید سے ربط مستحکم کیا، جبکہ مولانا عبدالباری ندوی نے پہلے دینیات میں رسوخ پیدا کیا پھر انھوں نے فلسفۂ قدیم وجدید کا گہرا مطالعہ کیا، لیکن اس کے ذریعہ سے الحاد وتشکیک کے بادلوں کے چھانٹنے کا کام دونوں نے ہی انجام دیا، اور گمراہی پر پڑ رہی عقلوں کو صحیح رخ دیا، اور فلسفہ زدہ دماغوں کو مسلمان کیا۔

مولانا عبدالباری ندوی نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''مذہب وسائنس'' میں اپنے جن مستفیدین اور شاگردوں کا تعاون حاصل کیا، ان میں ایک نام ڈاکٹر میر ولی الدین کا بھی ہے، جن کا انھوں نے مقدمہ میں ذکر بھی کیا ہے۔

ان خصوصیات وکمالات میں اشتراک واجتماع کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہی کہ کبھی دو انسان ایک نہیں ہو سکتے، اور نہ ہی دو دل ایک دل اور دو دماغ ایک دماغ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس لیے ان استاد وشاگرد کے درمیان تلخیاں بھی پیدا ہوئیں، اور طبائع کے اختلاف کی وجہ سے دوریاں بھی ہوئیں، لیکن پھر وہی قربت، محبت اور تعلق کی فضا قائم ہوگئی۔

باب دوازدہم

افکار ونظریات اور رجحانات

ایک عالم وداعی کے لیے ملی وانسانی بہی خواہی کی فکر دینی وایمانی دردوسوز کا حال اور قائدانہ حوصلہ اور حق بات کہنے اور سننے کی صلاحیت وجرأت اور سب سے بڑھ کر نسل نو کے ایمان وعقیدہ کی فکر ایک اہم ذمہ داری بن کر سامنے آتی ہے، اور ربانی علماء اور حقانی داعیوں نے ہمیشہ اس ذمہ داری کا احساس کیا ہے، اور انفرادی واجتماعی طور پر کبھی بھی اس کے لیے کوششوں سے دریغ نہیں کیا، جس کے سامنے جس قسم کے خطرات اور اندیشے اور فکریں آئیں اس نے اس کے مطابق حل کی راہیں سوچیں، چودھوں صدی ہجری کے علماء میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی کو یہ خصوصیت حاصل رہی کہ انھوں نے نہ صرف دینیات میں رسوخ پیدا کیا بلکہ عصر جدید کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ان علوم کا بھی پوری گہرائی سے مطالعہ کیا جس سے نئی نسل متأثر ہورہی تھی، چنانچہ انھوں نے مغربی تہذیب کے خطرناک اثرات کا بھی جائزہ لیا اور بہت غور وفکر کے بعد دانشور طبقہ کی اصلاح وتربیت کے لیے ان ٹھوس اقدامات کی طرف توجہ دلائی جن سے بڑی حد تک ثقافتی تہذیبی وتعلیمی ارتداد سے بچنا یا بچانا ممکن ہوسکتا ہے۔

ملت ہوسٹل یا اسلامی اقامت خانے وقت کی اہم ضرورت

چونکہ ان حضرات کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے اختلاط رہا تھا، اور وہ ان کے نظریات وخیالات کا جائزہ لیتے رہے تھے، اس لیے ان کے سامنے اس کے مضر پہلو پوری وضاحت کے ساتھ سامنے تھے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ خصوصاً ان کی وہ نوجوان نسل

جو دین سے بے بہرہ ہو کر ماڈرن تہذیب کے نرغے میں جارہی تھی، اس کو سنبھالنا اور راہ راست پر لانے کے لیے ان کی اسلامی ذہن سازی اولین ترجیحی مسئلہ تھا، اس لیے سب سے پہلے جو حل نکالا گیا وہ ملی ہوسٹلوں یعنی اسلامی اقامت خانوں کا جگہ جگہ خصوصاً ان جگہوں پر قیام کی تجویز تھی جہاں عصری دانش گاہیں ہوں، سب سے پہلے اس کا فکرہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے دیا، اور پھر اس کو پوری قوت سے مولانا عبدالباری ندوی نے پیش کیا، اور یورپ کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اپنی تحریروں تقریروں اور ملاقاتوں کے ذریعہ دنیا کے مسلمانوں کی توجہ اس کی طرف دلائی، مصنف ''حیات گیلانی'' نے مولانا گیلانی کی تجویز اور مولانا عبدالباری ندوی کی تشریح وترغیب اور اس کے پس منظر پر جو نوٹ لکھا ہے وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، ملاحظہ ہو:

> ''یونیورسٹی کے تعلق سے ان نوجوانوں کے ذہن وفکر سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکے تھے، جو ملک کے مختلف حصوں میں سرکاری تعلیم گاہوں میں پڑھ رہے تھے، کہ ان کا انداز فکر کیا ہے، یہ مذہبی تعلیم سے علماً وعملاً کس قدر دور ہیں، اور موجودہ دور کا سیلاب انھیں کس قدر پامال کرسکتا ہے، اس لیے مولانا گیلانی نے ''اقامت خانے'' والی تجویز اہل علم کے سامنے پیش کی، کہ شہر میں مسلم اقامت خانے قائم کئے جائیں، جہاں اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے والوں کے قیام وطعام کا قیمتی نظم ہو، مگر یہ ارزاں سے ارزاں تر ہو، اور ساتھ ہی بہت عمدہ، صاف ستھرا اور آرام دہ ہو، تاکہ یہاں ان کی ذہنی نشو ونما اسلامی طرز سے ہوسکے، دل ودماغ میں دین قیم کا نفوذ اور علمی وعملی دونوں نہج

سے دینی تربیت کا معقول انتظام ہو۔''(۱)

اس کی جو تشریح مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے، اس کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''انفرادی و اجتماعی زور، ہر جگہ چھوٹے بڑے اور ممکن حد تک ارزاں سے ارزاں اسلامی اقامت خانوں (ہوسٹل) قائم کرنے کرانے پر لگانا چاہئے ان میں ممکن حد تک بقدر ضرورت دینی تعلیم اور اس سے بڑھ کر حتی المقدور اور بہتر دینی تربیت کی فضا و ماحول کا انتظام کرنا چاہئے، خود ہوسٹل کے نگراں کے علاوہ بھی ان کا ملنا جلنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا جہاں تک ہو سکے کچھ نہ کچھ ایسے افراد اور جماعت کے ساتھ ہوتا رہے جو ایمان اور عمل صالح کی زندگی میں خود ذرا اچھے زندہ نمونہ ثابت ہوں، اور بات چیت سے بھی ان سے ان کے ذہنی میلانات ورجحانات کو جان پہچان کر سکتے ہوں، کتابی تعلیم کا بار زیادہ نہ ہو، روزہ اور نماز باجماعت کی پابندی تو لازم ہونا چاہئے، اس کے ساتھ زیادہ زور معاملات اور اخلاق کی اصلاح پر رہے، کتابی تعلیم میں آدھ گھنٹہ نماز فجر کے بعد ہی قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر، اس کے علاوہ حدیث کا ایسا انتخاب جس میں ایمانیات کے ساتھ اعمال صالحہ اور ان میں خصوصاً حقوق عباد، معاملات اخلاق اور معاشرت پر زیادہ توجہ دلائی گئی ہو اور روزمرہ پیش آنے والے ضروری ضروری فقہی مسائل کا مجموعہ۔''(۲)

---

(۱) حیات گیلانی از مفتی ظفیر الدین مفتی دارالعلوم دیوبند، ص/۱۹۲۔

(۲) حیات گیلانی بحوالہ مقدمہ مکاتیب گیلانی، ص/۶۱۔

مولانا دریابادی کا تاثر وتائید

یہ فکر ونظریہ جس میں جدید تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانان اسلام کے ہدایت پر قائم رہنے کا لائحہ عمل بتایا گیا، اوران کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کا بڑا حل تجویز کیا گیا ہے، اس کے دنیوی اسباب کے تحت مولانا گیلانی جہاں اس فکر کے خالق نظر آتے ہیں، اس کا دوسرا مرحلہ مولانا عبدالباری ندوی کے حصہ میں ہی آیا، اور تیسرا مرحلہ یعنی جس کے ذریعہ اس فکر کو آفاقیت ملی اوراس کی تکمیل ہوئی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے نصیب میں آیا، مولانا دریابادی نے اس پر ''صدق'' میں جولکھا ہے، مصنف حیات گیلانی کے شکریہ کے ساتھ پیش ہے:

> ''اب تو سفر یورپ سے واپسی پر ماشاء اللہ خود ہمارے علی میاں اس کفرستان تک تعلیم پانے والے مسلمان طلبہ کے لیے یہ تاثر اور پیام لے کر آئے ہیں کہ جہاں تک مسلمان طلبہ اور نوجوانوں کا تعلق ہے جو یہاں لاکھوں کی تعداد میں انگلستان، فرانس، جرمنی، اسپین میں زیر تعلیم ہیں، ان کی اصلاح وتربیت اوران کی اسلامیت کی حفاظت کے لیے سب سے بہتر نسخہ وہ ہے جو ہندوستان کے لیے مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے تجویز کیا تھا، اور اب ہمارے مولانا عبدالباری ندوی اس کے علمبردار اور داعی ہیں یعنی طلبہ کے لیے اقامت خانوں کی تاسیس اوران میں اچھے نگراں اور مربی کا انتظام۔''(۱)

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی پرزور دعوت

جیسا کہ مولانا دریابادی نے ان تینوں شخصیتوں کی تدریجی طور پر اس فکر و

---

(۱) حیات گیلانی بحوالہ صدق جدید مؤرخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۶۴ء لکھنؤ

دعوت کو تقویت پہنچانے اور عام کرنے میں کوششوں پر روشنی ڈالی ہے، وہ واقعاتی طور پر بالکل صحیح ہے، اس سلسلہ میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے درد وسوز اور فکرمندی کو ان کی اس تحریر سے سمجھا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے پوری قوت سے اس کی دعوت فکر وعمل دی ہے، انھوں نے لکھا کہ:

''اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا فتنہ اسی نوخیز نسل کا غیر اسلامی بلکہ معاند اسلام ذہن اور نفاق ہے، جس نے تمام اسلامی ممالک کو الحاد وزندقہ کے دوراہے پر کھڑا کردیا ہے، اور ایک سخت ذہنی انتشار اور کشمکش بلکہ اسلام کے خلاف بغاوت کا علمبردار بنادیا ہے، مولانا (سید مناظر احسن گیلانی) کی یہ بڑی دینی بصیرت تھی کہ انھوں نے اسلامی ''اقامت خانوں'' کی تجویز پیش کی، جو کم از کم ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا ایک علمی اور معقول حل ہے۔''(۱)

مولانا نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''اسلامیت ومغربیت کی کشمکش'' میں اس کو ایک عالمی دعوت کے طور پر پیش کیا اور لکھا:

''جدید اسلامی نسل کا معاملہ ایک دن کی تاخیر اور التواء کا روادار نہیں، مندرجہ بالا کام کی تکمیل تک (اور حقیقتاً اس کی موجودگی میں بھی) یہ کام ان اسلامی اقامت خانوں (Muslim Hostels) سے لیا جاسکتا ہے، جن میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے مسلم طلباء قیام کریں، اور وہاں اسلامی تربیت، اسلامی زندگی اور ماحول کے قیام اور صالح ذہنی و روحانی غذا کے مہیا کرنے کا خاص

---

(۱) حیات گیلانی از مفتی ظفیر الدین مفتی دارالعلوم دیوبند، ص/۱۹۵۔

اہتمام کیا جائے، اقامت خانوں کا طلبہ کی زندگی وسیرت اور ان کے اخلاق ورجحانات کی تشکیل میں جو گہرا حصہ ہے، اس سے وہ حضرات بے خبر نہیں جو اس نسل کا تجربہ رکھتے ہیں، اسلامیہ اسکول اور کالج (جن پر ملت کے سرمایہ اور توجہ کا قیمتی حصہ صرف ہو چکا ہے، بہت جگہ حالات کی تبدیلی سے اپنی افادیت کھو چکے ہیں، پھر اکثر وہ ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' کا مصداق ثابت ہوتے ہیں، ان کے برعکس اقامت خانوں کی تاسیس وانتظام کی مشکلات کم اور فوائد زیادہ ہیں، اور جہاں نظام تعلیم کا سرِ رشتہ صحیح الخیال و دردمند مسلمان زعماء وقائدین کے ہاتھ سے نکل چکا ہے، اور اس کی بازیابی کی جلد امید نہیں، وہاں یہ اقامت خانے ہی زیر تعلیم مسلمان نوجوانوں کی اخلاقی حفاظت اور ذہنی ودینی تربیت کا سامان کر سکتے ہیں، اور بہت سی سعید روحوں کو فاسد اور مفسد ماحول اور مسخ کرنے والے نظام تعلیم اور مراکز تعلیم کی سمّیت سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

ان اسلامی اقامت خانوں کی مسلم ممالک کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی ضرورت ہے، جہاں وہ مسلمان نوجوان بڑی تعداد میں تعلیم پاتے ہیں جو ذہانت وقوت عمل میں ملت کا سرمایہ اور جوہر ہیں، اور جن کے لیے بالعموم (اپنی ذہنی صلاحیتوں اور مغربی علوم والسنہ وسیاست سے واقفیت کی بناء پر) گویا مسلم ممالک کی قیادت اور کم سے کم ان کی کلیدی جگہیں مقدر ہو چکی ہیں، اگر ان مرکزوں میں ان کے رجحانات کی اصلاح اور

کر سکتے، باقی وقتی خطرہ کے لیے جو آج کل اس طرح کی تدبیریں سوچی جارہی ہیں کہ اگر حکومت کچھ نہ سنے اور اسلامی توحید کی عین ضد جبری شر کی تعلیم کی اصلاح نہ ہو تو خود مسلمانوں کی طرف سے مسلمانوں کی تمام آبادیوں میں ہزاروں لاکھوں ایسے مکتبوں کا جال بچھا دیا جائے جن میں سرکاری جبری مدرسوں کے علاوہ بچے گھنٹے دو گھنٹے دینی تعلیم حاصل کیا کریں ان میں کوئی مستقل و مستمر کامیابی بجائے خود بھی مشتبہ ہی ہے، باقی ایمان و عمل کا جو ذہنی و نفسیاتی رسوخ گھریلو اور روایتی فضا سے پیدا ہوتا ہے، وہ تو بہر حال نرے کتابی مکتبوں سے نہیں پیدا کیا جا سکتا۔

اور اسی وجہ سے مشتبہ ہے کہ مسلمان گھرانوں میں دین کے عملی و روایتی تعامل و توارث کے مٹ جانے سے دین کی قدر و قیمت عوام کے دلوں میں اتنی نہیں رہ گئی ہے کہ ان کے نجی مکتبوں کے وسیع پیمانہ پر قیام و بقا کے لیے بہ قدر ضرورت سرمایہ جمع کیا جا سکے یا وہ اپنے بچوں کو ہنسی خوشی ان میں پڑھنے پر مجبور کریں، عوام تو عوام آج ہمارے مسلمان خواص ہی ایسے کتنے ہیں جو دنیوی تعلیم کی دنیوی ترغیبوں کو چھوڑ کر یا اس کے ساتھ ساتھ ہی قدرت و وسعت رکھتے ہوئے ضمناً ہی سہی خود اپنے بچوں کے لیے کوئی فکر کرتے ہوں، فکر و تدبیر تو اس چیز کی ہوتی ہے جس کی دل میں قدر و قیمت ہو، ایسی وقتی تحریکیں وقتی بحران کو تو ٹال سکتی ہیں لیکن مرض کا مستقل علاج نہیں۔" (۱)

---

(۱) نظام صلاح و اصلاح از مولانا عبدالباری ندوی

پاکستانی مسلمان

پاکستانی مسلمانوں کے لیے خطرات اور اندیشوں کا ادراک و احساس کرتے ہوئے ان کے روشن مستقبل کے لیے علاج تجویز کرتے ہیں:

"پاکستان کی بھی ساری مصیبت یہی ہے کہ مسلمانوں کا دین کے علم و عمل سے توارثی نہ تعاملی یا روایتی تعلق زندہ نہیں رہا تھا، اب جوان کو آزادی ملی تو قدرتاً ہندوستان والوں ہی کی طرح زرطلبی و دنیا پرستی کی طرح طرح کی بدعنوانیوں، رشوت ستانیوں اور فسق و فجوری کی راہوں میں اور زیادہ آزاد ہو کر کھل کھیلے، تعجب ہوتا ہے کہ یہ دیکھ کر بھی حضرات علماء کے اپنے اصل فرض مسلمان سازی سے زیادہ کیا کہنا چاہئے کہ تمام تر دستور سازی وغیرہ کے سے وقتی مسائل ہی کی طرف منعطف ہے، اس کا نتیجہ بھی صفر ہی نکلتا نظر آتا ہے، یہ وہی اصل مرض کے بجائے اشتداد مرض کے وقتی و ظاہری علامات پر سارا زور لگا دینے کی غلطی ہے، سوچنے کی بلکہ انتہائی شرم کی بات ہے کہ ایسی مسلمان حکومت جو اسلام اسلام کے فلک شگاف نعرے لگا کر قائم کی گئی ہو، اس میں خود مسلمانوں ہی سے اسلامی دستور بنانے کا مطالبہ کرنا پڑ رہا ہو، جس طرح غیروں (انگریزوں) سے آزادی کا کرنا پڑ رہا تھا، پھر اس مطالبہ کے ماننے اور منوانے میں بھی ہر طرح کی دشواریاں اور رکاوٹیں خود مسلمانوں ہی کی طرف سے ڈالی جا رہی ہوں، کیسے غضب و عبرت کے مناظر ہیں یہ، بات وہی ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کے سوا اپنے مسلمان ہونے کے تمام دوسرے

ایمانی وعملی مطالبوں کو ہم بالکل بھول بھلا چکے ہیں، ہمارے ذہن میں تو اسلامی یا دینی حکومت کا مطلب بھی لے دے کر یہی رہ گیا تھا کہ بٹوارہ کرا کے بلاشرکت غیرے حکومت و آزادی کے دنیاوی مزے پوری طرح پوری آزادی سے لوٹنے کو ملیں گے۔ غرض ہندوستان ہو یا پاکستان، عرب ہو یا عجم جہاں کہیں کے مسلمانوں پر نظر ڈالئے، ایک ہی مرض کا شکار پائیں گے کہ قولاً اپنے کو مسلمان کہنے کے باوجود عملاً زندگی کے ہر شعبہ میں ایمان وعمل صالح کی اسلامی زندگی فراموش ہو چکی ہے، علاج خود فراموشی کی پیدا کی ہوئی ان ساری بیماریوں کا قدرتاً ایک ہی ہے، یاددہانی یا تذکیر کے منصوص و مامور طریقے - دعوت الی الخیر- کو ہمہ گیر بنانا اور معروف ومنکر کے امر و نہی کے ذریعہ معاشرہ میں اس کو از سر نو برپا کرنا، اور اس کام کا اساسی وخصوصی طور پر جب ایک خاص جماعت "منکم امة" والے علماء ہی پر فرض عائد کیا گیا، جب تک وہی جماعت عرب وعجم ہر جگہ اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے پوری طرح بیدار و کمربستہ نہ ہوگی، اس وقت تک جڑیں بہرحال دن پر دن سوکھتی چلی جائیں گی، اور خالی شاخوں پر پانی ڈال ڈال کر پھل لانے کی ساری کوششیں احمقانہ توقعات بنتی رہیں گی۔"(۱)

دینی دعوتی اور سیاسی جماعتوں پر تبصرہ

غیر منقسم ہندوستان میں جن تحریکات اور جماعتوں نے دین وملت کو تقویت

(۱) نظام صلاح واصلاح از مولانا عبدالباری ندوی

پہنچانے اور مختلف جہات میں دعوت کا کام انجام دینے کے لیے غیر معمولی کوششیں کیں، ان کی ان کوششوں کے نتائج جس طور پر سامنے آئے، اور پھر ان میں جمود پیدا ہونے کے نتیجہ میں مسلم معاشرہ میں جو خامیاں سامنے آئیں، اس پر مولانا نے جو مشورے دیئے ہیں ایک بڑے مفکر و مصلح کا ہی حصہ ہے، ان کی کتاب ''نظام صلاح و اصلاح'' سے ہی یہ اہم فکر انگیز اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

جمعیۃ العلماء:

''ہندوستان و پاکستان میں نظم و نظام کے ساتھ جو جماعتیں اپنے اپنے رنگ میں دینی نقطہ نظر سے کچھ اسلامی خدمات انجام دے رہی ہیں، تاریخی اولیت ان میں غالباً جمعیۃ العلماء کو حاصل ہے، یہ اجنبی حکومت وقت کے مقابلہ میں دینی نقطہ نظر لے کر ابتداءاً سیاسی محاذ پر رونما ہوئی تھی، تقسیم تک اس کا رخ کم و بیش تمام تر اسی محاذ پر رہا، نئے حالات میں بھی زیادہ تر حکومت کی راہ و تعلق سے کچھ وقتی غیر سیاسی دینی و دنیوی خدمات - مثلاً ابتدائی جبری تعلیم کا مسئلہ یا متروکہ جائیدادوں کا معاملہ - کی طرف متوجہ رہی ہیں، یقیناً یہ بھی سب مسلمانوں ہی کی خدمات، خصوصاً جبری تعلیم کا مسلمانوں کی آئندہ نسلوں پر جو ایمان لیوا اثر ناگزیر ہے، اس کا کوئی توڑ نکالنا ایک اعتبار سے ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں وقت کے سب سے شدید دینی خطرہ و فتنہ کا سدباب ہے، لیکن ہے بہرنوع یہ بھی وقتی خدمت و ضرورت، بلکہ اس وقتی خطرہ و فتنہ سے اس خطرناک شدت کے ساتھ دوچار ہونا پڑا ہے اس لیے کہ حضرات علماء نے دعوت الی الخیر اور معروف و منکر کے

امر و نہی کی اپنی مستقل منصبی خدمات سے قاصر رہے، علماء کے ہر فرد اور ہر جماعت و جمعیت کا اصل فرض اپنے اسی مستقل منصب کو ہاتھ میں لینا اور اس کا حق پورا کرنا ہے، پھر انشاء اللہ وقتی مسائل و مشکلات اولاً تو پیدا ہی کم ہوں گے اور جو ہوں گے ان کا حل آسان ہی ہوگا اور امت ''منکم اُمۃ'' والی جماعت کے اثر و نگرانی میں رہ کر ہی نہیں یقیناً دنیوی یا سیاسی و معاشی فتنوں، فسادوں سے بھی محفوظ رہے گی یا آسانی کے ساتھ ان سے عہدہ برآ ہو سکے گی، جب مسلمانوں کی دنیا یا سیاست و معیشت سب کی سب بالکلیہ ان کے دین کے تابع ہے تو متبوع کی درستی از خود تابع کی درستی کو مستلزم ہے اور کسی وقتی و عارضی نادرستی و فساد کے ظہور کی صورت میں اس کی اصلاح بھی آسان ہی ہوگی۔''(۱)

جماعت اسلامی:

دوسری نسبتاً نو پیدا جماعت اسلامی ہے، یہ بھی اصلاً سیاسی میدان ہی کی پیداوار ہے جو حکومت و سیاست کے غیر اسلامی نظامات و نظریات کے مقابل الٰہی حکومت یا اسلامی سیاست کی برتری کی دعوت و دعویٰ لے کر اٹھی تھی، نقطہ نظر یہ تھا اور بڑی حد تک اب بھی ہے کہ مسلمانوں کی ہر قسم کی صلاح و اصلاح کے لیے مقدم سیاسی انقلاب ہے، بلا اسلامی حکومت کے نہ مسلمان مسلمان بن سکتے ہیں، نہ ان کے دینی و دنیوی مسائل و مشکلات حل ہو سکتے ہیں، یہ درحقیقت انبیائی تعلیم و تاریخ کی پوری منطق کو الٹ کر

---

(۱) نظام صلاح و اصلاح از مولانا عبدالباری ندوی

نتائج کو مقدمات اور مقدمات کو نتائج بنا دینا تھا، حضرات انبیاء اور انبیائی راہ پر چلنے والوں کا سب سے پہلا کام دعوتی جد وجہد سے ایمان وعمل صالح کی زندگی یا معاشرہ پیدا کرنا ہے، باقی دینی یا الٰہی حکومت کا قیام و بقا خود خدا کی طرف اور اس کی نصرت خاص سے موعود ومشروط نتیجہ یا انعام ہے، پہلے ایمان وعمل صالح والا معاشرہ پیدا کر لینے کا ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّكُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ (۱) یعنی جولوگ (کسی معتد بہ جماعت یا معاشرہ کی صورت میں) ایمان وعمل صالح کی زندگی کا ثبوت دیتے یا اس کا حق ادا کرتے ہیں ان کو زمین کی خلافت (اسلامی یا الٰہی حکومت) بھی ضرور اللہ تعالیٰ عطا کر کے رہے گا۔

تاہم جماعت اسلامی کی الٹی منطق کا ایک وقتی فائدہ ضرور ہوا کہ جدید تعلیم یافتہ افراد وطبقات جن کی ساری تعلیم وتربیت کا محور اسی دنیا کا جاہ ومال ہوتا ہے- اور حکومت دونوں کا مظہر اتم ہے- ان میں بہتوں کا رخ دنیا کی اس راہ سے دین کی طرف پھر گیا، غلط راستہ پر کچھ اور چلنے کے بعد آدمی منزل کی سمت مڑ جائے تو صبح کا بھولا شام تک انشاء اللہ ٹھکانہ ضرور پہنچ جائے گا، بعد کو الحمدللہ اس جماعت کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی الٹی منطق کا کچھ احساس ہوا اور ''حکومت الٰہیہ'' کے بجائے ''اقامت دین'' کی تعبیر اختیار کر لی، خصوصاً ہندوستان میں کام کرنے والی جماعت اسلامی تو اس تعبیر وتبدیل کا حق بھی ماشاء اللہ کافی ادا کر رہی اور

---

(۱) سورہ نور/۵۵

اپنی منطق کو سیدھا کرتی جارہی ہے، دونوں میں بڑی خامی ایک ہی ہے کہ ان کے اکابر واصاغر سب کا دینی فہم وفکر زندہ اہل علم و عمل کی تعلیم وتربیت سے ماخوذ ہونے کے بجائے زیادہ تر صرف کتابوں پر مبنی ہوتا ہے، لازماً غیر تربیت یافتہ ذہانت و ذہنیت اور تحریر وتقریر کے انشائی وخطابتی زور میں بارہا افراط و تفریط میں پڑ کر کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں، کسی تجربہ کار ماہر طبیب کے مطب میں نسخہ نویسی کی مشق کے بغیر طب کی خالی کتابیں پڑھ کر ان حضرات نے مطب کھول دیا اور علاج کرنے لگے، بس یہی ان کی ساری خامیوں کی جڑ ہے۔

اصل میں یہ کام بھی جدید سیاسی افکار واحوال اور ان کے عیب وہنر سے پوری طرح آگاہی فرما کر ''علماء راسخین'' ہی کا تھا، جب انھوں نے وقت کی اس ضرورت کا احساس اور اس کے لیے ضروری تیاری نہ فرمائی تو ضرورت تو ضرورت ہی ہے، اپنے تقاضوں کو کسی نہ کسی طرح پورا کر ہی چھوڑتی ہے، جوان کو پورا کرنے کے لیے میدان میں آگیا، لوگ اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں، اب جو حضرات علماء ان کی بے راہ روی یا بے اعتدالیوں کی شکایت فرماتے ہیں، ان کو سوچنا چاہئے کہ میدان خالی چھوڑ دینے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اور کیا اس کا تدارک محض کچھ تردیدی رسالوں یا تکفیری فتوؤں سے ممکن ہے؟''(۱)

---

(۱) نظام صلاح واصلاح از مولانا عبدالباری ندوی

تبلیغی جماعت:

سچ پوچھئے تو نبوت واسلامیت کی سیدھی صحیح راہ ومنطق بڑی حدتک اختیار کرنے والی نمایاں جماعت اس وقت ''جماعت الیاسی'' یعنی حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت ہے، اس کو بعض جواں سال وجواں ہمت دین کے ایسے اہل علم مل گئے ہیں جن کا علم وفکر ایک طرف محض کتابی نہیں بلکہ خود حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ودیگر مستند ''راسخین فی العلم'' علمائے امت کی صحبت وتربیت سے ماخوذ ہے، دوسری طرف انھوں نے اپنے تن من دھن سب کی بازی حکومت وسیاست سے قطع نظر فرما کر پہلے مسلمانوں کو مسلمان بنانے یا دعوت واصلاح کی انبیائی خدمت پر لگا رکھی ہے، ساتھ ہی خود اپنے کو اصلاح وتربیت سے اب بھی بے نیاز نہیں سمجھتے، اسی کی برکت ہے کہ باوصف ذہن وذہانت انشاء وخطابت اور جدید معلومات و رجحانات سے خاص مناسبت وواقفیت میں جماعت اسلامی سے کسی طرح پیچھے نہ ہونے کے امت میں انتشار پیدا کرنے والی خودرائی اور اجتہاد وتجدد سے الحمدللہ بالکل محفوظ ہیں۔

راقم نالائق وناکارہ کی نظر میں ایک ہی کمی۔ بہت بڑی کمی۔ تھی کہ ان حضرات کی توجہ کہنا چاہئے کہ تمام تر ایمان وایمانیات کے احیاء یا ان کے راسخ وصادق بنانے تک محدود تھی ''عملوا الصالحات'' میں صرف نماز روزہ پر زور تھا، حتی کہ بہتوں نے اس کو صرف کلمہ ونماز کی تحریک سمجھ لیا ہے، باقی دین وشریعت کا وہ

پورا حصہ جس سے خود اس دنیا کی پوری زندگی سراپا دین واسلام بنتی ہے یعنی خالق کے ساتھ مخلوق یا بندوں کے باہمی تعلقات وحقوق۔ معاملات واخلاق ومعاشرت۔ ان پر توجہ نہ ہونے کے برابر تھی، حالانکہ ان کے بغیر خود ایمان وایمانیات ناقص اور بے جان رہتے ہیں، ایمان وعمل دونوں ایک دوسرے پر عمل وردعمل ہی سے زندگی وتازگی اور قوت واستقامت پاتے ہیں جس طرح اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے روح وروحانیت کی ترقی وتکمیل کو جسم و جسمانیت (یا اعمال جسم) کے ساتھ وابستہ فرمادیا ہے، اسی طرح دین کی روح ایمان کی تکمیل نہ بغیر اعمال صالحہ کے ہوسکتی ہے اور نہ بلا عمل ایمان میں رسوخ واخلاص ہی نصیب ہوسکتا ہے۔'' (۱)

تحریک دعوۃ الحق:

دعوۃ الحق کے نام سے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جامع دعوتی نظام مرتب فرمایا تھا، جس میں امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر پر بھی بڑا زور تھا، خاموشی سے، سنجیدگی کے ساتھ ان کے متعلقین اپنی اپنی جگہوں میں اس کام کو انجام دیتے رہے، لیکن مولانا عبدالباری ندوی کو ان کے متعلقین اور خلفاء میں جن کے کام پر زیادہ اطمینان تھا وہ محی السنہ مولانا ابرارالحق صاحب کی ذات گرامی تھی، مولانا عبدالباری ندوی جو کہ خود بھی حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کے اجلہ خلفاء میں ہیں، اپنا تجزیاتی تأثر بیان کرتے ہیں:

''یادش بخیر! ایک اور نسبتاً گمنام جماعت کیا فرد فرید کے مدنظر دونوں پہلو نظر آئے، مراد ہردوئی (یوپی) کے اشرف المدارس

---

(۱) نظام صلاح واصلاح از مولانا عبدالباری ندوی

والے حضرت مولانا ابرار الحق سلمہ ہیں، ماشاء اللہ اپنی ذات ہی سے ایک چھوٹا موٹا مدرسہ بھی ہیں، جس میں عمل اور عملی نگرانی پر علم سے کم نہیں زیادہ ہی زور ہے، طلباء ہی نہیں اساتذہ وغیرہ دیگر متعلقین مدرسہ کے معاملہ میں بھی اس کا پورا اہتمام رہتا ہے، کہ ان کی صورت وسیرت عملی واخلاقی زندگی دینی مدرسہ کے شایان شان ہو، عام دینی مدرسوں میں ایک بڑا دینی روگ ہے کہ مجلس شوریٰ وانتظامیہ وغیرہ کے ارکان واعضا کیا معنی خود اساتذہ اور خاص مدرسہ کے متعلقین وملازمین تک کی عملی واخلاقی حالت کی پرواہ کم ہی کی جاتی ہے، حال ہی میں ایک نامی گرامی دارالعلوم کے متعلق یہ معلوم ہوکر انگشت بدنداں رہ گیا کہ ایک معلم صاحب کہنا چاہئے کہ رشوت وخیانت کی بھی تعلیم اپنے شاگردوں کو باقاعدہ دیتے ہیں، حیرت بالائے حیرت کہ اس کو خبر بھی اہل اہتمام واختیار کو پوری طرح اور مدتوں سے ہے، باقی معمولی دینی واخلاقی کمزوریوں کا سبق تو خود اپنے نمونوں سے ہمارے دینی مدارس و منتظمین، ارکان واعیان کم وبیش سب ہی دیتے رہتے ہیں، اشرف المدارس میں ایسے مدرسین وغیرہ کی قطعاً کوئی جگہ نہیں جو خود صورۃً وسیرۃً صالح یا کم از کم اپنی اصلاح کے لیے تیار نہ ہوں۔

مدرسہ ہی کی طرح مولانا سلمہ کہنا چاہئے کہ اپنی ذات ہی سے ''دعوۃ الحق'' نام کی ایک سراپا دعوتی واصلاحی تحریک بھی ہیں، اس کی بھی خاص خصوصیت یہی ہے کہ نفس دعوت خیر کی حد تک

ایمان وعمل صالح کے تمام شعبوں کی طرف بلایا اور متوجہ کیا جاتا ہے، معروف ومنکر کے امر ونہی کو پورے قرآنی واسلامی مذکورہ صدر نظم ونظام کی طرف ذہن کو التفات نہیں، تاہم خطاب خاص وعام دونوں سے اس کا حق بھی بہت کچھ ادا ہوتا رہتا ہے۔

البتہ ایمان وعمل صالح کی پوری اسلامی زندگی کا کوئی نمونہ کا معاشرہ پیدا کرنے کے لیے صبر آزما کام کی طرف دعوۃ الحق کی تحریک کو بھی کوئی توجہ نہیں۔

توسیع وتعمیر کے حق میں بھی اس دعوت میں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ اس کے خدمت گذار عصری اسلحہ سے عملاً بالکل غیر مسلح ہیں، نہ عصری علوم ومعلومات، نہ عصری رنگ کی انشاء وخطابت، نہ کتابیں، نہ رسائل واخبارات، غرض عصری پروپیگنڈہ کے جائز وضروری سامان بھی نہ ہونے کے برابر ہے، لازماً وسعت و کمیت یا پھیلاؤ کے لحاظ سے تحریک کی رفتار بہت دھیمی ہے، لیکن اسی نسبت سے کیفیت کا رنگ خاصا گہرا بھی ہے یعنی اس دعوت سے جو ذرا زیادہ قریب ومانوس ہوتا ہے، نماز روزہ کے علاوہ اس کے معاملات واخلاق اور معاشرت میں بھی خاصی اسلامیت نمایاں ہوتی ہے، باطن سیرت کا انقلاب قدرۃً ظاہر و صورت پر بھی پڑنے لگتا ہے، یوں بھی دعوت خیر کے ساتھ معروف ومنکر کے امر ونہی کے امتزاج واہتمام سے مسلمان صدیوں سے اتنے اجنبی ہو چکے ہیں، کہ دونوں کی جامع دعوت میں طول وعرض کی زیادہ وسعت پیدا ہونا بہت دیر طلب اور

بڑی جدوجہد کا طالب ہوگا۔"(۱)

عصری تقاضوں کی طرف توجہ کی ضرورت

عصری تقاضوں اور مطالبات کو نظر انداز کرنا مولاناؒ کے نزدیک داعی کا بڑا نقص ہے، اس سلسلہ میں مولانا نے علماء کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

"حاصل معروضات اور بار بار عرض کرنے کی بات یہی ہے کہ امت کی ہر جگہ کی ہر بگڑی کو بنانے کی تدبیر فقط ایک ہی ہے کہ "منکم امة" والے علماء امت جو اس امت کے راعی ونگہبان یا رکھوالے قرار دیئے گئے ہیں، وہ اپنی رکھوالی کی دونوں ذمہ داریوں کا حق ساتھ ساتھ اسی طرح ادا کریں جس طرح خود قرآن مجید ہی میں وہ ساتھ ساتھ ان پر عائد فرمائی گئیں ہیں:

۱- یعنی خیر کی طرف لوگوں کو بلانا جس سے مراد ظاہر ہے کہ کامل خیر یا "دین کامل" کی ایمان وعمل صالح والی زندگی کے ہر شعبہ -عقائد وعبادات ومعاملات واخلاق اور معاشرت- کے احکام کی دعوت ہے۔

۲- اور ساتھ ہی ساتھ معروف ومنکر کے امر ونہی کے ذریعہ ان احکام کی عملی ترویج ونگرانی۔ ان ہی دونوں کی ہم آہنگی دعوت اور اصلاح دین کی وہ بنیاد ہے کہ جتنی زیادہ یہ استوار ومستحکم ہوگی اتنے ہی زیادہ مسلمان اپنے ایمان وعمل میں راسخ و پختہ ہوں گے، اس طرح ایک طرف نہ قادیانی وپرویزی وغیرہ گھر کے

---

(۱) نظام صلاح واصلاح از مولانا عبدالباری ندوی

بھیڑیوں کے لیے ان مستحکم وراسخ ایمان وعمل والوں کو شکار کرنا آسان ہوگا اور نہ ایسے پختہ ایمان وعمل والے مسلمان والدین کی گود اور گھر میں پرورش پائی ہوئی اولاد کو غیر اسلامی - نام نہاد سیکولر- جبری تعلیم کے ذریعہ اسلام سے اس طرح اور اس آسانی سے گمراہ و دور کرنا آسان ہوگا، جس طرح آج اسکول میں جاتے ہی وہاں کا رنگ چڑھ جاتا ہے تاہم تا بہ امکان ابتدائی تعلیم میں ان کو خالص سرکاری اسکولوں سے بچانا بھی ضروری ہے، ان کی عملی جیتی جاگتی اسلامی زندگی خود باہر والوں یا غیر مسلموں کے لیے کانوں سنی تقریری وتحریری تبلیغ سے کہیں زیادہ کارگر یہ آنکھوں دیکھی دعوت وتبلیغ ہوگی، زبان آوری کی باتیں دلوں میں اترنے سے زیادہ ہوا میں گم ہوکر رہ جاتی ہیں۔

البتہ اب جس نئے عہد وعصر میں ''دعوت الی الخیر'' اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر قرآنی واسلامی نظم ونظام کو از سر نو اٹھانا اور کھڑا کرنا ہے اس کے نئے تقاضوں اور اور عصری مطالبوں کا حزم واحتیاط کے ساتھ مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ تجدید کے مطالبات کا حق بھی ادا ہو اور تجدد کی بے راہ رویوں سے حفاظت بھی ہو۔''(۱)

نظام دعوت وتبلیغ کی تدوین کی ضرورت

یہ وہ اہم مشورہ اور ایسا فکرہ ہے جس کی طرف بہت کم مفکرین مصلحین اور علمائے راسخین کا ذہن منتقل ہوا، اس سلسلہ میں مولانا کی تحریر کا اقتباس ملاحظہ ہو:

---

(۱) نظام صلاح واصلاح از مولانا عبدالباری ندوی

"ہمارے ائمہ دین نے کتاب وسنت اپنے علم وفراست، تقویٰ و طہارت کی روشنی میں جس طرح دینی تعلیمات کے ہر شعبہ کے کلیات وجزئیات کو مستنبط ومرتب فرمادیا ہے اسی طرح دعوت خیر یا تبلیغ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے اصول وفروع کو بھی بڑی کاوش ودانش سے منضبط فرمادیا ہے، ہمارا کام زیادہ تر بس ان کو بدلے ہوئے عصری ظروف ودواعی کے قالب میں ڈھال لینا ہے، خاص طور پر حکمت وفراست اور تدبیر وتدبر سے کام لینے کی ضرورت معروف ومنکر کے امر ونہی کی تجدید وترویج میں ہے کہ یہ امت کے عوام کیا خواص وعلماء تک میں کم وبیش کا بالکلیہ متروک ہوجانے کی بدولت، اس کے اصول وآداب سب ہی فراموش ہوچکے ہیں، شاذ ونادر کوئی اس فرض کو گھر باہر ادا بھی کرتا ہے، تو دیکھا اکثر اندھے کی لاٹھی چلانے لگتا ہے، حالانکہ اسلام کی بڑی خصوصیت اعتدال وتوازن ہے، اس کے تمام اوامر ونواہی ہی تعدیلی حدود وقیود سے مقید ہیں، ایک احیاء العلوم ہی میں معروف ومنکر کے امر ونہی کے ان حدود وقیود و اصول وآداب کے تمام اطراف وجوانب پر بڑی سیر حاصل بحث موجود ہے، ذرا صحیح ذوق تجدید سے کام لے کر ان کو جدید احوال وظروف کے مطابق بنالینا ہے۔

عملی رہنمائی کے لیے اصل الاصول اس باب میں ایک ہی بات ہے، حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمہ کے ہاں اس پر خاص زور تھا کہ معاصی ومنکرات کی نوعیت تمام تر دینی واخلاقی وروحانی

بیماریوں کی ہے، لہٰذا ان کے بیمار کے ساتھ معاملہ بالکل وہی کرنا چاہئے جو جسمانی بیماریوں کے بیمار کے ساتھ کیا جاتا ہے، یعنی معاصی سے نفرت اور عاصی پر شفقت، جسمانی بیماری میں ہمارا معاملہ اپنوں پرایوں، دوستوں عزیزوں، چھوٹوں بڑوں سے کیا ہوتا ہے؟ یہی نا کہ بیمار پر تو ہم کو ترس ورحم ہی آتا ہے لیکن بیماری کو دور کرنے میں حسب تعلق اپنی والی کوئی جانی ومالی، ترغیبی و ترہیبی سعی وتدبیر اٹھا نہیں رکھی جاتی، نہ بیمار کی کسی بے جا خوشی و خواہش یا رعایت کا لحاظ کیا جاتا ہے، کڑوی سے کڑوی دوا، بڑے سے بڑے آپریشن، سخت سے سخت پرہیز سب ہی کچھ کرنا کرانا پڑتا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ مستقل و دیرپا تکلیف یا ہلاکت سے بچانے کے لیے یہ ظاہری سختیاں بھی عین ہمدردی و خیرخواہی یا شفقت ہی شفقت ہوتی ہیں۔

پھر آخرت کی زندگی سے بڑھ کر کون زندگی مستقل ودائمی ہوگی، اور اس کی ہلاکت وبربادی سے بڑھ کر کون سی ہلاکت وبربادی ہوگی، آخرت پر اگر ایمان ہے تو وہاں کی چھوٹی سے چھوٹی راحت ومصیبت کو یہاں کی بڑی سے بڑی راحت ومصیبت کے مقابلہ میں بھی نظرانداز کرنا کیسے جائز ہوگا، اسی طرح موقع و مناسب اور ذمہ داری ومسئولیت کے لحاظ سے جہاں نرمی و ترغیب سے کام نہ چلے، منکرات کو روکنے کے لیے اختیاری جبر و سختی کو بھی کام میں لینا جائز ہی نہیں واجب ہوگا، حدیث میں تغیر بالید سے اسی کو تعبیر فرمایا گیا ہے کہ جہاں بس چلے منکر کو ہاتھ

وقوت سے مٹانا بھی فرض ہے۔

البتہ اس جبر وسختی، تخویف وترہیب کا بھی رنگ وہی ہمدردانہ و خیرخواہانہ ہو جو ایک مہربان معالج یا تیمار دار کا بیمار کے ساتھ حسب ضرورت دوا وعلاج اور پرہیز کے معاملہ میں سختی وزبردستی کا ہوتا ہے، نہ کہ نفرت وحقارت یا بے ضرورت غصہ وگرمی کا، دوسری شرط یہ ہے کہ جبر وزبردستی میں کسی فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو، تیسری خود امر ونہی کرنے والے کو جانی ومالی ایسا شدید ضرر نہ پہنچے جس کو وہ صبر کے ساتھ برداشت یا مدافعت کی قوت نہ رکھتا ہو، لیکن اگر برداشت کرسکتا ہو تو سبحان اللہ عین عزیمت و جہاد ہے، اسی لیے حدیث میں منکر کو روکنے کے لیے حسب استطاعت وبرداشت تین درجات رکھے گئے ہیں، ایک ہاتھ یا قوت سے جہاں اس کی قوت ہو، دوسرا زبان سے، اگر اتنے کی بھی ہمت یا موقع نہ ہو تو آخری درجہ جس کو ایمان کا کمزور سے کمزور درجہ قرار دیا گیا ہے یہ ہے کہ کم از کم دل سے برا جانے، جس کا لازمہ یہ ہے کہ خود کو جہاں تک ہوسکے دور ونفور رکھے۔

گو ہمارے اندر اب اتنی دینی حمیت وحرارت ہی کتنوں میں ہے کہ دین وایمان کے معاملات یا معاصی ومنکرات پر غصہ آتا ہو، دل سے برا جاننے والے اور برائیوں سے دور ونفور یا ان میں شرکت سے گریز کرنے والے بھی خال خال ہی ہوں گے، تاہم تھوڑے بہت ہر طرح ہی کے لوگ ہوتے ہیں، ممکن ہے اوپر معروف ومنکر کے امر ونہی کی دینی اہمیت پر جو زور دیا گیا ہے،

اس سے متاثر ہوکر کوئی بندۂ خدا الٹی سیدھی لاٹھی چلانے لگے، اس لیے احتیاطاً چند اصولی قیود و شرائط بھی آخر میں عرض کر دیئے گئے، باقی جس طرح حضرات علماء کا کام دعوت خیر کے سلسلہ میں ایسے احکام کی تعلیم و تبلیغ ہے جن سے روزمرہ کی زندگی میں واسطہ پڑتا ہے اسی طرح معروف و منکر کے نفس امر و نہی کے حکم کی تعلیم و تبلیغ کے ساتھ اس کے وجوب و استحباب اور جواز کے ضروری ضروری احکام یا قیود و شرائط بتلاتے رہنا بھی ضروری ہے، اور پڑھے لکھوں کو مناسب کتابوں کے نام۔" (۱)

نامۂ وصیت (☆)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جانِ پدر- عائشہ امۃ الباری سلمہا!

اللہ تعالیٰ نے تمہارے باپ کو اپنے اس نالائق ہی نالائق بندہ کو ہزاروں لاکھوں بندوں سے بڑھ کر دنیا کی راحت و عزت بخشی، مگر جب سے کچھ دین کا ہوش بھی عطا فرمایا، بے دین کی دنیا کا الحمدللہ کبھی حریف نہیں بنایا، نہ اپنے لیے، نہ تم بال

---

(۱) نظام صلاح و اصلاح از مولانا عبدالباری ندوی

(☆) مولانا عبدالباری ندوی کا یہ ایمان افروز مکتوب جو انھوں نے اپنی صاحبزادی کو تحریر فرمایا ہے، ان کے واسطہ سے تمام بنات اسلام کے لیے خصوصاً اور پوری امت مسلمہ کے لیے ایک وصیت کی حیثیت رکھتا ہے، اور نہایت کارآمد ہے، گویا حضرت یعقوب علیہ السلام کی قرآنی وصیت "ما تعبدون من بعدی" کی جامع ترین تشریح و توضیح ہے جو انھوں نے اپنے صاحبزادگان کو کی تھی، یہ "نامۂ وصیت" ماہنامہ رضوان لکھنؤ کی اشاعت اپریل ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا، راقم استاذی المحترم مولانا نذیر احمد صاحب رائے بریلوی کا شکرگذار ہے کہ ان کی کرم فرمائی سے یہ شمارہ نظر سے گذرا اور یہ فیض حاصل ہوا۔ (م)

بچوں کے لیے، نئی اسکولی کالجی تعلیم جس کے پیچھے ہم نام کے مسلمان بھی دنیا ہی دنیا کے لالچ میں بے تحاشہ دوڑے جارہے ہیں، تم جانتی ہو کہ اس کے پاس لڑکیوں کیا، لڑکوں تک کا بھیجنا گوارہ نہیں کیا، اس لیے ایک طرف یہ تعلیم سے زیادہ پیٹ کا دھندہ ہے اور دوسری طرف دین کی، ایمان کی تباہی کا سودا ہے، اور لڑکیوں کے حق میں تو غیرت وشرافت کا بھی، یوں کچھ ہیضہ، طاعون کی وبا میں بھی بچے جاتے ہیں، ان کا کیا اعتبار، ایسی تعلیم سے اگر دنیا کی بادشاہی بھی مل جائے تو اس سے خدا کی ہزار بار پناہ اور دین وایمان کی سلامتی کا فاقہ ہزار درجہ بہتر۔

ساتھ ہی ایک بات عمر بھر کے تجربہ کی گرہ باندھ لو، بڑے سے بڑے مال و دولت والوں اور ولایت تک کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم والوں کو بہت قریب سے دیکھنے کے موقعے ملے، مگر بنگلہ، گھر، موٹر، شوفر کی نمائشی چمک دمک کے سوا دل کا سکھ چین کسی ایک کے پاس نہ پایا، دل کے سکون اور راحت کی دولت ان میں بھی صرف اسی کے پاس اور اتنی ہی پائی جس کے دل میں جتنا خدا کو پایا، ورنہ جھونپڑوں اور دال روٹی والے اللہ والوں کو دنیا میں بھی جتنا مگن پایا، اِن کوٹھی، محل اور لنچ، ڈنر والوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی، اس بات کو پوری طرح سمجھنا چاہئے، میری کتاب ''تجدید تصوف'' کا باب ''حیات طیبہ'' (مزہ دار زندگی) پڑھ لے، دنیا کا زیور اور جہیز بھی اللہ میاں نے ہزاروں دنیا والوں سے بہتر ہی تم کو دیا ہے، لیکن یہ لاکھوں کروڑوں کا بھی ہو تو کس کے گے دن کام آتا ہے؟

دین ہی نہیں دنیا کی سمجھ بوجھ کی بات یہ ہوگی کہ سچا زیور اس کتاب ''بہشتی زیور'' کو جانو، یعنی اللہ ورسول کی خوشی ناخوشی کی باتوں اور آخرت کی ناختم ہونے والی راحتوں اور مصیبتوں کا علم ہی سچا علم ہے، اور اسی پر عمل سے دنیا بھی سنورتی ہے، اس زیور کی قدر تم کو، تمہارے شوہر، ساس، سسر، سسرال یا جس گھر گھرانے والے بھی مل

جل کر جتنی زیادہ کریں گے، ان کی دنیا بھی جتنی بہشت بن سکتی ہے انشاء اللہ بن کر رہے گی، البتہ اکیلا کرنے والا نکو ضرور ہوگا، اور دنیا دار اس سے ناراض بھی ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ اتنا ہی زیادہ راضی بھی اس سے ہوں گے۔

لہٰذا ہر حال میں سب سے پہلے تم خود اس زیور سے اپنے کو آراستہ کرو اور پرکھو اور گھریلو زندگی میں خدا اور رسول کے خلاف کوئی کام نہ ہو، شوہر کی اطاعت کو خدا و رسول کی اطاعت جانو، لڑکیوں اور لڑکوں کو جہاں رہو گھنٹہ آدھ گھنٹہ وقت نکال کر بہشتی زیور پڑھاتی اور سناتی بھی ضرور رہو، بڑا ثواب ہوگا اور خود عمل کی توفیق ہوگی۔

بس ان سب باتوں کا خلاصہ اور تمہارے بوڑھے باپ کی آخری وصیت یہ ہے کہ خدا سے ہر حال میں ڈرتی رہو، اور آخرت کو دنیا کی راحت و آرام، نمود و نمائش اور رسم و رواج سب پر مقدم رکھو، دین و آخرت کو دنیا پر قربان کرنے سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں۔

والسلام

دعاجو و دعا گو

تمہارا میاں جان

احقر عباری(۱)

(۱) مولانا عبدالباری ندوی کے نام کا مخفف۔ ان کے حلقۂ احباب خصوصاً علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کا اختیار کردہ ہے۔

اس کتاب سے

عصر جدید میں جب کہ مسلمانوں نے علمی میدانوں میں خصوصی اور مزید کوششوں میں پہلوتہی کی، اور یورپ نے اپنے قدیم سرمایۂ علمی کو جوان کو عربوں کے توسط ہی سے ملا از سرنو اپنی علمی کوششوں کا موضوع بنایا، اور زندگی کے سربستہ حقائق کو کھولنے کی کوشش کی، اور ان میں نئے انکشافات کئے اور اپنے علوم وانکشافات کو مذہب سے متصادم تصور کیا اور مذہب کو زندگی کے حقائق سے علیٰحدہ کردیا تو ان درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے سے مسلمانوں کے ذہن میں بھی سائنس اور مذہب کے درمیان علیٰحدگی اور مغربی فلسفہ کے اثر سے اسلامی فلسفہ کی بے بضاعتی کا احساس پیدا ہوا، اور اس کے نتیجہ میں مذہبی حقائق کے معاملہ میں بے یقینی پیدا ہوئی، اور اس بات نے مسلمانوں کے ذہنوں میں بھی ملحدانہ رجحانات نے جگہ بنائی، یہ بہت خطرہ کی بات اور اسلام کے علمی امتیازات کے لئے ایک سخت چیلنج تھا۔

مولانا عبدالباری صاحب جو کہ علوم دینیہ کا صرف علم ہی نہیں حاصل کرچکے تھے، بلکہ انہوں نے ان میں تحقیق وتجدید کی صلاحیت بھی پیدا کرلی تھی، مغربی فلسفہ اور سائنس کا مہارت کے ساتھ مطالعہ کیا اور بہت کامیاب انداز میں اسلامی نظریہ کی برتری ثابت کی، اور مذہب سے سائنس کے ٹکراؤ کے تصور کا ابطال کیا، جس کو دیکھ کر ممتاز اہل علم بھی متاثر ہوئے اور اسلام کے عطا کردہ حقائق کی صحت وبرتری کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے۔ مولانا عبدالباری صاحب نے اس سلسلہ میں کئی کتابیں تصنیف کیں جنہوں نے موجودہ عہد کے پس منظر میں بھی بلند مقام حاصل کیا، اس سلسلہ میں ''مذہب وسائنس'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

DESIGNED BY HAMID. MOB:9889654027 PRINTED AT KAKORI OFFSET PRESS, LKO.